دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

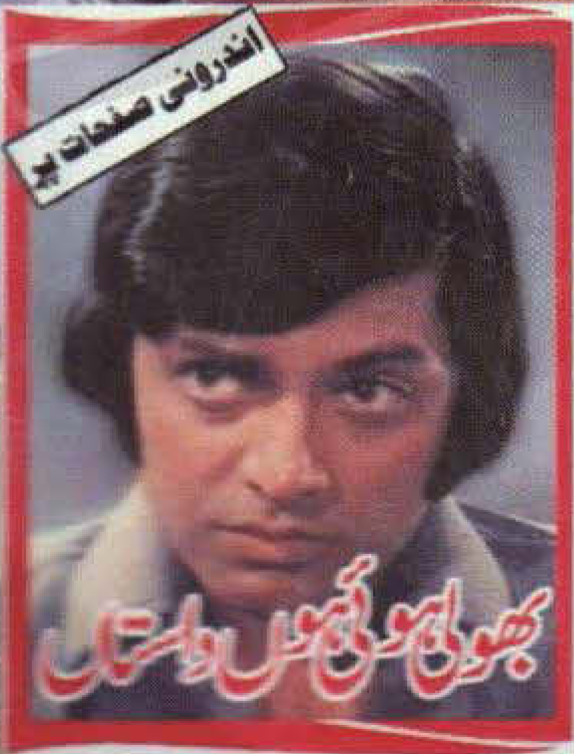
ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

OCTOBER
2011

PDFBOOKSFREE.PK



اس شمارے میں

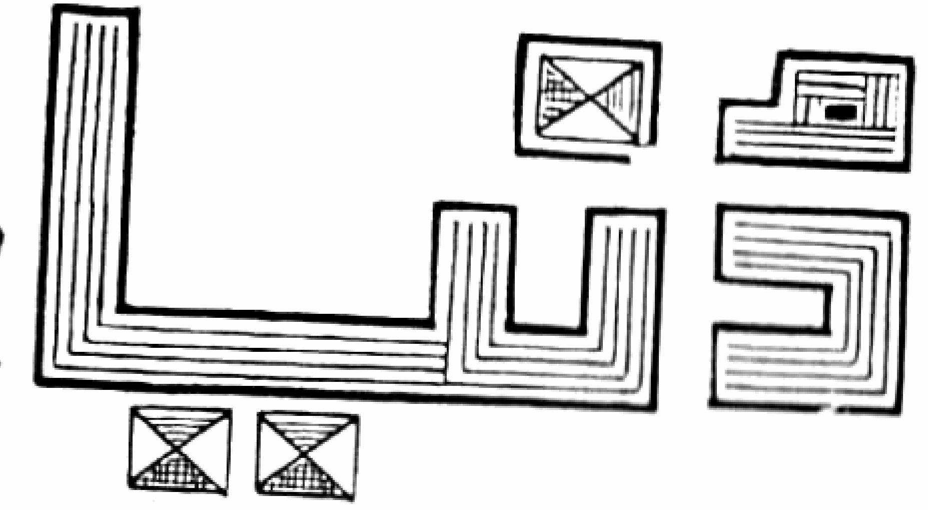
☆ 25 سے زائد سچی حکایتیں

☆ ''گھائل آتما'' صدیوں میں پھیلا پراسرار سلسلہ

☆ ''تاشون'' ASTROLOGY سے جڑا تحیر خیز سلسلہ

☆ ''مسئلہ یہ ہے'' قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل اور بہت سے مقبول سلسلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میں کس جگہ

سچّی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچّی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچّائیوں کو برتتے، دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچّی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

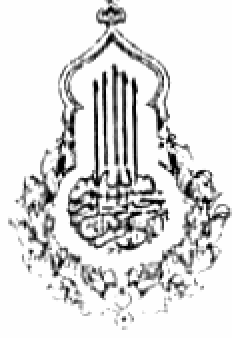
یہی وجہ ہے کہ "سچّی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ۔ "سچّی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلے کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی ہے وہ "سچّی کہانیاں" میں ہے۔

ایجنٹ / قارئین کی توجہ کیلئے

اگر آپ کو سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے حصول میں کوئی دشواری پیش آ رہی ہو تو منہ ذیل نمبروں پر رابطہ کریں۔ انشاء اللہ مسئلہ فوری حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

محمد اقبال زمان (سرکولیشن منیجر) 0333-2269932

رابطہ برائے آفس : 34939823 - 34934369



فرق

دنیا انسانوں کے جنگل کا روپ اختیار کرتی جا رہی ہے اور اس جنگل میں درندے بڑھتے جا رہے ہیں۔ قتل، اغوا، آبروریزی، زندہ انسانوں کو جلانا، معصوم بچوں کے ساتھ بربریت اور ان کی جان لینا اور بم دھماکے، ان گنت انسانوں کی زندگی سے محرومی، پیار بھرے رشتوں سے محرومی، گھر، دیوار، چھت اور روزگار سے محرومی کا باعث بننے والے بم دھماکے، انسان کے روپ میں سانس لیتے درندے ہی کرتے ہیں اور اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز بنی آدم کے لیے دکھ، رنج، ملال اور شرمندگی کا باعث بنتے ہیں۔ عذاب یہ ہے کہ اپنی شکل، چال ڈھال، بود و باش، یہاں تک کہ لہو کے رنگ کی صورت بھی انسان اور درندے کے درمیان تمیز اور تفریق مشکل ہو گئی ہے، بس ایک دل ہے جو انسان کے سینے میں محبت کی لے پر دھڑک کر درندے کے سینے میں نفرت اور بے رحمی کے جذبے سے بھرے ہونے کی صورت میں تفریق پیدا کرتا ہے۔ آپ اور میں اس دنیا میں امن اور محبت کے لیے اگر اپنی مجبوریوں، حدود اور مسائل کے باعث کچھ نہیں بھی کر سکتے تو کم از کم اپنے دل کو نفرت اور بے رحمی سے دور رکھ کے اپنی دنیا، اپنے ملک، اپنے معاشرے میں ایک درندے کے اضافے کو تو روک سکتے ہیں ناں؟ انسان اور درندے میں فرق تو برقرار رکھ سکتے ہیں ناں؟

منزہ سہام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



احوال

اس پرچے کا مدیر قارئین کے درمیان

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے دوست قارئین کرام...... زندگی، صحت، خوشی، کامیابی اور امن کی دعاؤں کے ساتھ سلامتی بھرا اسلام آپ تک پہنچے۔ گزشتہ دنوں ''جاپان'' میں سیٹل ہو جانے والے ایک دوست سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی...... جس کے دوران میں اس نے مجھے بہت بُرا بھلا (محبت بھرے لہجے میں) سناتے ہوئے پوچھا...... یہ تم پاکستان میں کیسی زندگی گزار رہے ہو؟ اور اس زندگی کا حاصل کیا ہوگا جانتے ہو؟ یہاں ''جاپان'' آجاؤ...... اس سلسلے میں تمام اخراجات اور دوسرے معاملات میرے ذمے ہیں۔

میں نے جاپان جانے سے انکار کر دیا کہ...... میں اپنے پیاروں، دوستوں، عزیزوں کے بغیر جی نہیں سکتا اور ''وطن'' کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ رہی بات زندگی کے حاصل کی تو...... وہ تو بس موت ہے... اور قبر پر ایک کتبہ! بس اسی حوالے سے ایک بہت اچھے شاعر احمد نواز کا یہ خوب صورت خیال ''کتبہ'' آپ کی بصارتوں کی رزق کی صورت پیش ہے۔

کتبہ

زندگی کیا،
موت کیا ہے؟
زندگی بس سانس لینے کا نہیں نامِ گرامی
درحقیقت
جذبہ ہائے دل نشین و آتشیں کی
زندگی ہے
زندگی ہے
[illegible]
[illegible] زندہ،
زندگی ہے
یہ نہ ہو تو
سانس، بینائی، سماعت، دل کی دھڑکن
کچھ نہیں ہے،
معجزہ ہے
موت کا بہروپ ہے!
آخر دم
زندگی میں سال کتنے تھے
ہے بے معنی
اور ان سالوں میں کتنی زندگی تھی
معنی رکھتا ہے
مری خواہش یہی ہے
میرے کتبے پر لکھا ہو
''جس گھڑی آئی قضا،
تب تک یہ زندہ آدمی تھا!''

(صفیہ سلطانہ مغل جیکب آباد سے)

اپنے ہی ہاتھوں کے حلقے اپنے ہی حلقوم میں
بے بسی سب پہ ہے طاری کون کسی کو ٹوک دے
آنے والی ہر گھڑی میں موت کا پیغام ہے
کاش کوئی گردشِ ایام ہی کو روک دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈیئر ناصر صاحب السلام علیکم یہ قطعہ کراچی اور ملک کے دیگر شہروں اور میرے اپنے پیاروں کے لیے ہے۔ گزشتہ دنوں رمضان المبارک مانو کہ جیسے پل صراط پر سے گزرا۔ ہر طرف دہشت اور بربریت کے جو بازار گرم ہوئے اس نے ابلیس تک کو لرزا دیا ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہم سے خفا ہے اور ہمیں اپنے رب کو راضی کرنا ہی نہیں آتا۔ کیا کریں کیسے کریں ہمارے روزے فاقے اور ہماری نمازیں محض مشقیں بن کر رہ گئی ہیں۔ ہماری زکوٰۃ و خیرات میں ریاکاری، آخر ہم اپنی روح کے برہنہ جسم کو کس لبادے سے ڈھانپیں۔ بس رب سے یہی دعا کہ اے اللہ ہم جتنے بھی گناہ گار و خطا کار اور سیاہ کار سہی۔ تیرے محبوب کی امت میں سے ہیں، تو ہم سے راضی ہو جا اور ہمیں معاف کر دے۔ ہمارے پیارے وطن پاکستان کو جو رمضان المبارک میں لیلۃ القدر کی مقدس رات کو معرض وجود میں آیا اس کی حفاظت فرما، کرب اور اذیت کے یہ بادل کب تک خطرہ بن کر سر پر منڈلاتے رہیں گے مگر زندگی کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ پرچہ اس بار قدرے تاخیر سے موصول ہوا۔ ادارے کی جانب سے (سالانہ خریداروں) کو بہت تاخیر سے موصول ہو رہا ہے؟ اس میں بہتری کی صورت پیدا کریں۔ صادق شمیم چوہدری کی نظم ''خواب نگر'' انگریزی ترجمے کے ساتھ اچھی لگی اور کاشی چوہان کا کیا کہنا نظم و نثر دونوں میدان سر کر چکے ہیں۔ بہت خوب بھیا! جب کہ کرنل الیاس صاحب کی کہانی نے جذبہ شہادت کو اور مہمیز کر دیا ہے اتنی خوب صورت کہانی کہ روح تک شاد ہوگئی۔ بہت خوب کرنل صاحب۔ نسیم سکینہ صدف کی کہانی ''مجازی خدا'' درحقیقت یہ بات مسلم ہے کہ بہت سی بیٹیاں ماں ایسا نصیب لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ عطیہ ہدایت اللہ کی کہانی نے دکھوں کی دلدل اور آنسوؤں کے سمندر میں دھکیل دیا۔ محمد بلال فیاض بھی بہت عمدہ تحفہ لے کر آئے۔ بہت ملول کر دینے والی کہانی تھی۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر انسانیت پر سے اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے۔ ''تاشون'' بہت دلچسپ اور معلوماتی تحریر ہے۔ فاطمہ بلگرامی کی کہانی کا بہت شدت سے انتظار ہے۔ کب شائع ہوگی؟ پرچے پر آپ جتنی محنت اور مشقت کرتے ہیں شاید ہی کوئی مدیر کرتا ہو۔ ناپختہ کہانی کی نوک پلک سنوارنا اسے سچی کہانیاں کے اسکیل پر لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور یہ کام آپ بہ احسن انجام دیتے ہیں۔ میں نے بذات خود آپ کو ایسی کہانیوں سے نبرد آزما ہوتے دیکھا ہے جو بہت رف انداز میں بغیر کسی حاشیہ کشی کے ہوتی ہیں مگر آپ بے حد دل جمعی اور محبت سے اسے اپنی کہانی سمجھ کر جس طرح قارئین کے آگے لفظوں کے گلاب سجا کر لاتے ہیں وہ قابل لائق صد ہا تحسین ہے کہ یقین ہی نہیں آتا یہ وہی کہانی ہے۔ اب اجازت دیجیے آخر میں دعا کہ رب العزت پورے پاکستان بالخصوص اہل کراچی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔''

✍ صفیہ سلطانہ صاحبہ! کراچی کے حالات کے حوالے سے قطعہ، دل کی آنکھوں سے پڑھا..... آپ کو پرچہ تاخیر سے ملنے کی وجہ بھی یہی کراچی کے حالات ہیں اور ہاں! فاطمہ بلگرامی کی سلسلے وار کہانی آپ نئے سال کے پہلے شمارے سے پڑھ سکیں گی۔

✉ محمد بلال فیاض ملتان سے۔ ''محترم ناصر بھائی السلام علیکم! امید کرتا ہوں آپ بخیریت ہوں گے۔ ستمبر 2011ء کا شمارہ جس میں میرے لیے خوش خبری موجود تھی ملا۔ دل شاد ہو گیا۔ آپ کا بے حد شکریہ کہانی شائع کرنے پر۔ دعا ہے کہ آپ یونہی چراغ سے چراغ جلا کر روشنی پھیلاتے رہیں گے۔ سرورق دلکش تھا۔ ''سرفروشی ہے ایماں'' یوم دفاع کے حوالے سے واقعی خاص کہانی ثابت ہوئی۔ اس شمارے میں محمد فہیم صاحب کی سفر کہانی واقعی حیرت انگیز تھی جس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ ایہا مسعود کی تحریر ''احساس ندامت'' سبق آموز تحریر تھی۔ قرۃ العین زینب کی تحریر ''دستکِ انقلاب'' انقلابی تحریر تھی۔ پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ خدا ہمارے حکمرانوں کو عقل سلیم عطا فرمائے، آمین۔ آصفہ اقبال بلوچ کی تحریر خود کو بدل ڈالو اچھی تھی۔ آمنہ نے اچھا فیصلہ کیا۔ جاوید عثمان زندانی کی ''ادھوری کہانی'' ہمیں خاص اور مکمل لگی، اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ کتاب تبصرے میں شورش باطن کے بارے میں پڑھ کر ہم اس کتاب کو پڑھنے کے لیے بے چین ہو گئے ہیں۔ ''تاشون'' کا جواب نہیں۔ اس بار مختصر تبصرے کے ساتھ اجازت۔ پر اسرار کہانی نمبر 11

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے تحریر لکھی ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ ناصر بھائی! آپ کی صحت وسلامتی کے لیے دعا دیگر اسٹاف کے لیے بھی دعائیں اور خاص طور پر شہر کراچی کے امن وسلامتی کے لیے بہت دعا۔''

☜ اچھے بھائی بلال فیاض! آپ کی تحریر کردہ پراسرار کہانی اچھی ہے۔ انشاء اللہ پراسرار کہانی نمبر 11 میں شامل ہوگی۔

✉ سنبل کراچی سے۔ ''پیارے ناصر بھائی، السلام علیکم! خدا کے فضل وکرم سے ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ سب کی خیریت خدا سے نیک مطلوب ہے۔ ناصر بھائی آپ نے پراسرار کہانی کے لیے کہا اور دیکھیں میں نے فوراً تعمیل کی۔ خوش رہیں آپ ہمیں بالکل بہنوں والا مان دیتے ہیں۔ بھائی! آپ کی کہانیاں مجھے بہت پسند ہے اور میں اس میں لکھنا بھی چاہتی ہوں۔ میرے پاس بے شمار کہانیاں ہیں مگر وقت کی بڑی قلت ہے۔ اور سنائیں ایوارڈ کی تقریب کب ہوگی؟ کیا یہ تقریب دوشیزہ کی ایوارڈ کی تقریب کے ساتھ ہی ہوگی۔ ایوارڈ کی تقریب کا بہت انتظار ہے۔''

☜ پیاری بہن سنبل! آپ کسی نہ کسی صورت وقت نکال کر کہانیاں لکھو ہمارا دل شاد ہوگا۔ ایوارڈ تقریب فی الحال تو کراچی کے حالات کا شکار ہے اب آگے اللہ مالک ہے۔

✉ روشانے یسین فیصل آباد سے۔ ''محترم ناصر بھائی آداب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اس مہینے کا سچی کہانیاں قدرے تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل پر براجمان محترمہ چہرے پر دھیمی سی مسکان سجائے اچھی لگ رہی تھیں۔ احوال میں تمام دوستوں کے خطوط پڑھے سب کے تبصرے خوب تھے لیکن شگفتہ شفیق صاحبہ کا تبصرہ سب سے اچھا لگا۔ زندہ کہانی میں معروف شخصیات کی زندگی سے جڑی کہانیاں ایک بے حد دلچسپ سلسلہ ہے، اس بار امیتابھ بچن کے بارے میں جہاں اتنی معلومات جان کر اچھا لگا وہاں یہ سن کر طبیعت مکدر سی ہوگئی کہ وہ مسلمانوں سے تعصب رکھتے ہیں، بھئی کیا کیجیے کہ ہیں تو ہم بھی کٹر مسلے (مسلمان) اور رج کے محبِ وطن پاکستانی۔ مزاج میں بھی شدت پسندی ہے لیکن صرف محبت کے معاملے میں، کسی سے بھی نفرت ہمارے بس میں نہیں۔ خیر اب آگے چلتے ہیں۔ کاشی چوہان کی نظم ''تیرا کون؟'' دل میں ڈھیروں درد جگا گئی۔ ارضِ پاک کے دگرگوں حالات ہر ذی شعور کے لیے اذیت اور کرب مسلسل کا باعث ہیں خاص طور سے میرے قائد کا شہر ظلم اور بربریت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناصر بھائی ان دنوں میرے کالمز میں سوائے کراچی کے حالات کے شاید ہی کسی اور موضوع پر تذکرہ ہوا ہو۔ (دوستو! میں ان دنوں روزنامہ ''دن'' میں کالمز لکھ رہی ہوں) آج بھی جو کالم آیا ہے ''شہرِ قائد کا نوحہ'' وہ کراچی کے کشیدہ اور منتشر حالات کے تناظر میں ہی تحریر کیا گیا ہے حالات کی بڑھتی ہوئی کشیدگی اور مفاد پرستی کی سیاست نے آج ہمیں اس نہج پر لا کھڑا کردیا ہے کہ ملک ٹوٹنے کا خدشہ لاحق ہے (خدانخواستہ)۔ بس یہی دعا ہے کہ اللہ پاک اس ملک میں رہنے والوں پر رحم کرے ہر سو امن کا بول بالا ہو، آمین۔ لیجیے حسبِ عادت قلم بہک کے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ خیر اب بات کرتے ہیں کہانیوں کی۔ اس بار کی بیسٹ اسٹوری ''سرفروشی ہے ایماں'' اس کہانی کو پڑھنے کے بعد دل کی کیفیت عجیب سی ہوگئی۔ جس وطن کے لیے اتنی قربانیاں دیں۔ آج اسی وطن میں......!! شاید کبھی کبھی لفظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایبہا مسعود کی ''احساس ندامت'' درمیانے درجے کی تحریر تھی۔ شازیہ ذکی کی ''زندگی تھی جیسے سزا'' اچھی کہانی تھی۔ الفاظ کا چناؤ اور اسلوبِ بیان بھی خوب تھا۔ نسیم سکینہ کی کہانی ''یہ مجازی خدا'' پڑھ کے دل دکھی ہوگیا۔ قرۃ العین کی ''دستکِ انقلاب'' بہت پسند آئی۔ زینب آپ کا اندازِ تحریر مجھے ویسے بھی بہت پسند ہے اور آپ خود بھی۔ زندگی لکھ رہی ہوں میں نازلی سحر خان کی اپنے والد سے محبت کی شدت آنکھوں کو نم کر گئی۔ زخم تازہ ہوگئے۔ کیا سب بیٹیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ اتنی ہی حساس اور محبت کرنے والیاں۔ یقیناً ماں باپ کے انمول رشتے کا کوئی مول نہیں۔ حنیف سحر صاحب کی ''گھائل آتما'' زبردست جا رہی ہے اور ''تاشون'' کی تعریف کے لیے تو لفظ ہی نہیں۔ کتاب تبصرہ میں عکاشہ کے تبصرے پڑھ کے حیرت ہوتی ہے اتنی چھوٹی سی لڑکی اور ایسے ایسے تبصرے......؟ گڈ...... باقی تمام کہانیاں اور مستقل سلسلے حسبِ معمول خوب تھے۔ آپ سب کی محنت واقعی میں نظر آتی ہے۔ سچی کہانیاں کا معیار ہر گزرتے دن کے ساتھ بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس بار کے لیے اتنا ہی پراسرار کہانی نمبر 11 کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے یہ کہانی آپ کی فرمائش پر پیش ہے......کیسی ہے؟''
عزیز بہن روشانے سبین! تمہارے تحریر کردہ کالم روزنامہ ''دن'' میں پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ ماشاءاللہ بہت اچھا سوچ اور لکھ رہی ہو۔ پُراسرار کہانی پسند آئی......تم نے اپنا منفرد اندازِ تحریر برقرار رکھا ہے۔

ثانیہ بھٹی سیالکوٹ سے۔ ''پیارے ناصر انکل السلام علیکم! انکل میں پہلے بھی سچی کہانیاں میں کچھ تحاریر بھیج چکی ہوں۔ جنہیں آپ نے شائع کیا۔ تھینک یو انکل جی۔ ناصر انکل میں سیالکوٹ کے جس علاقے میں رہتی ہوں وہاں سچی کہانیاں بہت لیٹ ملتا ہے اور اتنی دور سے جا کر لانا پڑتا ہے اکثر شمارے مس بھی ہو جاتے ہیں۔ ویسے سچی کہانیاں ماشاءاللہ بے حد اچھا ڈائجسٹ ہے۔ خدا پاک اس کو بہت بہت ترقی دے، آمین۔
اچھی بھتیجی ثانیہ بھٹی! سیالکوٹ میں سچی کہانیاں تاخیر سے ملنے والی آپ کی شکایت ہم نے شعبہ سرکولیشن کو پہنچادی ہے۔

وفا صدام حسین بخاری، حیدرآباد سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! محترم میں تقریباً تین سال سے ''سچی کہانیاں'' پڑھتا آرہا ہوں لیکن خط پہلی بار لکھ رہا ہوں وہ بھی اس لیے کہ آپ ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس بار شمارہ دیر سے عید کے پانچویں روز ملا۔ یہ تاخیر کیوں ہوئی؟ شمارے کے سرورق پر امیتابھ بچن کی تصویر نے موڈ خراب کردیا۔ ایسا کیوں ہے کہ ہم بھارتی فنکاروں کو چھاپیں۔ جب ہمارے اپنے اتنے اچھے ہیروز موجود ہیں...... معاف کرنا جناب شاید آپ کو برا لگا ہوگا۔ سچی کہانیاں میں بہت سی منفرد باتیں ہیں جیسا کہ کہانی کے عنوان کے ساتھ اشعار والا سلسلہ مجھے بہت پسند ہے اور اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف کرنل الیاس صاحب کی ''سرفروشی ہے ایمان'' بڑی اچھی روداد تھی۔ ایبا مسعود کی ''احساسِ ندامت'' اچھی دکھ بھری آپ بیتی تھی۔ شازیہ ذکی عثمانی کی ''زندگی تھی جیسے سزا'' بھی پسند آئی۔ نسیم سکینہ کی کہانی ''یہ مجازی خدا'' بہت اچھی تھی۔ آصفہ اقبال بلوچ کی کہانی ''خود کو بدل ڈالو'' بھی اچھی لگی۔ سعد حسین کی ''ٹکے کی محبت'' نے حیران کردیا۔ عطیہ ہدایت اللہ کی ''زیست کی دلدل میں'' بہت اچھی تھی۔ عروبہ عدنان کی ''بہاریں لوٹ آئیں'' بہت اچھی جگ بیتی تھی۔ رفاقت جاوید قاضی، مس منزل خان، جاوید عثمان زندانی، قرۃ العین زینب اور صادق شمیم چوہدری، عمرانہ رمضان، محمد بلال فیاض اور ذوالقرنین جدون، شبانہ، فوزیہ احسان رانا، کاشی چوہان، شفقت شکیل، ارم زہرا، محمد فہیم، نازلی سحر خان نے بہت اچھا لکھا۔ حنیف سحر کی ''گھائل آتما'' اچھی جارہی ہے۔ شازلی سعید مغل نے ''تاشون'' بہت کمال لکھی ہے۔ آپ کی ڈائری بھی بڑھی اچھی لگی۔ اب اجازت دیجیے۔''
محترم وفا صدام حسین بخاری! شمارہ تاخیر سے ملنے کی وجہ وہی کراچی کے حالات ہیں......اور ہاں اس بار زندہ کہانی میں پاکستانی LEGEND اداکار وحید مراد مرحوم کی کہانی موجود ہے۔

✉ ممتاز احمد سندھو، سرگودھا سے۔ ''محترم ناصر رضا، السلام علیکم! دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کو اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو دنیا و آخرت کی پریشانیوں سے محفوظ فرمائے، آمین۔ دفتری مصروفیات کی وجہ سے کافی عرصہ کے بعد ایک شکوے کے ساتھ حاضر ہوں وہ یہ کہ کچھ عرصہ قبل ایک سچی کہانی بعنوان ''اللہ والے'' ارسال کی تھی اور آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ بہت جلد ''سچی کہانیاں'' کا حصہ ہوگی مگر ابھی تک میری حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ ہر ماہ اسی امید پر کہ شاید کہانی شائع ہوئی ہو سچی کہانیاں دیکھتا ہوں مگر مایوسی ہوتی ہے۔ بہرحال اب ''خیال آرائی'' میں ایک تحریر بعنوان ''وعدہ'' حاضر خدمت ہے اور اب بات ہوجائے شمارہ ستمبر کی۔ سرورق پر ماڈل کی دلفریب مسکراہٹ نے دل موہ لیا۔ کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) الیاس صاحب کی تحریر ''سرفروشی ہے ایماں'' حب الوطنی کا درس دیتی ہے۔ محترمہ شازیہ ذکی عثمانی کی تحریر ''زندگی تھی جیسے سزا'' پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ قدرت کا انصاف اور مکافات عمل کہ خالد اور اس کی ماں بہنوں کے ساتھ جو ہوا وہ ٹھیک ہوا۔ آصفہ اقبال بلوچ کی کہانی ''خود کو بدل ڈالو'' بہت سبق آموز ہے۔ قرۃ العین زینب کی ''دستک انقلاب'' بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے۔ سعد حسن کی تحریر ''ٹکے کی محبت'' نے معاشرے کے نام نہاد جھوٹی محبت کے کرداروں کا پردہ چاک کیا ہے۔ شبانہ کی تحریر ''ماں اکیلی تھی'' آج کے دور کا بہت بڑا المیہ او

انتباہ

ادارہ پرل پبلی کیشنز تمام اشتہاری اداروں اور متعلقین کو اس اَمر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ......ہمارا اپنے لاہور کے اشتہاری نمائندے خرم اقبال سے ان کی مالی بے ضابطگیوں کے باعث اب کوئی تعلق نہیں ہے...... لہٰذا ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' اور ماہنامہ ''دوشیزہ'' کے حوالے سے ان سے کسی بھی قسم کا لین دین کرنے والا اپنے فعل کا خود ذمے دار ہوگا......ادارہ اشتہار ہذا کے ذریعے خرم اقبال صاحب کو بھی متنبہ کررہا ہے کہ......وہ جلد سے جلد ادارہ پرل پبلی کیشنز کے واجبات کی ادائیگی کی صورت کریں۔ دوسری صورت میں ادارہ ان کے خلاف کسی بھی قسم کی قانونی اور عدالتی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تلخ حقیقت ہے۔ ''پیکرِ صبر و رضا'' اور ''زیست کی دلدل میں'' بہت متاثر کن تھیں۔ محمد بلال فیاض کی تحریر پڑھ کر آنسو آ گئے۔ شازلی سعید مغل کی ''تاشون'' بہت ہی عمدہ تحریر ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر سب کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ''خیال آرائی'' میں عروبہ عدنان اور افشاں سحر طارق کے خیالات بہت پسند آئے۔ دعا ہے کہ اللہ ان کو اور زیادہ زورِ قلم عطا فرمائے۔ علی ساجد کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے، آمین۔ اب اجازت چاہوں گا اس امید کے ساتھ کہ میری تحریر ''اللہ والے'' ضرور شائع فرمائیں گے۔ میری حوصلہ افزائی ہوگی تو آپ کا احسان مند رہوں گا اور آئندہ بھی کہانیاں بھیجتا رہوں گا۔''

✍ محترم ممتاز احمد سندھو! آپ کی کہانی ''اللہ والے'' بعض تکنیکی وجوہات کے باعث اب تک شائع نہیں ہو سکی۔ بہرحال! اب یہ کہانی سچی کہانیاں شمارہ نومبر پراسرار کہانی نمبر ۱۱ میں شامل ہوگی اور ''آپ کی خیال آرائی'' زیرِ نظر شمارے میں موجود ہے۔

✉ ارم زہرا کراچی سے۔ ''محترم ناصر بھائی آداب! آپ کی صحت و تندرستی کے لیے دعاگو ہوں۔ ''عید نمبر'' میرے ہاتھ میں ہے۔ ٹائٹل بہت خوب صورت ہے۔ اس بار عید تو نہیں منائی لیکن عید پر اپنے پیاروں کو ضرور یاد کیا کہ ان کے دم سے زندگی میں زندگی کا احساس تو باقی ہے اور وہ پیارے جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہی۔ ناصر بھائی! کافی عرصے بعد ''سچی کہانیاں'' کی محفل میں آئی ہوں۔ سب سے پہلے تو میں اس انمول تحریر کا ذکر کروں گی جس نے مجھے تبصرہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہے محمد فہیم کے قلم سے ''سفر کہانی'' میں محمد فہیم صاحب کی شکر گزار ہوں جن کی بدولت میری معلومات میں اضافہ ہوا اور ساتھ ہی ان عظیم ہستیوں کے بارے میں آگہی ہوئی جن کو ہم وقت کے لامتناہی سمندر میں ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔ ''عجب شہرِ خموشاں'' پڑھتے پڑھتے میں سوچ رہی تھی کہ دنیا میں ہماری خواہش ہوتی ہے کہ کسی اچھے مقام پر خوب صورت سی رہائش گاہ ہو لیکن یہ نہیں سوچتے کہ مرنے کے بعد ہماری آخری آرام گاہ جانے کہاں ہوگی؟ ایمان تازہ کرتی خصوصی کہانی کا جواب نہیں۔ ایبہا مسعود کو بہت عرصے بعد پڑھا۔ وہی ان کا منفرد انداز اس کہانی کا حق ادا کر گیا۔ کاشی چوہان کی ''قبرستان کا اندھیرا'' پسند آئی۔ ''یہ مجازی خدا'' مکافاتِ عمل کی بہترین مثال لگا۔ ''خود کو بدل ڈالو'' سوچ کے دریچے وا کرتی تحریر تھی۔ بشرطیکہ سوچنے والا ایمانداری کا بھی مظاہرہ کرے۔ ''تاشون'' بہت اچھا چل رہا ہے اور خوب تعریفیں سمیٹ رہا ہے۔ ویلڈن شازلی۔ ''تبصرہ اور تذکرہ'' میں عکاشہ سحر کی محنت زبردست رنگ لا رہی ہے۔ بہت خوب عکاشہ! اور آخر میں اپنے قارئین کی شکر گزار ہوں جو ''میرے شہر کی کہانی'' پر اپنے تبصروں کی صورت مجھے سراہتے اور یاد رکھتے ہیں۔ خدا آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔''

✍ اچھی بہن ارم زہرا! تم نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے ''احوال'' میں شرکت کے لیے وقت نکالا...... تمہاری ''شہر والی'' کہانی کے ساتھ اگر ہر ماہ ''احوال'' میں تبصرہ بھی شامل ہو تو کیا اچھی بات ہوگی اور ہاں تمہاری سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانیوں پر مشتمل کتاب اشاعت کے کس مرحلے میں ہے؟

✉ ارباب قربان علی ایری، بھاگ شہر بلوچستان سے۔ ''پیارے ناصر بھائی السلام علیکم! میں نے گزشتہ ماہ بھی ''احوال'' میں خط لکھا تھا لیکن آپ...... چلیں خیر جیسے آپ کی مرضی۔ بقول شاعر

عذاب دے گا تو مجھے خواب بھی دے گا
میں خوش ہوں کہ میرا دل تیری پناہ میں ہے

سچی کہانیاں شمارہ ستمبر کے خوب صورت سرورق کا انتخاب کرنے والے کو تو ایوارڈ ملنا چاہیے۔ ''زادِ راہ'' کی صورت منزہ باجی نے خوب کھری باتیں لکھیں۔ ''احوال'' کو سدرہ انور علی، اسلم آزاد اور نعیم آکاش نے چار چاند لگا دیے۔ ''مقدر کا سکندر'' پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ ''احساسِ ندامت'' ایبہا مسعود، ''زندگی تھی جیسے سزا'' سکینہ صدف، ''یہ مجازی خدا''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ''خود کو بدل ڈالو'' آصفہ بلوچ کی بہترین کاوش تھی ویلڈن۔ زیست کی دلدل میں عطیہ ہدایت، ''پس حقیقت'' مس منزل، ''ادھوری کہانی'' جاوید عثمان، ''دستک انقلاب'' قرۃ العین اور ''آدم خور درندہ'' بے حد پسند آئی۔ ''خیال آرائی'' میں خواہش، وقار احمد آنسو کیسے کیسے، سدرہ انور علی کی خیال آرائی حقیقی وخوب صورت جذبات کی عکس بندی تھی۔ شاعری میں یاسمین اور شیخ محمد اسد کے اشعار نے دل پر دستک دی، ''گھائل آتما'' اور ''تاشون'' کے مصنفین کو اپنی اعلیٰ تحاریر سے سچی کہانیاں کو سجانے پر مبارک باد۔ آخر میں تمام احوالیوں سے اگلے ماہ تک کے لیے اجازت، اللہ نگہبان۔''

✍ اچھے بھائی ارباب قربان علی اریی! گزشتہ ماہ آپ کا خط ہمیں نہیں ملا تھا۔ بہر حال شعر کا انتخاب بہت اچھا لگا۔

✉ جیجل میتلو کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا بھائی السلام علیکم! امید ہے آپ اسٹاف سمیت خیریت سے ہوں گے۔ خدا کراچی میں حالات بہتر کر دے، آمین، ورنہ سارا رمضان ٹینشن میں گزرا ہے۔ بھیا! میں نے اس سے پہلے بھی خط لکھا تھا۔ پتہ نہیں آپ کو ملا یا نہیں؟ ورنہ اس سے پہلے میں نے اپنے ہر خط کا جواب رسالے میں موجود پایا ہے اور اس امید کا سہارا لے کر ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ اس کہانی کے مرکزی کردار نے خود یہ کہانی میرے ایک عزیز کو سنائی تھی نازلی سحر خان، کاشی چوہان، حنیف سحر، شازلی، عکاشہ سحر، صفیہ سجل شاہ، شگفتہ شفیق کی تحریریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں میری طرف سے ان سب کو میرا اسلام۔''

✍ اچھی بہن جیجل میتلو! تمہارا گزشتہ خط ہمیں نہیں ملا۔ ورنہ جواب ضرور دیتے۔ تمہاری کہانی اچھی ہے بہت جلد سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔

✉ ام عادل کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! محترم عید کی وجہ سے شمارہ ستمبر کچھ تاخیر سے ملا۔ تبصرے سے قبل آپ تمام عملے کی کاوشوں کے بارے میں کچھ نہ کہنا اور صرف کہانیوں پر تبصرہ کرنا یقیناً آپ کی محنتوں سے چشم پوشی اور آپ سب کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ناصر بھائی آپ اور آپ کے رفقاء کار جس محنت و جانفشانی اور تندہی سے نہ صرف خوب صورتی سے رسالہ ترتیب دیتے ہیں بلکہ اسے وقت پر پہنچا کر ہم انتظار میں نظریں فرشِ راہ کیے قارئین پر جو احسان کرتے ہیں اس کے لیے ہم تہہ دل سے مشکور وممنون ہیں اور سب سے قابل تعریف آپ کا عمل یہ ہے کہ کسی کی دل شکنی نہیں کرتے بلکہ ہر گرتے پڑتے کی انگلی تھام کر اسے اپنے قدموں پر چلنا سکھاتے ہیں۔ یہ خوبی میں نے اور کسی رسالے میں نہیں دیکھی۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف پڑھی جانے والی کہانیوں میں ارم زہرا'' نامہ اعمال ہے یہ'' سب سے زیادہ پسند آئی۔ خدا ایسے افراد کو باپ بننے کا رتبہ ہی نہ دے تو اچھا ہے۔ باقی شفیق شیکی، فوزیہ احسان رانا، شبانہ، عمرانہ رمضان، صادق شمیم، منزل خان، رفاقت جاوید، سعد حسین، نسیم سکینہ، شازیہ ذکی کی کہانی پڑھ سکی جو سب بہت بہت متاثر کن تھیں۔ ''گھائل آتما'' اور ''تاشون'' میں دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ راجہ محمود صاحب کی ''مقدر کا سکندر'' بھی اچھی معلوماتی تحریر تھی۔''

✍ محترمہ ام عادل! آپ کی اس حوصلہ افزائی کے لیے سچی کہانیاں کی ساری ٹیم آپ کی ممنون اور شکر گزار ہے۔

✉ سدرہ انور علی، جھنگ سے۔ ''قابل احترام انکل ناصر رضا السلام علیکم! ستمبر کا مہکتا چہکتا شمارہ ہاتھ میں آیا۔ سرورق پر ماڈل بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ ''احوال'' میں سب کے خط بہت اچھے تھے۔ باجی منزہ سہام کا اداریہ ''زادِ راہ'' پڑھا۔ یقیناً ہر سفر کے لیے زادِ راہ ضروری ہوتا ہے۔ زندہ کہانی میں ''مقدر کا سکندر'' بہت اچھی لگی۔ ''سرفروشی ہے ایماں'' اچھی کہانی تھی۔ ایبہا مسعود کی ''احساس ندامت'' بہت اچھی تحریر تھی۔ شازیہ ذکی عثانی کی کہانی ''زندگی تھی جیسے سزا'' بہت دردناک کہانی تھی۔ نسیم سکینہ صدف کی ''یہ مجازی خدا'' سبق آموز ہے۔ آصفہ بلوچ کی ''خود کو بدل ڈالو'' بہت اچھی لگی۔ عطیہ ہدایت اللہ کی کہانی ''زیست کی دلدل میں'' پڑھ کر دعا کی۔ خدا کسی پر ایسا وقت نہ لائے کہ وہ مجبور ہو کر برائی کی راہ پر چل پڑے۔ رفاقت جاوید کی ''پیکرِ صبر و رضا'' اچھی تحریر تھی۔ بے شک خدا صبر کرنے والے ساتھ ہے۔ کاشی چوہان کی کہانی ''قبرستان کا اندھیرا'' پڑھ کر روح کانپ گئی۔ فوزیہ رانا کی موبائل کہانی

ستمبر 2011ء کی انعام یافتہ کہانیاں

قارئین کے ارسال کردہ ٹوکن کے ذریعے مندرجہ ذیل کہانیاں اس ترتیب سے انعام کی حقدار ٹھہریں

ایبہا مسعود کی تحریر ''احساس ندامت'' پہلے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 700.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

شازیہ ذکی عثانی کی تحریر ''زندگی تھی جیسے سزا'' دوسرے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 500.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

آصفہ اقبال بلوچ کی تحریر ''خود کو بدل ڈالو'' تیسرے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 400.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

جاوید عثمان زندانی کی تحریر ''ادھوری کہانی'' چوتھے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 300.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

قرۃ العین زینب کی تحریر ''دستکِ انقلاب'' پانچویں انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 250.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

شبانہ کی تحریر ''ماں اکیلی تھی'' چھٹے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 200.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

حوصلہ افزائی

مرحوم کرنل رفیق ایس ایم کی یاد میں ف شفق شیکی کی تحریر ''رات، تنہائی اور میں'' کو بطور انعام مبلغ سو روپے پیش کیے جا رہے ہیں۔

بہترین شعر

قارئین نے اس بار عامر شہباز۔ کراچی کا بھیجا ہوا سہیل غازی پوری کا یہ شعر سب سے زیادہ پسند کیا۔

حصارِ غم میں گھرے ہیں سبھی مگر اک روز
کوئی تو شخص اٹھائے گا بہتری کا سوال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سنبھلنے سے ذرا پہلے'' ان لڑکیوں کے لیے سبق آموز ہے جو آوارہ لڑکوں کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں۔ میرے شہر کی کہانی ارم زہرا کی ''نامہ اعمال ہے یہ'' بہت دردناک کہانی ہے۔ باپ بھلا ایسے بھی ہوا کرتے ہیں کیا؟'' لکھ رہی ہوں زندگی کو میں'' نازلی سحر خان کے حالات پڑھے میں نے آج تک لوگوں کو ماں کے بارے میں ہی لکھتے اور اشکبار ہوتے دیکھا ہے اور باپ وہ کیا ہے؟ جو اولاد کے لیے دن رات محنت کرتا ہے دھکے کھاتا ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے اپنی اولاد کو پالتا ہے۔ ویلڈن نازلی سحر خان۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ ''خیال آرائی'' سب کی بہترین تھیں۔ ''تذکرہ اور تبصرہ'' میں عکاشہ سحر ایمان کا جواب نہیں۔ ''گھائل آتما'' اور ''تاشون'' کا جواب نہیں۔ بہت اچھی جا رہی ہیں۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں روبینہ شاہین کا شعر اچھا لگا۔ انکل! میری ''پراسرار کہانی'' کا کیا بنا؟ آخر میں آپ کی پوری ٹیم و تمام قارئین کو سلام۔''

اچھی بھتیجی سدرہ انور علی! کیا تم نے سچی کہانیاں میں پراسرار کہانی نمبر II کا اشتہار نہیں دیکھا؟ جو پوچھ رہی ہو کہ..... میری پراسرار کہانی کا کیا بنا..... !!

✉ شفق قمیلی سیالکوٹ سے۔ ''ایڈیٹر چچا السلام علیکم! مورخہ پانچ ستمبر کو آپ کی جانب سے ارسال کردہ شمارہ ملا۔ اس شمارے میں ''اپنی کہانی'' بھی دیکھ کر دل خوشی سے نہال ہو گیا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ آپ کی اس حوصلہ افزائی نے مجھے کتنا حوصلہ دیا ہے۔ میں نے یہ کہانی بڑے مشکل حالات میں لکھی تھی۔ یہ میری زندگی کی بہت بڑی کامیابی ہے اور اس کے ساتھ ہی چچا میں اپنی ایک اور کامیابی کی خوش خبری آپ کو سنا رہی ہوں۔ میرے بی اے کے تمام پرچے اچھے نمبروں سے کلیئر ہو گئے ہیں۔ اب میں ایم اے میں داخلہ لے رہی ہوں۔ میں اپنے اللہ کی بہت شکر گزار ہوں کہ..... اس سال دو بڑی کامیابیاں میرے حصے میں آئیں۔ اول میری ''بی اے'' میں کامیابی اور دوئم ''سچی کہانیاں'' میں میری کہانی کی اشاعت اب میں اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ پوری کوشش کروں گی کہ آئندہ سچی کہانیاں کے لیے اچھی اور دلچسپ کہانیاں لکھوں!''

اچھی بھتیجی شفق شیکی! ہم دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں کہ زندگی میں تمہیں ہر امتحان اور مقام پر کامیابی ملے۔

✉ نازیہ بتول رضا، کراچی سے۔ ''محترم انکل ناصر رضا، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے۔ ''سچی کہانیاں'' سے میں گزشتہ کچھ عرصے غیر حاضر رہی لیکن ''سچی کہانیاں'' سے میرا رشتہ بدستور قائم رہا ہے۔ کیونکہ سچی کہانیاں کے مطالعے کے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتی ناں۔ اب کچھ تبصرہ..... رسالہ ہمیشہ کی طرح جامع ہے تقریباً ساری کہانیاں اچھی لگیں۔ ''سرفروشی ہے ایماں'' لیفٹیننٹ کرنل صاحب نے کیا خوب جنگ کا سماں باندھا ہے۔ واقعی ہم انہی جوانوں کی بدولت چین کی نیند سوتے ہیں۔ ''زندگی تھی جیسے سزا'' بہت اچھی لگی اور پڑھ کر بہت افسوس ہوا ایک لڑکی کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ ''خود کو بدل ڈالو'' بھی اچھی لگی اس میں آمنہ نے جس طرح حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا سے لو لگا لی تھی وہ قابل تعریف ہے۔ ہم اپنے مسائل کا حل ادھر ادھر تلاش کرتے پھرتے ہیں جب کہ ہمارے ہر مسئلے کا حل اللہ سے لو لگانے میں ہے۔ جو یہ بات سمجھ گیا کامیاب ہو گیا۔ اس کے علاوہ پیکر صبر و رضا، ایک ادھوری کہانی، کوئی سہارا نہیں اچھی لگیں۔ ''تاشون'' بہت ہی منفرد اور معلومات سلسلہ ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ آخر میں آپ سب سے التماس ہے کہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمارے شہر کراچی کو امن و سکون کا گہوارہ بنا دے اور اس کے باسیوں کے دل ایک دوسرے کی محبت سے بھر دے، آمین۔''

اچھی بھتیجی نازیہ بتول رضا! آپ نے اگر سچی کہانیاں سے رشتہ نہیں توڑا..... تو بھلا ہم کیسے آپ کو بھولتے اس ماہ کا شمارہ آپ کے اور ہمارے پرخلوص تعلق کا گواہ ہے۔

✉ ملک صفدر عباس اعوان جہانیاں، خانیوال سے۔ ''محترم ناصر رضا سلام مسنون! سچی کہانیاں سے میرا تعلق بہت پرانا ہے لیکن میں خط پہلی بار لکھ رہا ہوں اور تحریر بھی..... سو سب سے پہلے تو تمام قارئین اور احوال کے شرکاء کو سلام دعا کرتا ہوں کہ سب دوست ٹھیک ہوں، کیونکہ ہمارے ملک خصوصاً [illegible] کے حالات بہت خراب ہیں [illegible] کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بس دعا چاہیے

ہمارے ادارے کے دیرینہ ساتھی محترم پرویز بلگرامی کے صاحب زادے زین بلگرامی ان دنوں صاحبِ فراش ہیں۔تمام قارئین اوردوستوں سے استدعا ہے کہ وہ زین بلگرامی کی جلد سے جلد صحت یابی کیلئے خصوصی طور پر دعا کریں۔

کے جو حالات ہیں ان کو سن سن کر ٹی وی پر دیکھ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔بعض اوقات میں سوچتا ہوں (قارئین کرام بھی میری اس بات سے اتفاق کریں گے) آخر یہ سب کیوں ہورہا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں۔آیا ہم خود ہیں۔آیا یہ بھی ہمارے مسلمان بھائی ہیں جو کہ اپنے نہتے مسلمان بھائیوں کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ان کے بیوی بچوں کو مار رہے ہیں۔ان کو یتیم کررہے ہیں۔میرا سوال ہے کہ آیا کوئی مسلمان جس کے دل میں قرآن پاک ہے۔منہ پر اللہ نبی کا نام ہے آیا وہ ایسے کرسکتے ہیں۔یہ سوال تو اپنی جگہ رہا کہ آیا وہ جو کوئی بھی ہیں مگر کیا ان کو اللہ تعالیٰ کا کوئی خوف نہیں۔اللہ کی لاٹھی سے کیا وہ ڈرنے والے نہیں ہیں۔اللہ کے خوف سے تو چھوٹے چھوٹے پتھر بھی کانپ جاتے ہیں۔پہاڑ لرز جاتے ہیں مگر ان لوگوں پر کسی بھی شے کا کوئی اثر نہیں۔خدا ان کو راہ راست پر لائے۔کراچی میں امن کی فضا قائم ہو،آمین۔اب رسالے کی طرف آتے ہیں۔اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔یہ صرف ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک خزانہ ہے۔لوگوں کی زندگیوں اور ان کے تجربات کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے اور یہ خوش آئند بات ہے۔اس وجہ سے ہی آپ سے اور اتنے پیارے قارئین سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔میں اس خط کے ساتھ اپنی ایک کہانی بھی ارسال کررہا ہوں۔کہانیاں لکھنے کا مجھے بہت شوق ہے مگر اب تک لکھی نہیں۔آپ کے رسالے کو دیکھا اور پڑھا تو یہ کام بھی کردیا۔امید کرتا ہوں کہ اسے کسی نزدیکی اشاعت میں ضرور جگہ دیں گے حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اب اجازت چاہتا ہوں۔''

محترم صفدر عباس اعوان صاحب! آپ کا ''سچی کہانیاں'' سے یہ تعلق اور محبت ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔آپ کی کہانی بہت جلد شامل اشاعت ہوگی۔''احوال'' میں آمد کا انتظار رہے گا۔

✉ مینا تاج کراچی سے۔''SIR ناصر رضا سلام عرض ہے!آج برسوں بعد ایک پرانی خواہش نے پھر سے انگڑائی لی اور ہم اس خواہش کے آگے سرِ تسلیم ختم کرتے ہوئے رائٹنگ پیپر اور قلم تھام کر بیٹھ گئے۔کورے کاغذ پر قلم رکھتے ہی نفسِ مضمون طرز تحریر فضا میں تحلیل ہوگئی اور قلم کی نوک جانے کب سے اکڑوں بیٹھے تھک گئی تو ہماری انگلیوں کے حصار سے نکل کر کاغذ پر پسر گئی اور اپنی گستاخانہ نگاہوں سے ہمیں گھورتے ہوئے کہنے لگی۔''بس ہوگیا شوق پورا۔اجی خط لکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ادھر قلم اٹھایا اور کاغذ کو سیاہ کردیا۔''طبیعت پر چھائی مایوسی نے اب غصے کی جگہ لے لی......لیکن!مینا تاج اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے ہرگز نہیں۔جھٹ قلم سنبھالا اور نکل پڑے اپنے بچپن کی طرف......جب اسکول ٹیچر نے پہلی بار خط لکھنا سکھایا تو مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔جھٹ پہلا خط اپنے بابا جان کو جو اس وقت مسقط میں جاب کررہے تھے لکھ ڈالا۔بابا نے میرے خط کی پذیرائی کی اور یوں یہ سلسلہ چل پڑا۔پر ٹیلی فون یا سیل فون نے یہ سلسلہ زیادہ نہ چلنے دیا اور آج برسوں بعد اپنے بابا کو خط لکھنے کے بعد دوسری بار خط میں ''سچی کہانیوں'' کے لیے لکھ رہی ہوں ''سچی کہانیاں'' پڑھتے اور لکھتے کب میں اس کا حصہ بن گئی؟اس کا ادراک مجھے اب ہوا۔SIR ناصر اور ان کی ٹیم کے محبتوں کے حصار سے نکلنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی دیہاتی کا شہر سے نکلنا جو شہر کی چکا چوند کو قطعی چھوڑنے کا روادار نہیں ہوتا اور میں بھی اسی حصار سے ہرگز نکلنا نہیں چاہتی......میرے دوسرے مخاطب میرے ساتھی لکھاری ہیں۔بس اتنا ہی کہنا ہے۔ہمیں اپنے قلم کی آبرو رکھنی ہوگی۔ہم ہمیشہ ایک ساتھ ہیں۔چاہے ہمارا تعلق کسی بھی شہر، قصبے یا گاؤں سے ہو بالکل اپنے ملک کی پولیس کی طرح جو ہر صورت اپنے پیٹی بھائیوں کا ساتھ دینے ہر وقت کھڑے رہتے ہیں۔چاہے عوام ساتھ دیں نہ دیں۔ارے ارے پریشان ہونے کی ضرورت ہرگز نہیں۔ہم صرف اچھائی اور بہتری کا ساتھ دینے کھڑے ہوں گے انشاءاللہ۔خط زیادہ طویل ہوگیا ہے مگر کیا کروں جب لکھنا ہی ٹھہرا تو مختصر کیا طویل کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عکس خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی!

بہت اچھی اور ذہین شاگرد عزیز مینا تاج! تم نے ہمیں اپنا SIR مانا...... تم جیسی ذہین اور منفرد لکھاری کی طرف سے یہ ''مان'' اور بھروسہ ہمارے لیے بہت زیادہ خوشی کا باعث بنا ہے۔

رازق عزیز، بریڈفورڈ لندن سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ سچی کہانیاں یو کے میں لندن سے لے کر مانچسٹر، بریڈفورڈ، حالی فیکس اور دور دراز علاقوں میں جہاں اردو پڑھنے والے ہیں بڑا مقبول ہو رہا ہے یہ سب آپ کی محنت لگن کا کرشمہ ہے۔ میری دو غزلیں پیش خدمت ہیں۔ امید ہے آپ میرا دیارِ غیر میں ہمت حوصلہ افزائی کریں گے۔ اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ اور آپ کے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگوں کو اپنی حفاظت میں رکھے، آمین۔''

محترم رازق عزیز! آپ نے دور دیس سے ہمیں اور ''سچی کہانیاں'' کو یاد کیا۔ دل شکر گزاری کے جذبات کے ساتھ شاد اور آباد ہوا۔

اس ماہ کا خصوصی خط

شگفتہ شفیق کینیڈا سے۔ ''محترم ناصر بھائی السلام علیکم! دیکھ لیں میں کینیڈا آ کر بھی آپ اور سچی کہانیاں کو نہیں بھولی...... بات آگے بڑھانے سے پہلے تو تمام قارئین اور لکھاری ساتھیوں کے لیے سلام اور سلامتی کی دعا...... ناصر بھائی! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ...... میں یہاں ''اردو سوسائٹی آف کینیڈا'' کی دعوت پر آئی ہوں۔ تسلیم الٰہی زلفی اور جمال انجم صاحب یہاں میرے میزبان ہیں لیکن میرا قیام اپنے بھائی محمد علی صدیقی اور بہن ماہ پارہ کے پاس ہی ہے...... آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میری شاعری کی پہلی کتاب ''میرا دل کہتا ہے'' کی تقریب رونمائی بہت سے دوستوں کے اصرار کے باوجود کراچی میں تو نہیں ہوئی لیکن یہاں دور دیس کینیڈا میں ضرور ہوگئی ہے...... یہ تقریب بہت اچھی تھی لیکن مجھے آپ سمیت اپنے تمام عزیزوں دوستوں کی کمی بہت محسوس ہوئی اور ہاں! میں نے یہاں اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ بھی پڑھ لیا...... بہت داد ملی لیکن پھر وہی بات اپنوں کی کمی...... مجھے ''مانٹریال'' میں مشاعرہ پڑھنے کی دعوت بھی ملی ہے لیکن وہ کینیڈا سے بہت دور ہے...... ابھی جانے کا فیصلہ نہیں کیا...... لیکن وہ لوگ اس سلسلے میں آدھے آدھے صفحے کے اخباری اشتہارات چھاپ کر مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ...... اب آگے وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہو...... یہاں میں نے ریڈیو کے ایک پروگرام میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی اپنی ایک ایوارڈ یافتہ کہانی ''کاش'' پڑھی ہے...... لوگوں نے بہت پسند کی...... ناصر بھائی یہاں کینیڈا میں سب اچھا ہے۔ بہت امن و امان ہے اور...... لیکن مجھے اپنے وطن سے اچھی خبریں نہیں آ رہیں...... میرا دل اپنے وطن واپسی کے لیے بے قرار ہے...... میں اپنے پاکستان اپنے کراچی کو اپنی سڑکوں گلیوں اور بازاروں کو بہت مس کر رہی ہوں اور پھر میرے ''اپنے'' بہت یاد آتے ہیں۔ یہاں کینیڈا میں زندگی کا رنگ بہت نیا اور اجلا ہے لیکن جو رنگ اپنے پاکستان میں زندگی کا ہے وہ سارے جہاں میں نہیں ہوسکتا۔ واپسی پر اپنا یہ تجربہ اور مشاہدات سچی کہانیاں کے لیے ایک سفرنامے کی صورت تحریر کروں گی۔ میری طرف سے تمام دفتر والوں خصوصاً رخسانہ بھابی، منزہ، غزالہ رشید، کاشی چوہان اور راجہ محمود صاحب کو سلام عرض کیجیے گا...... یہ مانا کہ میں اس وقت آپ سب لوگوں سے اپنے پاکستان سے بہت دور ہوں لیکن دل وہاں پاکستان میں آپ سب کے قریب ہے۔''

اچھی بہن شگفتہ شفیق! آپ کا یہ نامہ ملا تو...... دل شاد اور آباد ہوگیا...... اس دنیا کی تمام اچھی دعائیں آپ کے لیے...... اور ہاں! آپ کی وطن واپسی کا انتظار تو پہلے بھی بہت تھا لیکن اب اور زیادہ ہے کہ...... سچی کہانیاں کے لیے ایک ''سفرنامہ'' ملے گا۔

اور اب اجاز

پھر ملیں گے گر خدا لایا ناصر ا

WATCH EVERY Mon-Fri At 9:00AM
جی سہیلی

زندہ کہانی مشہور و معروف شخصیات کی زندگی سے اخذ کردہ واقعات اور ان سے جڑی کہانیاں

راجہ محمود

بھولی ہوئی ہوں داستان

محسن نقوی کا خیال
آخر شب وہ کسی یاد کی آہستہ روی!
جیسے رگ رگ میں اترتا چلا جائے کوئی

چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کے عروج و زوال سے جڑی زندہ کہانی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ شدید اضطراری کیفیت میں ٹہل رہا تھا' بے چینی اس کے چہرے سے پوری طرح عیاں تھی بلکہ اس کا پورا وجود بے قراری کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کبھی بیٹھ جاتا مگر پھر یکا یک ٹہلنے لگتا۔ کبھی چہرے پر کسی خیال کے تحت ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی تو اگلے ہی لمحے تفکر کی لکیریں نمایاں ہوجاتیں۔ ہر پل چہرے کے بدلتے تاثرات اس کی اندرونی بے کلی کے غماز تھے۔ اس کی یہ بے چینی ایسی بے وجہ بھی نہیں تھی کیونکہ آج اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملنے کا انتظار تھا۔ وہ ایک صاحبِ حیثیت شخص تھا۔ اس کا نام فلم ڈسٹری بیوشن کے شعبے میں نمایاں اہمیت کا حامل تھا چنانچہ فلمی پردے' فلم والوں اور فلمی ستاروں سے اس کا گہرا تعلق تھا لیکن اس کی بے چینی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کوئی نئی فلم اس کے ادارے سے ریلیز ہوئی ہواور وہ اس کا نتیجہ سننے کا منتظر ہو کہ آیا فلم ہٹ ہوئی یا فلاپ بلکہ اس کی بے کلی کا تعلق ذاتی حیثیت سے تھا۔ وہ ہسپتال کے کوریڈور میں بے تابی سے ٹہل رہا تھا اور اندر لیبر روم میں اس کی راحتِ جاں پیاری بیگم تخلیقی عمل سے گزر رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی اور وہ شدت سے اس خبر کے سننے کا متمنی تھا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خبر ہوتی' تاہم اس کے ساتھ ساتھ اسے بیوی کی فکر بھی لاحق تھی اور وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس کی پیاری جیون ساتھی اس مشکل مرحلے سے بخیر و عافیت سے گزر جائے جس سے ہر وہ شادی شدہ عورت گزرتی ہے جو ماں کے رتبے پر فائز ہوتی ہے۔ وہ اسی کیفیت میں گم تھا کہ اچانک لیبر روم کا دروازہ کھلا اور ایک نرس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ تیزی سے نرس کی جانب لپکا۔ ابھی اس نے کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ نرس نے دلکش مسکراہٹ کے جلو میں اسے بتایا۔



''مبارک ہو' آپ باپ بن گئے ہیں' بیٹا ہوا ہے۔ بہت خوبصورت اور صحت مند ہے۔''

''کک ...... کیا؟'' اس کے منہ سے بمشکل اتنا نکل سکا۔ ''سسٹر ...... وہ ...... میری بیوی ......؟''

''ڈونٹ وری ...... وہ بالکل خیریت سے ہیں۔'' نرس نے اس کی فکر مندی بھانپتے ہوئے کہا۔

نرس نے سچ کہا تھا' اس کا بیٹا واقعی خوبصورت تھا۔ جب اس نے اپنے ننھے منے لختِ جگر کو بانہوں میں اٹھایا تو اس کے دل میں خوشیاں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ چلا چلا کر سب کو اپنی اندرونی مسرت کا احساس دلائے۔ اس کی بیوی شیریں بیگم بھی خوشی سے نہال تھی۔

2 اکتوبر 1938ء کو پیدا ہونے والا یہ کیوٹ سا بچہ کوئی اور نہیں بلکہ وحید مراد تھا جس نے معروف فلم ڈسٹری بیوٹر نثار مراد کے گھر میں آنکھ کھولی تھی۔ نثار صاحب اور شیریں بیگم کی یہ واحد اولاد تھی لہٰذا دونوں میاں بیوی کی خوشی دیدنی تھی۔ وحید مراد جسے گھر میں ویدو بابا کہا جاتا تھا' اس کی آمد سے نثار صاحب کے سُونے گھر میں رونق آ گئی تھی۔ وہ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ والدین نے اپنی اکلوتی اولاد کی پرورش بالکل شہزادوں کی طرح کی۔ اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش پلک جھپکتے میں پوری ہوجاتی تھی۔ نثار صاحب چونکہ مستحکم کاروباری شخصیت تھے' گھر میں خوشحالی کا دور دورہ تھا' روپے پیسے کی ریل پیل تھی' گھر میں نوکر چاکر بھی تھے لہٰذا وحید کی پرورش کسی نواب کی طرح ہی ہونا تھی۔ انگریزی کی کہاوت کے مطابق' وہ حقیقتاً منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ وحید کی پرورش ناز و نعم سے ہونے لگی۔ اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش یک جنبشِ لب سے پوری ہوجاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدا ہی سے ضدی پن اس کی طبیعت میں شامل ہو گیا تھا اور ضدی پن کی یہ عادت وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت میں پختہ ہوتی چلی گئی۔ بچپن میں اسے کسی بھی نوعیت کی محرومی یا تشنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو بظاہر تو خوش آیند بات تھی مگر اس چیز سے اس کی شخصیت میں کجی رہ گئی جو اس کے لیے اُس وقت انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئی جب اس کی پروفیشنل زندگی زوال کے بھنور میں پھنسی۔



وحید مراد اور زیبا فلم ارمان میں

بہرحال وحید عرف ویدو کا بچپن ہر لحاظ سے مکمل' مطمئن' آسودہ حال اور عیش و عشرت سے بھرپور تھا۔ وہ جب کچھ بڑا ہوا تو اسے کراچی گرامر اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس اسکول کو 'میری کلاسو' بھی کہا جاتا تھا۔ مذکورہ اسکول اُس وقت کراچی کے چند بہترین اور مہنگے ترین اسکولز میں سے ایک تھا۔ یہ اسکول ایم اے جناح روڈ پر سابقہ ناز سینما کے عقب میں واقع تھا جبکہ اُن دنوں وحید کا گھر لسبیلہ جماعت خانہ کے قریب تھا۔ وحید کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو والد نثار صاحب نے اس پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔ گھر پر بھی اس کے لیے ٹیوٹر لگا دیا گیا۔ اس کے علاوہ والدہ شیریں بیگم خود بھی اس کی پڑھائی میں مدد کرتی تھیں۔ وحید غیر معمولی ذہین طالب علم تو نہیں تھا مگر اس کا تعلیمی ریکارڈ برا بھی نہیں رہا۔ اس نے تمام تعلیمی مراحل امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ اس نے میری کلاسو سیکنڈری اسکول سے 1952ء میں میٹرک بی گریڈ میں پاس کیا۔ میری کلاسو اسکول کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں اپنے وقت کی نامور شخصیات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یا ان کے بچوں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ اسکول کے تعلیمی معیار کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور وحید مراد جیسے لاڈلے کھلنڈرے بچے کا اس اسکول سے بی گریڈ میں پاس ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پڑھائی میں اوسط درجے سے کچھ اوپر ہی تھا کیونکہ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی' ایسے ماحول میں بچے عموماً پڑھائی کی جانب خال خال ہی راغب ہوتے ہیں اور بمشکل تعلیمی مدارج طے کرتے ہیں۔ اس تناظر میں وحید کا بی گریڈ میں میٹرک کرنا یقیناً کسی کارنامے سے کم نہیں تھا۔ وحید مراد کے کلاس فیلوز میں موسیقار سہیل رعنا اور پرویز ملک بھی شامل تھے۔ یہ دونوں بھی آگے چل کر فلم لائن سے وابستہ ہوئے۔ ایف ایس سی کرنے کے بعد وحید نے اپنا شعبہ تبدیل کرلیا اور آرٹس میں آ گیا۔ سائنس میں اسے خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے سائنس کے سبجیکٹ اسے مشکل لگتے تھے۔ ایس ایم آرٹس کالج سے اس نے گریجویشن مکمل کیا اور پھر انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنے کے لیے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ انگلش لٹریچر جیسے خشک اور مشکل سبجیکٹ کا انتخاب کرنے کی وجہ وحید کی دلچسپی تھی۔ اسے شروع ہی سے لٹریچر خاص طور پر انگلش ادب میں دلچسپی تھی۔ انتہائی کم عمری سے ہی وحید نے لٹریچر کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا اور بہت جلد ہی انگریزی ادب کی نامور کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔

لٹریچر سے دلچسپی فلمی لائن میں اس کے بے حد کا[م] آئی۔ جب اس نے عملی زندگی میں اپنی ذاتی فلمیں پروڈیوس کیں تو ان کے اچھوتے موضوعات ا[سے] انگریزی ادب کے مطالعے ہی سے ملے۔ وحید [کو] انگلش لٹریچر کے مطالعے کا ایسا شوق تھا کہ اس کے پاس انگریزی ادب کا وسیع ذخیرہ موجود تھا اور تا[عمر] اس کی عادت رہی کہ سونے سے پہلے وہ کچھ نہ کچھ مطالعہ ضرور کرتا تھا۔

نثار مراد صاحب کا بزنس چونکہ فلم سے متعلق [تھا] اسی لیے گھر میں فلمی لوگوں کا آنا عام سی بات تھی۔ گھر میں فلمی تقریبات کا ہ[ونا] اور ان میں نامور فلمی ستاروں [کی] شرکت آئے دن معمول تھا۔ وحید [یہ] سب دیکھتے ہو[ئے] جوان ہوا تھا لہٰ[ذا] اسے بھی فلمی لائن سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی چنانچہ تعلیم حاصل [کرنے کے] دوران ہی اس نے والد کے آفس جانا شروع کر د[یا] تھا۔ والد کا ادارہ 'پاکستان فلمز' فلم ڈسٹری بیوشن [کے] حوالے سے ایک جانا پہچانا نام تھا۔ اس کا آفس ا[یم] اے جناح روڈ پر سابقہ لائٹ ہاؤس سینما [کے] قریب واقع تھا۔ نثار صاحب کے ادارے کے تحت نہ صرف پاکستانی فلمیں ریلیز ہوئیں بلکہ ہندوستانی فلمیں بھی نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ یہ وہ دور تھا جب بارٹر سسٹم کے تحت پاکستان میں ہندوستانی فلمیں ریلیز کی جاتی تھی۔

والد کے آفس میں مستقل آنے جانے سے [یہ] ہوا کہ وحید کی دلچسپی فلم اور اس سے وابستہ کاروبا[ر میں]


وحید مراد فلم سمندر میں

[بڑ]ھتی چلی گئی۔ چنانچہ اسی دلچسپی کے باعث اس نے دورِ طالب علمی کے دوران ہی اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کردیا اور پھر کاروباری اسرار و رموز سمجھتے ہی وحید نے سب سے پہلے اپنا الگ ادارہ 'فلم آرٹس' کے نام سے قائم کیا اور اس طرح عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔ نثار صاحب کو اس پر قطعی کوئی اعتراض نہیں تھا کہ بیٹے نے الگ سے اپنا بزنس شروع کر دیا ہے بلکہ وہ بے حد خوش تھے کہ ان کے اکلوتے صاحب زادے نے فلم لائن کا انتخاب کیا ہے۔ نثار صاحب نے اس سلسلے میں وحید کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور گاہے بگاہے اس کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔ وحید کا فلمی سفر تو بہت پہلے ہی شروع ہو چکا تھا' تاہم باقاعدہ طور پر اس کے کیریئر کا آغاز 1961ء میں ہوا جب اس نے بطور پروڈیوسر ''انسان بدلتا ہے'' پروڈیوس کی۔ اس کے اگلے ہی سال یعنی 1962ء میں وحید بطور اداکار بھی سلور اسکرین پر نمودار ہوگیا۔ ہدایت کار ایس ایم یوسف کی فلم ''اولاد'' اداکار کی حیثیت سے اس کی پہلی فلم تھی جس میں اس نے سپورٹنگ رول کیا تھا۔ اس فلم کو سال 1962ء کی بہترین فلم کا 'نگار ایوارڈ' ملا تھا۔ 1963ء میں وحید ''دامن'' میں نظر آیا اور 1964ء میں اس کی ''ماں تا'' ریلیز ہوئی لیکن ان تمام فلموں میں اس نے سپورٹنگ رولز کیے تھے یہی وجہ تھی کہ ان فلموں سے وہ نمایاں نہیں ہوسکا۔ واضح رہے کہ وحید نے یہ تمام فلمیں اس وقت کیں جب وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ گریجویشن کے امتحانات کے دوران وہ فلموں میں بھی مصروف تھا۔ اسی وجہ سے وہ لاہور اور کراچی کے درمیان شٹل کاک بن گیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رات میں وہ لاہور کے کسی اسٹوڈیو میں کسی فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہوتا اور صبح پہلی فلائٹ سے کراچی پہنچ کر اگلے دن بی اے کا کوئی پیپر دے رہا ہوتا۔ اس سے وحید کی اپنے کام اور تعلیم سے کمٹمنٹ کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

وحید کے اداکار بننے کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ اسے اسکرین پر آنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ خود کو فلمی پردے کے لیے ناموزوں سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کی سانولی سلونی شخصیت ہیرو بننے کے لیے کسی طور موزوں نہیں تھی حالانکہ اکثر ہدایت کار اور پروڈیوسر وحید کو اداکاری کی فیلڈ میں آنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے اور وحید ان کے مشوروں پر مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ ان ہی ڈائریکٹرز میں ایک نام ایس ایم یوسف کا بھی شامل تھا جو متعدد بار وحید کے والد نثار صاحب سے اصرار کر چکے تھے کہ وحید کو اداکاری کے لیے راضی کریں۔ ان کی تجربہ شناس نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ وحید میں ہیرو بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں' تاہم وحید نے کبھی بھی یوسف صاحب کی بات پر کان نہیں دھرا اور مسلسل انکار کرتا رہا۔ ان ہی دنوں ایس ایم یوسف صاحب فلم ''اولاد'' بنا رہے تھے۔ اس فلم میں ایک مختصر سا رول تھا اور یوسف صاحب چاہتے تھے کہ یہ رول وحید کرے جبکہ وحید مسلسل ٹال رہا تھا۔ آخر انہوں نے نثار صاحب کے ذریعے اس پر دباؤ ڈلوایا اور وحید کو راضی ہوتے ہی بنی۔ ''اولاد'' باکس آفس پر نہ صرف کامیاب ہوئی بلکہ اس میں وحید کے چھوٹے سے رول کو بھی سراہا گیا۔ اس طرح وحید کے ایکٹنگ کیریئر کا آغاز ہوگیا۔ اپنی اداکاری پر ناقدین کی مثبت رائے پر وحید نے سنجیدگی سے اداکاری کے حوالے سے سوچنا شروع کر دیا لیکن اس کے باوجود اس کی دلچسپی پروڈکشن میں زیادہ تھی کیونکہ وہ ابھی بھی خود کو اداکاری کے لیے مس فٹ سمجھتا تھا۔ وحید اسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اسے ایک اور فلم کی آفر ہوگئی۔ یہ آفر اس کے والد کے دوست سنتوش کمار لے کر آئے تھے۔ وحید چونکہ ایک فلم میں کام کر چکا تھا لہٰذا نثار صاحب، دوست کو انکار نہیں کر سکے اور سنتوش کمار کی فلم ''دامن'' میں وحید نے نیلو کے مقابل ایک سپورٹنگ رول کیا۔ اس فلم کے ڈائریکٹر قدیر غوری تھے اور صبیحہ، سنتوش لیڈ رول کر رہے تھے۔ اس فلم کی شوٹنگ لاہور میں ہوئی تھی۔ وحید اس میں کام مکمل کروا کے واپس کراچی آ گیا تھا۔ اس زمانے میں کراچی میں لاہور سے زیادہ فلمیں بنتی تھیں۔ واضح رہے کہ کراچی کی فلمی صنعت کو پروان چڑھانے میں وحید کے ذاتی فلم ساز ادارے نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جس دن ان کا ادارہ 'فلم آرٹس' کراچی سے ختم ہوا، کراچی کی فلمی صنعت بھی ختم ہوگئی۔ وحید مراد نے فلم آرٹس کے تحت پہلی پروڈکشن ''انسان بدلتا ہے'' پیش کی اور اس کے بعد ''جب سے دیکھا ہے تمہیں'' بنائی۔ ان دونوں فلموں کے لیے اس نے ہدایت کار منور رشید کو لیا۔ دوسری پروڈکشن میں موسیقی کے شعبے میں اس نے اپنے بچپن کے دوست سہیل رعنا کو موقع دیا جو اُن دنوں ریڈیو پر کام کر رہے تھے۔ ''جب سے دیکھا ہے تمہیں'' میں مرکزی کردار درپن اور زیبا کر رہے تھے۔ یہ درپن کے عروج کا دور تھا۔ ان کا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت تھا لہٰذا درپن کے نخرے بھی عروج پر تھے اور وحید کو ہیرو بنانے میں درپن کے نازنخروں کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ اس فلم کی تیاری میں درپن نے اپنے رویئے سے وحید کو اتنا پریشان کیا کہ وحید تنگ آ گیا۔ وہ وحید جس نے ہمیشہ ناز برداریاں اٹھوائی تھیں مگر پروفیشنل لائف میں اسے درپن کے نخرے اٹھانا پڑ رہے تھے۔ وہ وحید جس کا دماغ ہمیشہ ساتویں آسمان پر رہتا تھا اور جو نوکروں کی معمولی غلطیوں پر ان کی چھٹیاں کر دیتا تھا، وہ اپنے ہیرو کے آگے مجبور و لاچار ہو گیا تھا کیونکہ درپن اس وقت ہاٹ کیک تھا اور وحید جیسے ٹھیٹ کاروباری کے لیے اپنے ہیرو کو ناراض کرنا کسی صورت بھی سودمند نہیں تھا۔ اس کے ہیرو نے پوری فلم کی تیاری میں وحید کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی، درپن ایک خاص قسم کا سگریٹ پینے کے عادی تھا جو کراچی کی مخصوص دکانوں پر ہی ملتا تھا۔ اس روز شوٹنگ کے دوران درپن کا سگریٹ ختم ہوگیا اور وہ کام چھوڑ کر بیٹھ گیا کہ جب تک اس برانڈ کا سگریٹ نہیں آئے گا، وہ کام نہیں کرے گا۔ یوں شوٹنگ رک گئی۔ اس موقع پر بے چارہ وحید پیچ و تاب کھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا مجبوراً اس نے اسٹوڈیو ورکرز کو دوڑایا کہ درپن صاحب کا پسندیدہ برانڈ ڈھونڈ کر لائیں۔ اس قسم کے بے شمار واقعات اس فلم کی شوٹنگ کے دوران ہوئے جس سے درپن کے رویئے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال خدا خدا کر کے یہ فلم مکمل ہوئی اور وحید نے سکھ کا سانس لیا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب آئندہ وہ اپنی کسی فلم میں درپن کو نہیں لے گا بلکہ اپنی فلم میں خود ہی ہیرو کی حیثیت سے آئے گا۔ اس طرح درپن کا رویہ وحید کے ہیرو بننے کا سبب بن گیا۔

وحید نے جب اپنے اگلے پروجیکٹ پر کام شروع کیا تو اس میں زیبا کے مقابل ہیرو کے لیے اس کا اپنا نام سامنے آیا۔ ''ہیرو اور پتھر'' پلان کرتے ہوئے وحید نے بہت سی چیزوں پر خصوصی کام کیا مثلاً اس نے اس پروجیکٹ کے لیے ایسے افراد پر مشتمل ٹیم تشکیل دی جو اپنے اپنے شعبوں میں نئے ضرور تھے مگر صلاحیتوں سے مالا مال تھے

...ہیرو ان کی یہ پہلی فلم تھی۔ ڈائریکشن کے لیے ...ملک پر اعتماد کیا گیا جو ان دنوں نئے نئے ...سے سینماٹوگرافی کا کورس کر کے لوٹے تھے ...کام کی تلاش میں تھے۔ موسیقی کا شعبہ سہیل رعنا ...میں آیا۔ ان کے بھی کیریئر کے ابتدائی ...تھے۔ گلوکار احمد رشدی تھے اور نغمہ نگار مسرور ...تھے۔ اس نوآموز ٹیم نے ''ہیرا اور پتھر'' پر کام ...کر دیا۔ اس ٹیم کے تمام اہم ارکان نوجوان ...ان میں کام کی لگن بھی تھی اور کچھ کر دکھانے کا کھڑا کیا۔ اسی فلم سے زیبا، وحید کی جوڑی بھی ہٹ ہوئی۔ ''ہیرا اور پتھر'' کو تمام سرکٹس میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور فلم نے گولڈن جوبلی منائی۔ نوجوانوں پر مشتمل یہ ٹیم ایسی ہٹ ہوئی کہ اس نے ایک کے بعد ایک ہٹ فلم دینا شروع کر دی۔ ارمان (پلاٹینم جوبلی)، احسان (گولڈن جوبلی)، دوراہا (سلور جوبلی)، جہاں تم وہاں ہم (سلور جوبلی) جیسی شاندار فلمیں اس باصلاحیت ٹیم کی کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔



وحید مراد اور شبنم فلم بندی سے ایک منظر میں

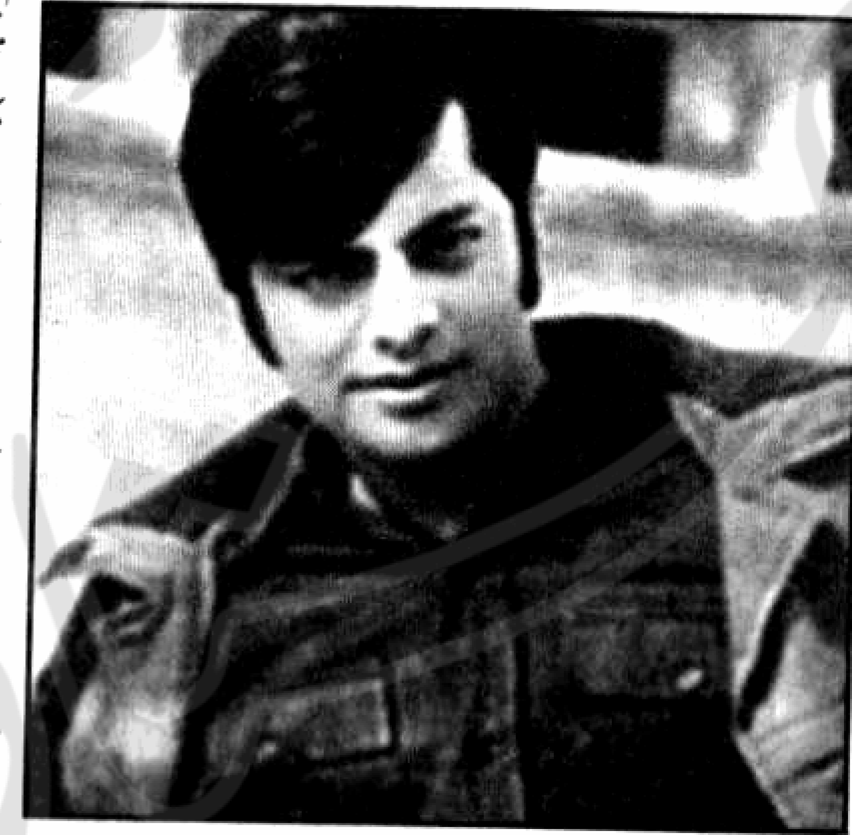
...بھی تھا، لہو میں جوش بھی تھا اور امنگیں بھی ...ان ...اور ان سب چیزوں میں جب محنت بھی شامل ہو جائے تو پھر شاہکار تخلیق ہوتا ہے۔ یہی کچھ ''ہیرا اور پتھر'' کے ساتھ بھی ہوا۔ یہ فلم ریلیز ہوئی اور باکس آفس پر اس نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ''ہیرا اور پتھر'' کی ریلیز نے وحید مراد کو راتوں رات صف اول کے ہیروز کی صف میں لا

''ہیرا اور پتھر'' کے بعد وحید مراد ہیروز کی فہرست میں شامل ہوگیا۔ یہ فلم 1964ء کی ریلیز تھی۔ اس سے اگلے سال یعنی 1965ء میں وحید کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں بہو بیگم، ڈاکٹر، ساز و آواز، عید مبارک اور کنیز شامل تھیں مگر جس فلم میں ... جادو صحیح معنوں میں سر چڑھ کر بولا، وہ ''ارمان'' تھی۔ یہ 1966ء کی ریلیز تھی۔ اس فلم میں ...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیبا کی بے مثال رومانوی جوڑی نے ایسا تہلکہ مچایا کہ اس وقت کے سپر اسٹارز کو اپنے مستقبل کی فکر لاحق ہوگئی۔ فلم 'ارمان' پاکستان کی پہلی پلاٹینم جوبلی بھی ثابت ہوئی۔ اس فلم سے وحید سپر اسٹارز کی صف میں شامل ہوگیا۔ یہی وہ فلم تھی جس سے نوجوانوں کو وحید مراد فوبیا ہوگیا۔ ارمان ہی سے وحید کے گانے فلمانے کا انداز بھی پاپولر ہوا۔

'اکیلے نہ جانا' 'میرے خیالوں پہ چھائی ہے' اور 'جب پیار میں دو ملتے ہیں' جیسے گانوں نے نوجوان لڑکے' لڑکیوں کو جیسے پاگل کر دیا۔ گلی' محلوں' کالجز اور یونیورسٹیز میں ہ نوجوان ماتھے پر پ گرائے بس یہی گا گنگناتا ہوا ملتا تھا۔ وحید کا انداز' اس کا ہیئر اسٹائل اس کی ایک ایک اد نوجوانوں میں اتنی مقبول ہوئی کہ یوں لگتا تھا جیسے ملک بھر میں وحید نامی وبا پھیل گئی ہو۔ چاکلیٹی ہیرو اور لیڈی کلر جیسی اصطلاحیں بھی اس کی چارمنگ شخصیت کا حصہ بن گئیں۔ نوجوان لڑکے اس کے ہر انداز کی نقل کرتے تھے تو نوجوان لڑکیاں اس کی تصویریں اپنے پرس اور کتابوں میں رکھنے لگی تھیں۔ وہ چوری چھپے اس کی تصویریں دیکھتیں اور آہیں بھرتی تھیں۔ سیلونز میں ہر نوجوان وحید اسٹائل کی کٹنگ کروانے لگا۔ یہ کٹنگ 'وحید مراد کٹ' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے بڑے بڑے پوسٹرز بھی ہر جگہ نظر آنے لگے۔ 'ارمان' سے وحید کے ادارے فلم آرٹس نے اتنا کمایا کہ ادارے کا بینک اکاؤنٹ کئی گنا بڑھ گیا۔ 'ارمان' کے بعد وحید کی کامیابیوں کا سلسلہ چل پڑا اور اس کی ایک کے بعد ایک ہٹ فلم ریلیز ہوتی رہی اور وحید ایسا چیک بن گیا جسے کسی بھی وقت کیش کرایا جا سکے۔ چنانچہ پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز نے وحید مراد نامی اس چیک کو کیش کرانا شروع کر دیا۔ وحید کے لیے خصوصی کردار لکھے جانے لگے۔ اس کے گانے پکچرائز کرانے کے منفرد انداز کو دیکھتے ہوئے اس پر ہر فلم میں کم از کم تین سے چار گانے فلمائے جانے لگے۔ گانے پکچرائزنگ میں حقیقتاً اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس دور کے معروف ڈائریکٹرز اور موجودہ دور کے فلم میکرز اس بات پر پوری طرح متفق ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں وحید سے بہتر گانے فلمانے والا کوئی دوسرا ہیرو نہیں آیا۔ وحید کی شہرت سرحدیں پار کرتی ہوئی پڑوسی ملک میں بھی ج پہنچی جہاں اس کے اسٹائل کو کاپی کرنے کی کوشش کی گئی۔ یتندر اور راجیش کھنہ نے اس کے انداز کو اپنانے کی کوشش ضرور کی مگر وہ دونوں وحید کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔



جس وقت وحید ایک نئے سپر اسٹار کی حیثیت سے ابھ رہا تھا' اس زمانے میں دلیپ کمار' راج کپور' دیو آنند' ش کمار اور پرتھوی راج کمار جیسے اسٹارز ہمارے یہاں کے فلم بینوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے مگر وحید نے اپنے چارم سے فلم بینوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا جو یقی حیران کن امر تھا۔

1964ء میں ہی جب وحید کے کیریئر کا آغاز ہوا تھا کہ وہ شادی کے بندھن میں بند گیا۔ سلمیٰ کراچی کے ایک معروف میمن صنعت کار کی صاحب زادی تھیں اور کلاسو گرامر اسکول میں وحید کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ جب وحید گریڈ ن میں تھا کہ اسے سلمیٰ سے محبت ہوگئی جس میں ت کے ساتھ ساتھ شدت آتی گئی اور آخر اس ت کا انجام شادی پر منتج ہوا۔

17 ستمبر 1964ء کو جمعرات کے دن دونوں ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ شادی کی تقریب مراد کے طارق روڈ پر واقع گھر میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ ندیم نے گانے کر حاضرین کو خاصہ محظوظ تھا۔ واضح رہے' ندیم وقت تک اداکار نہیں بنا تھا بلکہ گلوکار کی حیثیت خود کو منوانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

وحید کی شادی کے حوالے سے حیرت انگیز چیز یہ ی کہ اس کی فی میل فین فالوئنگ پر کوئی اثر نہیں پڑا ا۔ لڑکیاں بالیاں اب بھی اسے چاہتی تھیں اور وہ طرح خواتین کا چہیتا رہا تھا۔ فی میل فالوئنگ حوالے سے ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔

دورِ عروج میں ایک روز وہ اپنی کار میں کراچی معروف علاقے صدر میں آیا تھا۔ اس وقت ریباً تیس لڑکیوں کا ایک گروپ بھی صدر میں جود تھا' لڑکیوں نے جب وحید مراد کی کار کو دیکھا اس کی گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کار پر وں کی بارش کر دی اور اس کی سفید کار لڑکیوں کی پ اسٹک سے مزین ہوگئی۔

وحید مراد کی فلموں کی سال بہ سال ریلیز کچھ طرح رہی۔ 1962ء میں اس کی ایک فلم ہوئی' 63ء میں ایک' 64ء میں 2' 65ء 5' 70ء میں 6' 71ء میں 5' 72ء میں 73ء میں 4' 74ء میں 13' 75ء میں 6' ء میں سب سے زیادہ یعنی 14' 77 میں 3' میں 8' 79ء میں 7' 80ء میں 5' 81ء میں 82ء میں 3' 83ء میں ایک' 85ء میں ایک اور 86ء میں ایک فلم ریلیز ہوئیں۔ اس طرح وحید کے 23 سالہ فلمی کیریئر میں 125 فلمیں ریلیز ہوئیں۔ اس کے علاوہ تین فلموں میں وہ گیسٹ اپیئرنس (Guest appearance) کے طور پر سامنے آیا۔

وحید مراد کا دور عروج 60ء کے اوائل سے شروع اور 70ء کے وسط تک رہا۔ اس عرصے میں اس نے اسٹارڈم کا بھرپور لطف اٹھایا اور ایسی لازوال شہرت حاصل کی جو بہت کم فنکاروں کے حصے میں آتی ہے۔

وحید مراد کے کیریئر کے ساتھ بہت سے ایسے منفرد اعزازات بھی جڑے ہیں جو پاکستانی فلمی صنعت کے کسی اور فلم اسٹار کے حصے میں نہیں آئے مثلاً وحید برصغیر پاک و ہند کا وہ واحد فلمی اداکار ہے جس نے اپنے 23 سالہ فلمی کیریئر کے دوران بیک وقت اداکار' ہدایت کار' گلوکار' پروڈیوسر اور اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ وحید کی فلم ''عید مبارک'' پاکستان کی پہلی رنگین فلم تھی جس کا چھوٹا سا حصہ رنگین کیا گیا تھا۔ وحید مراد نے انگلش میں ماسٹرز کیا تھا' اس لحاظ سے وہ پاکستان کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اداکار تھا۔ اس کی فلم ''ارمان'' پاکستان کی پہلی پلاٹینم جوبلی فلم تھی۔ وحید کی فلم ''رشتہ ہے پیار کا'' پہلی پاکستانی فلم تھی جس کی شوٹنگ ملک سے باہر کی گئی تھی۔ دو مختلف کہانیوں پر بننے والی پہلی پاکستانی فلم ''چاند سورج'' کا بھی وحید حصہ تھا۔ وحید مراد کی 59 فلموں نے سلور جوبلی' 33 نے گولڈن جوبلی' 6 نے پلاٹینم جوبلی اور ایک فلم نے ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ اس طرح وہ پاکستانی فلموں کا واحد سپر اسٹار رہا ہے جس کے کریڈٹ پر سب سے زیادہ سلور' گولڈن' پلاٹینم اور ڈائمنڈ جوبلی فلمی ہیں۔ ریڈیو پاکستان نے وحید مراد کے 43 انٹرویوز نشر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیے جوکہ پاکستان میں کسی بھی فلم اسٹار کے حوالے سے ایک ریکارڈ ہے۔ وحید کو گانے پکچرائز کروانے پر ملکہ حاصل تھا لہٰذا اسے 'ماسٹر آف سانگ پکچرائزیشن' کا خطاب بھی ملا۔

وحید مراد کی تشکیل دی ہوئی بے مثال ٹیم جو موسیقار سہیل رعنا' نغمہ نگار مسرور انور' گلوکار احمد رشدی اور ہدایت کار پرویز ملک پر مشتمل تھی۔ اس ٹیم نے 'ہیرا اور پتھر' ارمان' احسان' دوراہا' اور 'جہاں تم' وہاں ہم' جیسی سپر کلاس فلمیں بنائیں۔ بدقسمتی سے 'جہاں تم' وہاں ہم' کے بعد اس ٹیم کے ارکان میں اختلافات ہوگئے اور یہ ٹیم بکھر گئی۔ ٹیم کے ٹوٹنے کا ذمہ دار وحید مراد کے رویئے کو ٹھہرایا گیا۔ اس کے ساتھیوں کو وحید سے اکثر یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ پروفیشنل ازم کے سامنے دوستی کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ کاروباری معاملات میں وہ اس قدر ٹھیٹ تھا کہ ایک ایک پائی کا حساب رکھتا تھا۔ نہ کسی کا ایک پیسہ رکھتا تھا اور نہ کسی کو ایک پیسہ زیادہ دیتا تھا۔ اسی پیشہ ورانہ رویئے کی وجہ سے اس کے دوست ناراض رہتے تھے حالانکہ اس کی یہ خوبی تھی کہ وہ کاروبار کے حوالے سے کوئی راز اپنے دوستوں سے نہیں چھپاتا تھا۔ وحید کے دوست اس کے تمام کاروباری رازوں سے واقف تھے لیکن اس کے باوجود بہترین فلمیں تخلیق کرنے والی یہ ٹیم ختم ہوگئی اور ان سب ارکان کے راستے جدا ہوگئے۔

وحید کی ہیروئنز کی بات کی جائے تو ان میں رانی' زیبا' شمیم آراء' دیبا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شبنم' بابرہ شریف' عالیہ' سنگیتا' کویتا' رخسانہ' بہار' نیلو اور روزینہ بھی ان کی ہیروئنوں کی صف میں شامل رہیں جبکہ اس کے کیریئر کی تین پنجابی فلموں میں اس کے مقابل آسیہ' نغمہ' ممتاز اور انجمن جیسی ہیروئنز تھیں۔

رانی اور وحید مراد کی جوڑی بہت زیادہ پسند کی گئی۔ رانی کے ہمراہ وحید نے سب سے زیادہ یعنی 20 فلمیں کیں جن میں دیور بھابھی' دل میرا دھڑکن تیری' ناگ منی' انجمن اور لیلیٰ مجنوں قابل ذکر ہیں۔ زیبا اور وحید کی جوڑی نے 'ہیرا اور پتھر' ارمان' انسانیت' احسان' اور 'رشتہ ہے پیار کا' جیسی خوبصورت فلمیں دیں۔ شبنم کے ساتھ وحید نے آٹھ فلمیں کیں جن میں 'عندلیب' بندگی' نصیب اپنا اپنا' اور 'سہیلی' سرفہرست ہیں۔ واضح رہے کہ شبنم کو اردو فلموں میں متعارف کروانے کا سہرا وحید مراد کے سر جاتا ہے۔ اس نے شبنم کو مشرقی پاکستان سے بلا کر 'سمندر' میں کاسٹ کیا لیکن اس فلم کے کچھ سینز پر شبنم کے شوہر روبن گھوش کو اعتراض تھا۔ اس کی خواہش تھی' یہ سین فلم سے نکال دیئے جائیں مگر پکے کاروباری وحید نے ان باتوں کو قطعی اہمیت نہیں دی اور فلم جوں کی توں ریلیز کر دی۔ روبن گھوش کو شبنم کے پوسٹرز پر بھی اعتراض تھا' ایک پوسٹر میں شبنم کو بھیگے لباس میں سمندر کے کنارے بیٹھا دکھایا گیا تھا۔ روبن گھوش چاہتا تھا کہ وحید ان پوسٹرز کی نمائش نہ کرے مگر وحید نہ مانا اور اس اعتراض کو بلاجواز قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا کیونکہ پوسٹر میں شائع ہونے والی تصویر وحید کا انتخاب تھی چنانچہ اس فلم کے بعد شبنم اور روبن گھوش' وحید سے ناراض ہوگئے پھر کئی سالوں بعد ہدایت کار شباب کیرانوی صاحب کو وحید' شبنم کی جوڑی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے دونوں کی ناراضگی ختم کروائی اور اس طرح یہ جوڑی 'سہیلی' میں یکجا ہوسکی۔

وحید کی عادات واطوار اور پسند ناپسند کے متعلق بات کریں تو بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں جو اس کے پرستاروں کے علم میں اضافے کا باعث ہوں گی۔ وحید کا پسندیدہ رنگ نیلا تھا۔ پسندیدہ

...یت ہٹلر' پسندیدہ ڈش مچھلی فرائی اور مچھلی چاول' ...ندیدہ ملک جاپان' اپنی ذاتی پسندیدہ فلمیں ...انیت' انجمن' ارمان اور عندلیب' پسندیدہ ہیئر ...یسر کراچی میں رفیق ہیئر ڈریسر اور لاہور میں ...رشید ہیئر ڈریسر' اپنی فلم کا پسندیدہ گانا 'بھولی ہوئی ...ں داستاں' (دوراہا)' پسندیدہ پاکستانی گلوکار احمد ...شدی' پسندیدہ شاعر کیٹس' پسندیدہ شہر کراچی اور ...ندیدہ غیر ملکی گلوکارہ مصر کی ام کلثوم تھیں۔

وحید مراد کو جھوٹ سے شدید نفرت تھی اور وہ ...وٹ بولنے والوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ عموماً

عادت کے باعث زندگی کے آخری ایام میں اس کا ایکسیڈنٹ بھی ہوگیا تھا۔ وہ فطرتاً نرم دل تھا مگر اپنی نرم طبیعت لوگوں پر ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اسے شلوار قمیص پہننا پسند تھا مگر تقریبات میں تھری پیس سوٹ کو ترجیح دیتا تھا۔ پان شوق سے کھاتا تھا اور چائے کا بھی شوقین تھا لیکن سگریٹ نوشی کی عادت نہیں تھی۔ وحید کو ٹی وی دیکھنے سے بھی رغبت نہیں تھی۔ اس کے مشاغل میں کرکٹ' میوزک' مطالعہ اور فوٹوگرافی شامل تھے۔

وحید مراد نے 70ء کے وسط تک عروج کا دور



فلم ہیرا اور پتھر میں وحید مراد اور زیبا

...ھی رات کے بعد سوتا تھا اور بستر پر جانے کے دو ...ھائی گھنٹے بعد سوتا تھا۔ اس دوران وہ مطالعہ کرتا ...ا یا میوزک سنتا تھا۔ غیر ضروری باتوں سے ...جتناب کرتا تھا۔ ہمیشہ وقت کی پابندی کو اہمیت دیتا ...ا۔ جوانی میں وحید کو جلد غصہ آجاتا تھا' تاہم عمر ...ے ساتھ ساتھ اس نے اپنی اس خامی پر قابو پالیا ...ا۔ وہ ہمیشہ والدین' سینئرز اور بڑوں کی عزت کرتا ...ا۔ اسے کار تیز ڈرائیو کرنے کی عادت تھی' اسی

دیکھا۔ اس دوران اس نے ایسی زندگی گزاری جس کا محض تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ عزت' دولت' شہرت' محبت...... قدرت نے اسے ہر چیز بن مانگے ہی دے دی۔ برصغیر پاک و ہند میں بہت ہی کم فلمی ہیروز ایسے گزرے ہیں جنہیں وحید جیسی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وحید کو پرستار کسی دیوتا کی طرح پوجتے تھے۔ جب وہ فلمی پردے پر جلوہ گر ہوتا تو نوجوان اس کے روپ میں خود کو محسوس کرتے تھے اور صنفِ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نازک اس کی ہر ہر ادا پر ہائے کر کے رہ جاتی تھیں۔ وہ لڑکیوں کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ پاکستان میں کسی اور فلمی ہیرو کو صنفِ نازک نے اتنا نہیں چاہا جتنی چاہت وحید کے حصے میں آئی مگر جیسا کہ قانونِ فطرت ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے' چنانچہ وحید کو بھی زوال کے اندھیرے نے نگل لیا۔ 1970ء کے اواخر میں اس کا زوال شروع ہوا' اس کی فلمیں تواتر سے ناکام ہونے لگیں تو پروڈیوسرز' ڈائریکٹرز نے اس سے رخ موڑ لیا۔ وہ فلم ساز جو اس کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے' اس سے کنی کترانے لگے۔ وہ فلمی تتلیاں جو وحید کی بانہوں میں آنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں' انہوں نے وحید کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ان ہیروئنوں کا الزام یہ تھا کہ وحید غیر ضروری طور پر کلوز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور غیر اخلاقی حرکتیں کرتا ہے۔ اس بدنامی کے باعث شمیم آراء نے زیبا کو وحید کے ساتھ فلمیں کرنے سے روک دیا تو نشو پر ان کے شوہر نے پابندی لگا دی۔ رانی نے بھی وحید کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ان سب چیزوں کے پیچھے محض وحید کی ناکامی ہی نہیں تھی بلکہ ایک مخصوص لابی بھی کام کر رہی تھی۔ وحید کے لیے یہ سب کچھ حیران کن اور ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے تو پیدا ہوتے ہی آئیڈیل زندگی گزاری تھی' ہر ایک کو اپنے آگے پیچھے پھرتے دیکھا تھا اور اب یہ حال تھا کہ وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ ان دنوں اس کی فیملی لائف بھی ڈسٹرب تھی۔ اس کی بیوی سلمیٰ مراد بیٹی کو لے کر امریکہ چلی گئی تھی۔ ماں لاہور میں تھی اور وہ کراچی میں تنہا زندگی کی انتہائی تلخ سچائیوں کو بھگت رہا تھا۔ ان صدمات نے وحید کو توڑ کر رکھ دیا اور بیمار ہو کر بستر سے جا لگا۔ ڈاکٹرز نے اس کی بیماری کی تشخیص کی تو السر کا مرض سامنے آیا جو شدت اختیار کر گیا تھا۔ وحید کے اعصاب بھی کمزور ہو گئے تھے اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔ 1983ء میں اس کے معدے کا انتہائی خطرناک آپریشن ہوا



جس میں اس کے جسم کا ایک تہائی متاثرہ حصہ کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا۔ اس آپریشن کے دوران جب اس کے لیے خون کی فراہمی کا اشتہار اخبارات میں دیا گیا تو ہزاروں پرستار اسپتال میں جمع ہوئے جس سے دورِ زوال میں بھی وحید کے کریز کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود وحید کے ارادے متزلزل نہیں ہوئے تھے۔ وہ فلمی پردے پر واپسی کے لیے پرامید تھا اور اپنے دوستوں سے کہتا تھا کہ میں ایک بار پھر آؤں گا۔ میرا عروج آئے گا پھر دیکھوں گا کہ یہ لوگ مجھے کیسے نہیں لیتے مگر وحید کے ارادے اس وقت متزلزل ہو گئے جب 27 ستمبر 1983ء کو اس کی کار کو حادثہ ہوا جس میں اسے شدید چوٹیں تو نہیں آئیں مگر اس کے ماتھے پر گہرا زخم آیا' زخم تو بھر گیا پر اس کا نشان نہیں جا سکا۔ آنکھ کے قریب اور ماتھے پر آنے والے زخموں کے نشان نے وحید کو بے حد مایوس کر دیا۔ اس کا

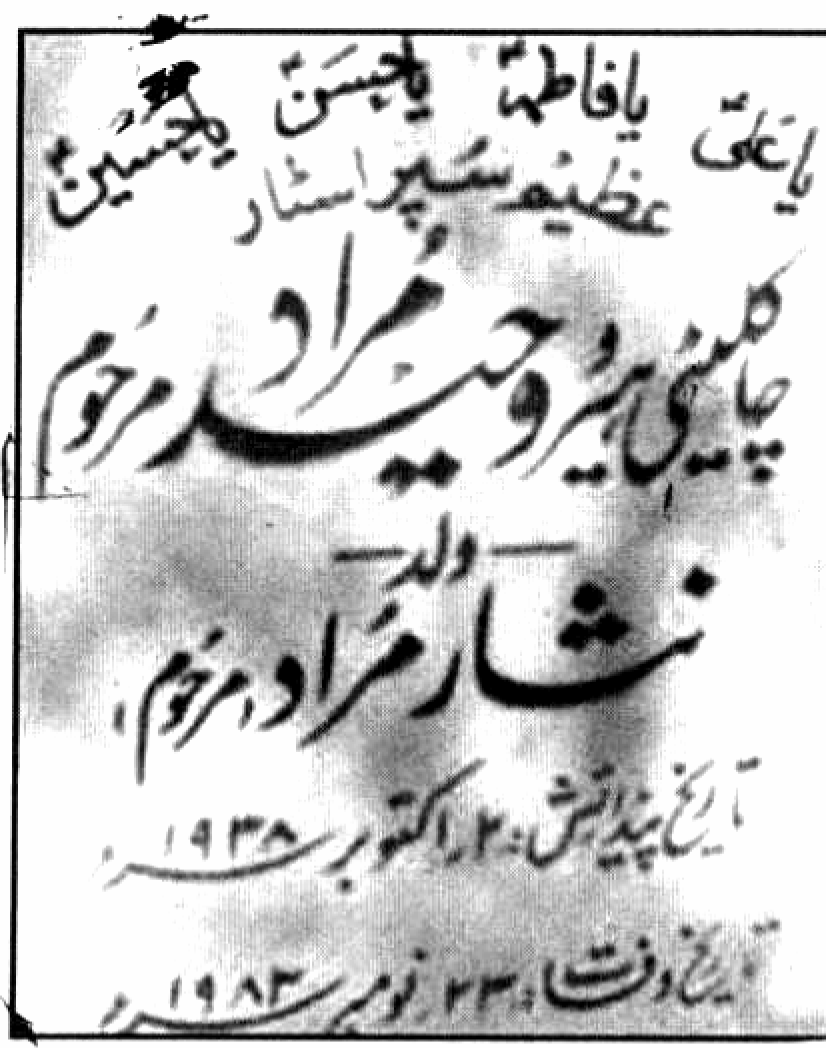
...ں سسٹم بری طرح متاثر ہو گیا اور کل تک چاکلیٹی ...ر لیڈی کلر ہیرو کہلانے والے کے لیے یہ بات ...قابل برداشت تھی کہ اس کے چہرے کے بدنما ...غوں کے باعث اب وہ عورتوں کا چہیتا نہیں رہے گا۔ ...ن نشانات کے خاتمے کے لیے اس نے پلاسٹک ...رجری کرانے کا سوچا۔ یہ سرجری جمعرات 24 نومبر کو ...کلفٹن کے مڈایسٹ ہسپتال میں ہونا تھی مگر اس کا موقع ...ں نہیں آیا کیونکہ قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

وحید نے اپنی زندگی کے آخری ایام اپنی منہ بولی ...ہن بیگم ممتاز کے گھر گزارے جو کرنل ایوب کی بیوی ...تھیں اور سابق اداکارہ انیتا ایوب کی ماں تھیں۔ مرنے ...سے دس دن قبل وحید نے اپنے بیٹے عادل کی سالگرہ ...ان ہی کے گھر میں منائی تھی۔ زندگی کے یہ آخری دن ...س کے لیے انتہائی اذیت ناک تھے۔ اس وقت وحید ...کے آس پاس کوئی اپنا نہیں تھا جو اس کی دلجوئی کرتا۔ ...ماں لاہور میں تھی۔ باپ کا ایک سال پہلے انتقال ہو چکا ...تھا۔ بیوی اور بیٹی امریکہ میں تھے۔

اپنی زندگی کی آخری شب وہ اپنی منہ بولی بہن ...سے دیر تک گپ شپ کرتا رہا تھا اور پھر سونے کے ...لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس رات بیڈ پر ...سونے سے پہلے اس نے عادت کے مطابق مطالعہ ...بھی کیا اور میوزک بھی سنا اور سونے کے لیے لیٹ ...گیا اور پھر...... ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ ڈاکٹرز کے ...مطابق اس کی موت رات دو سے ڈھائی بجے کے ...دوران ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی۔

اس کی موت کی خبر پرستاروں پر بجلی بن کر گری ...تھی۔ اس نے 'ارمان' میں زیبا کے لیے گانا گایا ...تھا کہ اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر...... مگر وہ خود اپنے ...چاہنے والوں کو روتا چھوڑ کر اکیلا اس منزل کی جانب ...چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ہائے......

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے



وحید مراد کی آخری آرام گاہ پر نصب کتبہ

وحید نے اپنے آخری دنوں میں کہا تھا کہ اس کا عروج دوبارہ آئے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا' اس کی موت کے بعد اسے دوبارہ عروج حاصل ہوا اور ایسا عروج ملا کہ آج اس کی موت کے تقریباً تیس برس ہونے والے ہیں مگر ہر سال اس کی برسی یوں منائی جاتی ہے جیسے کل کی بات ہو۔ فلمی اخبارات و جرائد وحید مراد کے حوالے سے ہر سال خصوصی ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ وہ فلمساز اور ہدایت کار جنہوں نے وحید کے آخری ایام میں اسے نظر انداز کر دیا تھا' وحید کی موت کے بعد انہوں نے وحید کی ہٹ فلمیں دوبارہ ریلیز کر کے وحید کے نام پر ایک بار پھر دولت کمائی۔ گویا وحید مر کر بھی ان کے لیے ایسا چیک ثابت ہوا تھا جسے کسی بھی وقت کہیں بھی کیش کرایا جا سکتا ہے۔

قدرت نے وحید مراد کو ہیرو کی شکل میں پیدا کیا تھا' اس نے ہیرو کی طرح زندگی گزاری اور ہیرو ہی کی حیثیت سے اس دارِ فانی سے رخصت ہوا اور آج تک لوگوں کے ذہنوں میں اس کا امیج ایک ہیرو کا ہی ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM
جی سہیلی

۲ خصوصی کہانیاں — اپنے موضوع اور خیال کے اعتبار سے منفرد اور مختلف سچی کہانیاں

امراؤ طارق

پسِ دیوار ہے گیا!

محمد مظہر نیازی کا ایقان

عمر کی اینٹ کوئی بھی نہیں سیدھی رکھی
گرنے والی ہے جو دیوار بنا بیٹھا ہوں

ایک بستی کی دیواروں کے پرے سانس لیتی بہت خصوصی کہانی



پیر جی صبح ہی بستی سے گردن جھکائے چل دیئے۔ نیا سماج گلی کے ہر موڑ پر ان کا منہ چڑا رہا تھا اور بستی کے لوگ حسب معمول مزے سے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے' سب کچھ پرسکون تھا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں سرکنڈوں کی دیواروں اور چٹائیوں کی چھت والی جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ یہ غیر قانونی جھونپڑیاں علاقے کے بدمعاشوں' سیاسی کارکنوں اور سپاہیوں کی مشترکہ کوششوں سے وجود میں آئی تھیں۔ نام نہاد سیاسی کارکن پلاٹ تجویز کرتے' بدمعاش پلاٹ کی قیمت وصول کرتے اور سپاہی چشم پوشی کا معاوضہ ہفتوں وصول کرتے رہتے اور جب جھونپڑی پرانی ہوجاتی تو ملکیت تسلیم کرلی جاتی۔ جب کبھی کوئی سرپھرا زمین خدا کی سمجھ کر بغیر بدمعاشوں کو معاوضہ دیئے جھونپڑی بنانے کی کوشش کرتا تو مکے بازی ہوتی' اکھاڑ پچھاڑ ہوتی اور کبھی کبھی چاقو چھریاں چل جاتیں تو پولیس کو دخل دینا پڑتا اور علاقے کے بدمعاش کے مشوروں پر پولیس والے اس باولے کو سمجھاتے کہ زمین خدا کی نہیں' سرکاری ہے۔ یہ جھونپڑیاں شہر سے باہر بنائی گئی تھیں جہاں سے خودرو جھاڑیوں اور کیکر کے درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ آس پاس کا میدان جھونپڑی میں رہنے والوں کی غلاظت سے اٹا ہوا تھا۔ صبح صبح اس بستی کے مرد اور عورتیں جھونپڑیوں سے نکل کر دو سمتوں میں تقسیم ہوجاتے' ایک طرف عورتیں چلی جاتیں اور دوسری طرف مرد...... اور اپنے اپنے علاقے کی اس تقسیم پر مرد اور عورتیں دونوں ہمیشہ پابندی سے عمل کرتے۔ ساری جھونپڑیاں چٹائیوں اور سرکنڈوں سے بنائی گئی تھیں اور ایک دوسرے کی دیوار ملانے کا سلسلہ تقریباً پانچ ہزار جھونپڑیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ دیواریں انسان کے طور پر تھیں ورنہ ان کے اطراف ہونے والی گفتگو اور حرکات میں اردگرد کی جھونپڑیوں کے تمام لوگ ذہنی طور پر برابر کے شریک ہوتے۔

میں جس جھونپڑی میں رہتا تھا' وہ ایک پتلی سی گلی کے موڑ پر واقع تھی جہاں ایک اور پتلی سی گلی آ کر مل گئی تھی اور یہاں ایک چھوٹا سا چوراہا بن گیا تھا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو قطع کرنے والی گلیاں شروع شروع میں اتنی چوڑی تھیں کہ میونسپل کارپوریشن کا پانی سپلائی کرنے والا بھاری بھر کم ٹرک ہفتہ میں ایک دوبار ان میں سے گزر جایا کرتا تھا لیکن جھونپڑیاں بڑھانے کی ہوس میں یہ گلیاں اتنی سمٹتی گئیں کہ اب ان میں کسی سواری کا داخل ہونا ناممکن تھا چنانچہ اب جھونپڑی کے رہنے والے مین روڈ پر میونسپلٹی کے اکلوتے نل پر بالٹیوں اور گھڑوں کی قطاریں لگا کر ایک دوسرے کو گالیاں دیا کرتے یا پھر پاکستان کی شہری سہولتوں کے فقدان پر تنقید کرتے ہوئے اپنے چھوڑے ہوئے شہروں سے موازنہ کرتے۔ میونسپل کارپوریشن کا پانی سپلائی کرنے والا ٹرک اب کیوں نہیں آتا' اس موضوع پر سب دم سادھ لیتے اور لمبی لمبی زبانیں اس طرح سکڑ کر منہ کے خول میں بند ہوجاتیں جیسے انہیں بولنا ہی نہ آتا ہو۔ اس چھوٹے سے چوراہے کے ایک کونے پر ایک چائے خانہ تھا جہاں سے ہر وقت جلے ہوئے دودھ اور کوئلوں کی بو آتی رہتی اور رات گئے تک لوگ لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے سیاست' فلم اور ہوٹل کے اندر سرکنڈوں کی دیواروں پر لگی ہوئی فلمی اداکاراؤں کی تصویروں کے حسن اور شباب پر گفتگو کرتے رہتے۔ اس چائے خانے کی افادیت اس وقت بڑھ جاتی جب کوئی مہمان آجاتا اور جھونپڑی کی حالت اس مہمان کی متحمل نہ ہوسکتی تو اسے باہر ہی باہر تواضع کر کے رخصت کردینے میں جو سکون ملتا' اس کا اندازہ مشکل ہے۔ دوسرے کونے پر مشرقی پنجاب سے آیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا ایک خاندان آباد تھا۔ اس جھونپڑی میں اتنے بڑے خاندان کا گزارہ بمشکل ہوتا تھا۔ دن میں جب مرد چلے جاتے تو اتنا زیادہ محسوس نہ ہوتا لیکن رات کو جگہ تنگ ہوجاتی۔ ہمیشہ جب گلی کی جانب کی سرکنڈوں کی دیوار ٹیڑھی ہوتی تو رات میں اسے دوبارہ سیدھا کیا جاتا اور دو چار انچ دیوار گلی کی طرف کھسک آتی اور مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ ایک روز اچانک اس جھونپڑی کی متحرک دیوار میری جھونپڑی کی نیم جان دیوار سے مل جائے گی اور گلی اچانک غائب ہوجائے گی۔ اس خاندان کے مرد بڑے کم گو اور خاموش طبیعت تھے اور انہیں بستی کے بہت کم لوگ جانتے تھے لیکن اس واحد عورت کو سب ہی جانتے تھے جو ہر سال کچھ دنوں کے لیے جھونپڑی میں روپوش ہوجاتی اور جب نمودار ہوتی تو اس کی گود میں ایک گلگوتھنا سا بچہ ریں ریں کرتا رہتا اور وہ جھونپڑی کی دیوار کے سہارے گلی کے موڑ پر بیٹھی ڈھیلے پائنچوں والی شلوار' گھٹنوں کے اوپر تک چڑھائے کھجا کھجا کر ران پر لکیریں بناتی رہتی اور پرچون کی دکان سے ملتانی کی ٹکیاں لے کر چباتی رہتی اور بے زاری سے ہر گزرنے والے کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ اگر کسی پڑوسی سے ٹھن جاتی تو خواہ مرد ہو یا عورت' اس کے بخیے ادھیڑ دیتی اور ایسی گالیاں فراٹے سے دیتی جن سے ماں' بہن اور بیٹی کا تذکرہ بانس کے ساتھ ضرور آتا اور ہر ایک کا کسی نہ کسی سے ناجائز تعلق ضرور تلاش کرلیتی۔ اس عورت سے ٹکر لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی لیکن اس سے لڑائی ہونے کی صورت میں یہ ضرور معلوم ہوجاتا تھا کہ محلے کی کس عورت کا کس مرد سے ناجائز تعلق ہے اور محلے کی شاید ہی کوئی عورت ہو جس کا کم از کم ایک مرد سے ناجائز تعلق نہ ہو یا کم از کم ہر لڑائی کے دوران وہ اسی طرح کے اعلانات کرتی رہتی۔ اس کے یہاں کبھی کبھی ایک سانولی سی طرح دار عورت تین چار سال کا بچہ لیے ہوئے آیا کرتی تھی جو قریب ہی کسی جھونپڑی میں رہتی تھی اور ہمیشہ سرخی پاؤڈر سے لیس رہتی۔ اس کی بستی کے ہر نوجوان سے بے تکلفی تھی اور اسے ہر شخص پر فقرہ چست کرنے کی عادت تھی لیکن آپس کی لڑائی کے دوران بھی اس کے بارے میں کسی طرح کی بات کبھی نہ سنائی دیتی' شاید اس کا ماضی صاف تھا یا کم از کم اس کے بارے میں اس منہ زور عورت کو کوئی علم نہ تھا۔

اس چوراہے کے تیسرے کونے پر ایک پرچون کی دکان تھی جہاں سے ملتانی کی ٹکیوں سے لے کر راشن تک خریدا جاسکتا تھا۔

اس دکان کا مالک ایک سنجیدہ اور باریش خوبصورت نوجوان تھا جو لین دین کا کھرا اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا لیکن کچھ نوجوان اسے اس لیے برا بھلا کہتے تھے کہ وہ جماعت اسلامی سے متاثر تھا اور اسے ملا کہہ کر تو سب ہی مخاطب کرتے تھے۔

میری جھونپڑی سے ملحق ایک ٹیلر ماسٹر اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا جو تقریباً روز ہی شام کو کام سے واپس آکر اپنی بیوی کو پیٹتا تھا۔ پہلے وہ انتہائی لجاجت سے شوہر کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی لیکن ٹیلر ماسٹر سور کی بچی سے شروع کرتا اور طمانچوں اور گھونسوں پر تان ٹوٹتی اور تقریباً ساری رات ہی مغلظات کا سلسلہ جاری رہتا۔ رات کے پچھلے پہر دونوں میں سرگوشیاں شروع ہوتیں اور دبے دبے قہقہے ابھرنے لگتے اور نئی صبح ٹیلر ماسٹر خوش و خرم کام پر جانے لگتا تو بیوی اسے فرمائشوں سے لاد دیتی۔ جب تک ماسٹر نے اپنی لڑکی کی شادی نہ کی تھی' بیٹی ماں باپ کے درمیان جلدی صلح صفائی کرا دیتی اور جلد ہی سرگوشیاں اور قہقہوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا لیکن شادی کے بعد نہ صرف بیوی پر اس کا غصہ شدید

ہوگیا تھا بلکہ بیٹی اور داماد کی بھی ماں بہنیں تولنے لگا تھا۔ ماسٹر کو شبہ تھا کہ اس کی بیوی اس کی عدم موجودگی میں ضرور کسی سے آنکھیں لڑاتی ہے حالانکہ اس کا شبہ بہت پرانا تھا مگر ماسٹر صرف اس کا تذکرہ ہی کر کے رہ جاتا تھا۔ ٹیلر ماسٹر کی بیوی ساری رات پٹنے کے باوجود ماسٹر کے جانے کے بعد پڑوسنوں سے اس طرح لہک لہک کر باتیں کرتی جیسے رات بڑے سکون سے گزری ہو۔ پڑوسنوں سے گفتگو کرنے کے لیے کسی طرح کے اہتمام یا کام میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہ تھی جو جہاں ہوتی' وہیں سے جس پڑوسن کو چاہتی۔ آواز دیتی اور بلائی جانے والی جہاں جو بھی کام کررہی ہوتی' وہیں سے جواب دیتی اور سلسلۂ کلام شروع ہوجاتا اور اگر کسی تیسری پڑوسن کو ضرورت محسوس ہوتی' وہ بھی وہیں سے گفتگو میں شریک ہوجاتی۔ کوئی بھی پڑوسی مرد ان عورتوں کو دیکھ کر نہ پہچان سکتا تھا لیکن اگر ان کی آواز سن لے تو بلاشبہ پہچان لیتا تھا۔ اس جھونپڑی کے رہنے والے ایک دوسرے کو شکلوں سے نہیں' آوازوں سے پہچان سکتے تھے۔

سامنے کی طرف اس منہ زور عورت کے برابر والی جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت اپنے دو جوان پوتوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا تعلق راجھستان کے کسی قصبہ سے تھا۔ اس کے پوتوں میں سے ایک کسی مل میں ملازم تھا اور دوسرا کسی کی گدھا گاڑی چلایا کرتا تھا اور اکثر رات میں سوتے سوتے ٹخ' ٹخ' ٹخ اور ہی ڑے کی آوازیں نکالتا رہتا تھا۔ رات میں دونوں بھائی فلموں کا تذکرہ کرتے' اپنی اپنی دیکھی ہوئی فلموں کی کہانیاں مع مکالموں کے سناتے' ان فلموں کے گانے بے سری آوازوں میں گاتے جاتے اور یہ سلسلہ رات گئے تک چلتا رہتا۔ کبھی کبھی پڑوسیوں کے شائقین فرمائشوں کا سلسلہ شروع کردیتے اور سونا ناممکن ہوجاتا۔

ساری بستی نچلے طبقے کے افراد پر مشتمل تھی اور ہر طرف سے بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتیں' انہیں اپنی پستی اور بدحالی کا قطعی کوئی احساس نہ تھا۔ یہ دن بھر اپنے کام پر رہتے' شام کو پھوس کے چائے خانوں میں کسیلی اور اونٹی ہوئی چائے پیتے اور اس جائداد کا رونا ضرور روتے جو وہ چھوڑ آئے تھے اور گویا یہ ان کا بہت بڑا احسان تھا جو وہ اس طرح رہ رہے تھے یا پھر فلمیں دیکھتے' بیویوں کو پیٹتے' کبوتر اڑاتے اور ٹاٹ کی پلیوں پر تاش کھیلتے۔ بستی پر ہر وقت ایک غم آلودسی دھند چھائی رہتی جس میں چائے خانوں کا دھواں اضافہ کرتا رہتا اور سڑے ہوئے کیچڑ کی بو ہر طرف پھیلتی رہتی۔

ایک شام جب میں دفتر سے فارغ ہوکر حسب معمول صدر کے چائے خانوں میں باری باری بیٹھ کر لوگوں سے ملاقاتیں کرتا ہوا کوئی نو بجے رات کو گھر واپس پہنچا۔ (کیونکہ اس سے قبل واپسی بسوں میں رش کی وجہ سے کسی طرح بھی ممکن نہ تھی۔) تو معلوم ہوا کہ میرے برابر والی جھونپڑی میں پیر جی آگئے تھے۔ اس طرح اب میری جھونپڑی ٹیلر ماسٹر اور پیر جی کی جھونپڑی کے بیچ میں تھی۔ پیر جی سے پہلے اس جھونپڑی میں ایک خاموش سی بیوہ رہا کرتی تھی جو کسی مل میں کام کرکے اپنا اور تین بیٹیوں کا پیٹ پالا کرتی تھی۔ پیر جی کی آمد نہ جانے کیوں مجھے سنسنی خیز سی لگی' غالباً اس وجہ سے کہ پیر جی سے منسوب ہمیشہ سنسنی خیز خبریں سننے میں یا پڑھنے میں آیا کرتی تھیں۔ کبھی روپیہ دوگنا کرنے کے بہانے ہزاروں روپے لے کر' کبھی کسی لڑکے کو لے کر' کبھی کسی کی بیوی اور زیورات لے کر فرار ہوتے ہی سنا یا پڑھا تھا۔

''اب کچھ ہوگا۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

لیکن جب میں نے نئے سرکنڈوں اور چٹائیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی چمک دیواروں اور چھتوں میں دیکھی جو پیر جی نے اپنی جھونپڑی مضبوط کرنے کے لیے لگائی تھی تو میرا شبہ جاتا رہا۔ یہ پیر جی فرار ہونے والے نہیں تھے یہ یہاں رہنے ہی کے لیے آئے تھے کیونکہ پیر جی نے اپنی جھونپڑی کی دیواریں اونچی اور مضبوط بنالی تھیں' اونچی اور مضبوط دیواریں جو تحفظ کا احساس دلاتی ہیں اور اعتماد بحال کرتی ہیں چاہے وہ سرکنڈوں ہی سے بنائی گئی ہوں۔ جب میں نے لیمپ روشن کیا تو میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا' یہ پیر جی تھے۔ میرے بلانے پر میرے ساتھ جھونپڑی میں آ گئے۔ پیر جی کی عمر کوئی پچپن' ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ دہرا جسم' بھرے بھرے چہرے پر سفید براق سی لانبی داڑھی' چوڑی پیشانی پر سجدے کا نمایاں نشان' چہرے پر تقدس کا نور اور اس پر سفید کُرتا' سفید شلوار اور تنکوں والی ٹوپی اور گلے میں پیلے رنگ کا ریشمی رومال' وہ مجموعی طور پر بڑے بارعب نظر آ رہے تھے۔

''میں آج ہی آپ کے پڑوس میں آیا ہوں' سوچا' آج ہی آپ سے مل لوں۔'' پیر جی بولے۔

''جی۔''

''آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں' میں نے بے وقت آپ کو زحمت دی؟''

''جی' جی نہیں' آپ تشریف رکھیں نا۔'' میں نے اکلوتی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

پیر جی کرسی پر بیٹھ گئے اور میں ٹین کے بکس پر کہ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا البتہ اگر ایک سے زیادہ ملنے والا ہوتو پھر باہر چائے خانے میں بہتر تواضع ہو سکتی تھی۔ پیر جی نے میرا انٹرویو لے لیا تو بولے۔

''میاں' اب یہاں پڑوسی ہی سب کچھ ہیں۔ مرنا جینا سب ساتھ ہی ساتھ ہے۔ ایک تو عزیز بچھڑ گئے' ان کا غم جو یہاں ملے' انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ اگر عزیز بچھڑ جائے تو دکھ ہوتا ہے لیکن آنکھیں پھیرے تو پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے' بس اب تو اگر قسمت سے اچھے پڑوسی مل جائیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔''

''میں تو واقعی خدا کا شکر گزار ہوں۔''

پیر جی ہنس دیئے۔

پیر جی نے بتایا کہ وہ اسی ہفتے ہندوستان سے آئے ہیں۔ وہاں سجادہ نشین تھے۔ چھوٹی سی جائیداد تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ترکِ سکونت غیر ضروری ہے۔ انہیں وہیں رہنا چاہیے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے جہاں اُن کے بزرگوں نے روایتیں قائم کی تھیں جہاں اُن کی جڑیں گہری اور مضبوط تھیں مگر فسادات کی وجہ سے انہیں بھی ترکِ سکونت قبول کرنی پڑی اور وہ پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے۔ اُن کی اکلوتی بیٹی بھی اُن کے ساتھ تھی اور اس جھونپڑی میں رہنا اپنی بیٹی کی وجہ سے نامناسب سمجھتے تھے۔ اس ماحول میں اُن کی بیٹی جس نے کبھی کسی غیر محرم کی صورت بھی نہ دیکھی تھی' کس طرح رہ سکے گی' یہ فکر اُن کو کھائے جا رہی تھی۔

''ہم مسلمان بڑے جذباتی ہیں۔'' پیر جی بولے۔ ''ہمیں آسانی سے جذباتی نعروں کے ذریعہ گمراہ کیا جا سکتا ہے' غالباً ہم پاکستان کے مالک بننے کے اہل نہیں تھے۔ ہم نے اپنی شیرازہ بندی بھی نہیں کی تھی۔ اپنے آپ کو ہم نے ابھی اس قابل نہیں بنایا تھا کہ اس نظام کو رائج کر سکیں جس کے نام پر ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ میں سیاسی مفکر نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے' ہمارے قائدین بھی مستقبل کے لیے پورے اخلاص سے وعدہ نہیں کر رہے تھے' اُن کے پاس جس نظام کے لیے تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے' وہ نظام وہ کس طرح رائج کر سکتے تھے مگر چند......''

پیر جی تھوڑی دیر خاموش بیٹھے لیمپ کی کانپتی ہوئی لَو دیکھتے رہے۔

''اگر تیز ہوا کا جھونکا آ گیا تو لیمپ گل ہونے کا خطرہ ہے۔ اچھا' خدا حافظ!''

پیر جی کے جانے کے بعد میرا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اُن پیروں میں سے نہیں ہیں جو فرار ہو جاتے ہیں۔ اُن کی بیٹی اُن کے ساتھ ہے۔ انہوں نے جھونپڑی کی دیواریں بلند کی ہیں اور نئی چٹائیوں سے ان دیواروں کو مضبوط بنایا ہے' غالباً نظریاتی طور پر کانگریسی ہیں یا پھر ان کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں ہے' جو کچھ انہوں نے جس طرح محسوس کیا ہے' اسی طرح کہہ دیا ہے۔

پھر مجھے پیر جی کی اُس بیٹی کا خیال آیا جس نے کسی نامحرم کی شکل تک نہ دیکھی تھی اور یہاں گلی کے موڑ پر حاملہ عورت ننگی ران کھجایا کرتی ہے' ٹیلر ماسٹر اپنی بیوی کو رات بھر مغلظات سناتا ہے' لڑائیوں میں عورتیں ایک دوسرے کے ناجائز تعلقات گناتی ہیں' عریاں فلمی گیت گائے جاتے ہیں۔ پیر جی کی بیٹی کس کس محاذ پر مقابلہ کرے گی؟

امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں کئی دنوں مسلسل بستی سے باہر رہنے کے بعد جب میں بستی میں داخل ہوا تو شام کا وقت تھا' جھکے ہوئے چھجے والے چائے خانے میں پیر جی کے اردگرد بستی کے بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرح کا درس جاری تھا۔ پیر جی لوگوں کو نیک بننے اور نیکی پھیلانے کی تلقین کر رہے تھے اور لوگ پیر جی کے گرد ہمہ تن گوش بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہمارا کام صرف یہ نہیں ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لیں' صبح صبح قرآن کی تلاوت کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں اسلام نافذ کرنا ہے۔ قرآن اس لیے ہے کہ ہم اس سے نظامِ مملکت سے لے کر روزمرہ کی نشست و برخاست میں ہدایت حاصل کریں۔ یہ تعویذ اور گنڈوں کے لیے نہیں' پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ہے۔ یہ ہمارا قانون ہے۔''

تقریباً سب ہی پیر جی کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی پیر جی بنچ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلو کہ مالکِ حقیقی کا بلاوا ہے۔''

سب لوگ پیر جی کے پیچھے پیچھے مسجد کی طرف چل دیئے۔ ایک دو چپ چاپ دوسری طرف گلیوں میں مڑ گئے۔ پیر جی مجھے دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''اتنے دنوں کہاں رہے؟''

''ذرا شہر میں رہ گیا تھا۔''

''یہاں تقریباً آس پاس کے سب ہی لوگوں سے ملاقات ہو گئی ہے۔ لوگ میری ٹوٹی پھوٹی باتیں توجہ سے سنتے ہیں۔ نمازیوں میں اضافہ ہوا ہے۔''

''یہ تو بڑی مبارک بات ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ ایک دن ضرور اس سرزمین پر خدا کی حکمرانی ہوگی۔ یہ جھوٹے بت ٹوٹ کر رہیں گے۔''

مسجد میں داخل ہوتے ہی پیر جی خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن صبح سویرے پیر جی چند نوجوانوں کے ساتھ محلے کے لوگوں کو فجر کی نماز کے لیے دروازے دروازے جا کر جگا رہے تھے۔ میری بھی آنکھ کھل گئی۔ ہر چند کہ مجھے سحر خیزی کی عادت نہ تھی لیکن پیر جی کے خیال سے میں بھی شریک ہو گیا۔ فجر کی نماز کے بعد پیر جی نمازیوں کے ساتھ مسجد کے صحن میں بیٹھ کر درسِ قرآن میں مصروف ہو گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ یہ سلسلہ جاری رہا پھر انہوں نے میرا تعارف دوسرے نمازیوں سے کرایا۔ مسجد سے نکل کر پیر جی میرے ساتھ ساتھ میری جھونپڑی میں آ گئے۔ جب ہم جھونپڑی میں داخل ہوئے تو پیر جی کی بیٹی تلاوتِ کلامِ پاک میں مشغول تھی۔ مجھے عجیب سا رُوحانی کیف محسوس ہوا۔ صبح کا وقت تھا'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تازہ ہواؤں کے نرم جھونکے ہولے ہولے چل رہے تھے اور ان جھونپڑیوں کے ماحول میں جہاں بازاری فلمی گانے اور گالیاں عام تھیں اور کان انہیں آوازوں سے اب تک آشنا تھے۔ پیر جی کی بیٹی کے مقدس ترنم نے فضا میں وجدانی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔

''میری بیٹی عابدہ ہے۔'' پیر جی میری خاموشی کو طویل ہوتا دیکھ کر بولے۔

''میں تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ہو سکتا ہے' کر رہا ہوں لیکن غربت' جہالت اور بے حسی نے میرا کام بے انتہا مشکل بنا دیا ہے۔ شریف بھی میرے ساتھ صبح لوگوں کو نماز کے لیے جگاتا ہے۔ اس نے فلمی گانے گانا بند کر دیا ہے۔''

''شریف کون؟''

''سامنے کی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ ہر رات بارہ بجے تک فلمی گانے گایا کرتا تھا۔''

''میں سمجھ گیا۔''

''دراصل میں مطمئن نہیں ہوں' میرے لحاظ سے یا کہنے سننے سے نماز میں شریک ہو جانا یا فلمی گانوں سے پرہیز کر لینا کافی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں احساس ہو کہ ان پر خدا کی طرف سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ان جھونپڑیوں پر چرس کی دوکانیں ہیں' جوئے کے اڈے' شراب فروخت ہوتی ہے لیکن ایک ایسی جگہ نہیں ہے جہاں لائبریری قائم ہو سکے' جہاں لوگ بیٹھ کر مطالعہ کریں۔ یہ لوگ میرے خیال سے نماز پڑھتے ہیں' انہیں خدا کا خوف ہونا چاہیے۔''

''میرا خیال ہے' سرِ دست اتنا ہی بہت ہے۔ انشاء اللہ' آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''حیرت کی بات یہ ہے کہ چرس فروشوں کو پولیس کچھ نہیں کہتی' جوئے کے اڈوں سے کسی کو نہیں پکڑا جاتا اور شراب فروشی کے کاروبار میں پولیس بھی شریک ہے اور کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ پھر پولیس کے وجود کا کیا فائدہ ہے؟''

''پولیس میں رپورٹ تو کی جا سکتی ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے' برائی کی قوتیں متحد ہیں اور نیکی منتشر ہے۔ نیکی کی قوتوں کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔''

عابدہ کی تلاوت ختم ہو چکی تھی۔ پیر جی بھی جا چکے تھے۔ نہ معلوم کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پیر جی کی کوششوں اور لوگوں کے تعاون کے باوجود کہیں کچھ نہ کچھ کمی ہے اور یہ جوش و خروش عارضی ہے' شاید یہ ایک آدمی یا چند آدمیوں کی کوششوں سے زیادہ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ برائیوں کی بیخ کنی کے لیے منظم کوشش کرے۔ یہ بڑی عجیب بات محسوس ہو رہی تھی کہ مملکت کی نگرانی میں چرس اور شراب فروخت ہو رہی ہو' جوئے کے اڈے چل رہے ہوں اور قحبہ خانے قائم ہوں اور ایک نحیف بوڑھا لوگوں کو مسجد کی طرف بلا رہا ہو۔ یہ ایک مضحکہ خیز مقابلہ تھا۔

عام طور سے یہ ہوتا کہ جب محلّہ میں عورتیں لڑنا شروع کرتیں اور تفصیل سے گالیاں شروع ہوتیں تو پیر جی' عابدہ سے اونچی آواز میں باتیں شروع کر دیتے یا بلند آواز سے کوئی مناجات شروع کر دیتے۔ اسی طرح جب کسی طرف کوئی عریاں فلمی گیت چھڑ جاتا تو پیر جی تلاوت شروع کر دیتے تا کہ اُن کی بیٹی عابدہ کے کانوں تک یہ آوازیں نہ پہنچ سکیں لیکن جھونپڑی کی نیچی دیواریں اور پیر جی کی بلند آواز سے پڑھی ہوئی مناجاتیں ان آوازوں کو نہ روک سکتی تھیں۔ ایک طرف پیر جی تلاوت کر رہے ہوتے اور دوسری طرف کوئی گا رہا ہوتا۔

جادوگرسیاں'
چھوڑ میری بہیاں
ہوگئی آدھی رات
اب گھر جانے دو

ایک شام پیر جی مجھے اور شریف کو لے کر بستی کا چکر لگانے کے لیے نکلے۔ شریف اب پابندی سے پیر جی کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ پیر جی بھی شریف کی بے انتہا تعریف کرتے رہتے تھے۔ ہم ایک تنگ گلی سے گزر رہے تھے' گلی میں جگہ جگہ گندہ پانی جمع تھا۔ سامنے نل پر پانی کے منتظر لوگ بالٹیوں اور گھڑوں کی قطاریں لگائے ہوئے کھڑے تھے۔ عورتیں بالٹیاں قطاروں میں لگاتے ہوئے ایک دوسرے کو فرفر گالیاں دیئے جا رہی تھیں۔ پاس ایک بہت خوبصورت بچہ دوسرے بچے سے لڑ رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی توتلی زبان سے گالیاں دے رہا تھا۔

''سالے' تیری ماں......'' (ایک بھرپور گالی......)

چھوٹا بچہ جس کے منہ سے گالیوں کے تلفظ صحیح ادا نہیں ہو رہے تھے' گالیاں بکتے ہوئے بڑا اجنبی سا لگ رہا تھا۔ پیر جی نے اُس بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ قریب ہی پرچون کی دکان سے بسکٹ دلا کر دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ بچہ سہما ہوا اُن کی ہر بات پر اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ جب ہم جھونپڑی واپس پہنچے تو پیر جی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اُس بچے کی توتلی زبان سے نکلی ہوئی گالیاں اسی انداز سے بار بار دہرا رہے تھے اور آنسوؤں سے ان کا چہرہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ اُس دن پیر جی مجھے بہت عظیم لیکن بہت ہی دکھی انسان نظر آئے۔ وہ گھنٹوں سسکیاں لیتے رہے۔ پیر جی رو رہے تھے' ملا رو رہا تھا' انسان رو رہا تھا' یہ کب تک اپنی بے بسی پر روتا رہے گا؟ میرے ذہن میں اسی طرح کے فضول سوالات کا تانتا بندھ گیا حتیٰ کہ شریف' پیر جی کے لیے پانی لے آیا اور پیر جی تھوڑی دیر بعد پھر نارمل نظر آنے لگے۔

پیر جی کسی کپڑے کی دکان پر ملازمت کرنے لگے تھے۔ میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے زیادہ تر بستی سے باہر رہنے لگا تھا۔ دو دو ہفتوں کے بعد چند لمحوں کے لیے بستی میں آتا تو پیر جی سے ملاقات بھی نہ ہو پاتی لیکن کسی نہ کسی سے پیر جی کے مشن کے بارے میں حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ اب وہ رات میں بچوں کو مفت تعلیم بھی دینے لگے تھے اور لائبریری اور تعلیمِ بالغان کی جگہ کے لیے مناسب جھونپڑی خریدنے کے لیے چندہ بھی جمع کر رہے تھے لیکن شراب اور چرس بھی فروخت ہو رہی تھی' جوا خانہ بھی جاری تھا' فلمی گانوں کی گونج بھی تھی اور گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی عورت رانوں تک شلوار چڑھائے اب بھی بیٹھی گزرنے والوں کو بے زاری سے دیکھتے ہوئے کھجایا کرتی تھی۔

سہہ پہر کا وقت تھا' میں کئی ہفتوں کے بعد بستی آیا تھا اور جھونپڑی میں بیٹھا شیو کر رہا تھا۔ پیر جی کی جھونپڑی کی دیوار ٹیڑھی ہو چلی تھی اور سرکنڈوں پر سیاہی دوڑ گئی تھی۔ پیر جی غالباً ابھی دکان سے واپس نہ آئے تھے۔ اچانک میرے کانوں میں پہلے ہولے ہولے گنگنانے کی آواز آئی پھر آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ میرے ہاتھ میں ریزر لرز کر رہ گیا۔ سامنے رکھے ہوئے آئینے میں مجھے اپنی شکل اجنبی نظر آنے لگی۔ پیر جی کی جھونپڑی سے عابدہ کے گانے کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ عابدہ کی خوش الحان تلاوت میں ہمیشہ سنا کرتا تھا۔ آج وہ فلمی گیت بڑی بے پروائی سے گا رہی تھی۔

اب گھر جانے دو
ہوگئی آدھی رات
اب گھر جانے دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھکا پھکا گجرا
ٹوٹا ٹوٹا گجرا

کہہ دے گا ساری بات
اب گھر جانے دو

میرے ہاتھ میں ریزر لرزتا رہا۔ آئینے کا اجنبی چہرہ مجھے گھورتا رہا اور عابدہ گاتی رہی' اسے پورا فلمی گیت ازبر تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے پیر جی کا چہرہ گھومنے لگا اور اُن کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

''مجھے یقین ہے کہ ایک دن ضرور اِس زمین پر خدا کی حکمرانی ہوگی۔''

''برائی کی قوتیں متحد ہیں اور نیکی منتشر۔''

''نیکی کی قوت کو متحد اور منظّم کرنے کی ضرورت ہے۔''

میرا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ زہر پھیل چکا تھا۔ پیر جی جس دیانت داری' تندہی اور لگن سے بستی کے لوگوں کی بھلائی کے لیے کوشش کر رہے تھے' اُس کا اثر مجھے کہیں محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن بستی کے ماحول کا زہر پیر جی کے خون میں سائرس کی طرح داخل ہو گیا تھا۔

بارش ہو جائے تو بستی والوں کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ اُس رات بارش ہوئی تھی اور بستی کی ہر شے درہم برہم سی لگ رہی تھی۔ لوگ اپنا اپنا سامان سمیٹے بھیگے ہوئے چوہوں کی طرح جھونپڑیوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہر شے سے سڑاندسی اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی' راستوں میں کیچڑ اور پانی کی وجہ سے جھونپڑی سے باہر نکلنا تقریباً ناممکن ہو رہا تھا۔ میں جب بستی لوٹا تو بارش بند ہو چکی تھی۔ جھکے ہوئے چھجوں والے چائے خانے بند تھے۔ جھونپڑیوں کے اندر جلنے والے لیمپ مدہم مدہم سے لگ رہے تھے۔ میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ جھونپڑی کے صحن میں پیر جی ٹہل رہے تھے۔ اندھیرا ہونے کے باوجود اُن کا سفید لانبا کُرتا' سفید شلوار اور تنکوں والی ٹوپی اُن کو پہچاننے کے لیے کافی تھی۔ میں نے لیمپ روشن کیا اور روشنی میں پیر جی بھی صحن سے جھونپڑی کے اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پیر جی کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور داڑھی کے بال رسی کی طرح بٹے ہوئے تھے' چہرہ سُتا ہوا تھا اور کاغذ کی طرح سفید تھا' اُن کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

''تم نے سنا......؟'' پیر جی آہستہ سے بولے۔

''جی......؟''

''تم نے کچھ سنا؟''

میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اگر بولا تو کچھ ٹوٹ جائے گا۔

''تم نہیں جانتے' تم بھی نہیں جانتے۔'' انہوں نے میرا بازو پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

''میں لٹ گیا اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ میری پھولوں جیسی معصوم بچی کہیں چلی گئی۔''

میں سن سا ہو گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہو بھی چکا' شریف' سامنے والی بڑھیا کا پوتا جس نے فلمی گانے الاپنا بند کر دیا تھا جو ہر وقت ہر کام میں میرا ساتھ دیتا تھا' میری بیٹی عابدہ کو بھگا لے گیا ہے۔ سنتے ہو' وہ چلی گئی۔ ساری بستی والے میرا مذاق اڑاتے ہیں' مجھے دیکھ کر آنکھیں مٹکاتے' ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں' مجھ پر انگلیاں اٹھاتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ غالباً تم بھی میری مدد نہیں کر سکتے' میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

پیر جی مجھے حیران چھوڑ کر میری جھونپڑی سے باہر نکل گئے اور اندھیروں میں گم ہو گئے۔

میں نے پیر جی کو پھر کبھی نہ دیکھا۔

WATCH EVERY Fri-Sat AT 8:00PM انوکھی

مینا تاج

ماضی کے سائے

سعدیہ حریم کا خیال

جو کم نظر ہیں انہیں کیا دکھائی دیتا ہے
کہ آفتاب بھی دھندلا دکھائی دیتا ہے

قیام پاکستان سے جڑی، ایک چشم کشا نہایت خاص تحریر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سرمد، تم اپنا دماغ درست کرلو ورنہ خواہ مخواہ چچا جان کو زحمت کرنا پڑے گی۔"

"اس میں دماغ کی خرابی والی کون سی بات ہے، میں نے تمہارے تھیسز کے سلسلے میں مدد کی، اب تم میری مدد کرو۔"

"کیا مطلب؟ مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تم میرے اتنے سے کام کے عوض اتنی بڑی قیمت وصول کرنے کی بات کرو گے تو ہرگز تمہاری مدد نہ لیتی۔"

"پلیز زرمین، سمجھنے کی کوشش کرو، ابھی میرا یہ کام کردو، بعد میں گھر والوں کو کنوینس کرلوں گا۔ اگر تم کسی کو پسند کروگی تو وعدہ رہا، میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"نہ بابا، بخشو، آئندہ میری توبہ جو تم سے کسی قسم کی مدد لی۔ ایک بات بتاؤ، تم لڑکے اتنے عقل مند بنتے ہو مگر جہاں کسی لڑکی نے ہنس کر بات کیا کرلی، ساری عقل مندی، بے وقوفی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔"

"تم سے جو کام کہا ہے، وہ کرو، فالتو بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اے مسٹر، فالتو بکواس میں نہیں، آپ کررہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہم لوگوں کا گھرانہ ماڈرن ہونے کے باوجود پرانی قدروں اور روایتوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہمارے یہاں رشتہ جوڑتے وقت خاندان کی چھان بین میں تمام تر توانائی صرف کردی جاتی ہے، بھلے سے برابری کا بنک بیلنس ہو یا نہ ہو، تعلیم بھی واجبی چل جاتی ہے مگر خاندان کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاتا۔"

"تم اتنے دنوں سے وہاں جارہی ہو، تمہیں وہ لوگ کیا غیر خاندانی نظر آئے؟"

"بھئی، کیا حماقت ہے، میں وہاں اپنے کام کی غرض سے جارہی تھی، کوئی خاندان جوڑنے نہیں جو باریک بینی سے کام لیتی۔ بہرحال تمہاری خاطر میں چلی تو جاؤں گی مگر کوئی جھوٹا آسرا ہرگز نہیں دوں گی کیونکہ یہ خالصتاً بڑوں کا معاملہ ہے۔ اب جاؤ، کل میرا انٹرویو ہے، اس کی تیاری کرنی ہے۔"

وہ دل ہی دل میں اس دن کو کوسنے لگی جب سرمد کے بچے سے مدد لینا پڑی تھی جس کے عوض اب ایک نئی مصیبت کھڑی تھی اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا۔ سرمد سے مدد اسے ہمیشہ بھاری پڑتی تھی۔ بچپن میں اکثر "ڈول ہاؤس" بنانے میں مدد کے بعد وہ اپنا ہوم ورک کرواتا، سہیلیوں کے گھر لے جانے کے بدلے وہ اس کی پاکٹ منی کا آدھا حصہ لے اڑتا جس سے گھر والے بے خبر رہتے، زیادہ اذیت تو تب ہوتی جب آدھی رات کو سیل فون پر صدر دروازہ کھولنے کا کہتا مگر اس بار تو اس نے حد ہی کردی یعنی......

•......•......•

کراچی یونیورسٹی کے سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ میں خاصی گہما گہمی تھی۔ ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین قزلباش سومرو کلاس میں موجود تھے۔ طلباء اپنے اپنے ٹاپک ریسرچ گائیڈ کو لکھوا رہے تھے۔

"سر، میں ناجائز تجاوزات پر قبضے پر تھیسز لکھنا چاہتا ہوں۔"

"ندیم، بات صرف ٹاپک تک محدود نہیں رہنی چاہیے، مکمل ڈیٹا اور اس کا حل بھی موجود ہونا چاہیے۔"

"زرمین، آپ یہ ٹاپک کیوں لے رہی ہیں؟" ریسرچ گائیڈ مس ثوبیہ نے پوچھا۔

"میم، میں لیڈی ہوم لیبر کے مسائل سامنے لانا چاہتی ہوں کیونکہ مجھ سے پہلے کے لوگوں نے بھی اس پر کام کیا ہے مگر......"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ کو معلوم ہے، اس کے لیے آپ کو ان کے علاقے میں جانا ہوگا اور پھر یہ ایک دن کی بات نہیں، آپ کو جب تک پوری

معلومات حاصل نہیں ہوجاتیں، اس وقت تک جانا ہوگا۔ کیا آپ کے گھر والے اس کی اجازت دے دیں گے؟ اس سے بہتر ہے کہ آپ اپنے علاقے کے کسی مسئلے کو لے کر ریسرچ مکمل کرلیتیں اور دشواریوں سے بچ جاتیں۔ بعد میں پریشان ہوکر اکثر اسٹوڈنٹس ٹاپک چینج کرواتی ہیں۔"

"میم آپ فکر نہ کریں، میں یہ ریسرچ ٹائم پر مکمل کرلوں گی۔"

•......•......•

"پھوپی جان، آج کل آپ کی وہ درزن نظر نہیں آرہی؟"

"خیر تو ہے، کیا تمہیں بھی کوئی لباس سلوانا ہے؟ کہو تو فون کرکے بلوالوں۔ یہیں بیٹھ کر ایک دن میں سوٹ سی دے گی۔ موئے، تمہارے اس درزی سے بہتر ہی سے دے گی جس کے سونخرے اٹھاؤ پھر وقت پر کام بھی نہیں دیتا، اوپر سے سلائی اتنی لیتا ہے کہ ایک ہفتے کا راشن آجائے۔"

"پھوپی جان، مجھے اس کے گھر جانا ہے۔"

"اے ہے، کہہ تو رہی ہوں، گھر پر بلوالوں گی پھر اس کے گھر جانے کی کیا آفت آن پڑی۔"

"بھئی، مجھے کپڑے نہیں سلوانے، اس کے علاقے کی عورتوں کے مسائل کے بارے میں لکھنا ہے جو گھر بیٹھے روزی کمارہی ہیں۔"

"کیوں لکھنا ہے؟ اور تم کیا کروگی ان کے مسائل جان کر؟"

"افوہ بھئی پھوپھی جان! یہ میری پڑھائی کا حصہ ہے اور پھر ان مسائل کو حکومت کے سامنے لایا جاسکتا ہے۔"

"زری، تم کیا سمجھتی ہو، کیا حکومت اندھی ہے جو انہیں نظر نہیں آرہا یا بہری ہے جو ان کی بپتا سنائی نہیں دیتی؟ بس سب اپنی اپنی قسمت کا لکھا جھیل رہے ہیں۔"

"امی......! پلیز، آپ ہی پھوپھی جان کو سمجھائیں۔"

"زرمین، تم خود سوچو شرفن درزن لائنز ایریا میں رہتی ہے اور آئے دن وہ علاقہ کسی نہ کسی تماشے کے حوالے سے اخبارات کی سرخی بنا جگہ گھیرتا ہے۔ ایسے متاثرہ علاقے میں تمہیں بھیجنے کا رسک میں تو نہیں لے سکتی۔"

"امی! آخر اس علاقے کے مکین بھی تو وہاں رہتے ہیں، کیا انہیں کوئی خطرہ نہیں؟"

"وہ سب اس ماحول کے عادی ہوچکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر چاقو اور پستول نکالنا ان کا پرانا وتیرہ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی، میں کہیں نہیں جارہی۔"

"ارے آپ لوگ خواہ مخواہ پریشان ہوجاتے ہیں، بھئی، سرمد ہے نا، وہ ساتھ چلا جائے گا، زرمین کا کام بھی ہوجائے گا اور ہم لوگ بھی مطمئن رہیں گے سرمد کے ساتھ ہونے سے۔" صلح جو چچی ہمیشہ زرمین کا ساتھ دینے میں پہل کرتی تھیں۔

"تھینک یو چچی، پھوپھی جان، اب تو کوئی پریشانی نہیں آپ کو، لائیں شرفن کا ایڈریس دیں۔"

•......•......•

"بھئی، مجھے کتنی رکعت کا ثواب حاصل ہونے والا ہے تمہارا ریسرچ مکمل کروانے میں؟ میں کیوں جاؤں؟ تم جتنا پڑھ لکھ ڈالو کرنا وہی ہانڈی چولہا اور اپنے میاں جی کی ناز برداریاں اٹھانا ہے۔"

"پلیز سرمد، تنگ مت کرو، تھوڑے دنوں کی بات ہے، میں جلد اپنا کام مکمل کرلوں گی۔ آج کل تو تم فارغ بھی ہو پھر کبھی کوئی کام مت کرنا اور ویسے بھی یہ میری نہیں، چچی جان کی مرضی ہے کہ تم میرے ساتھ جاؤ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

٭......٭......٭......٭

''گاڑی کیوں روک دی؟''

''محترمہ' آگے گلیاں تنگ ہیں' بقیہ سفر پیدل ہی طے کرو اور سنو' ایک گھنٹے سے زیادہ تمہارے ساتھ نہیں رہنے والا' مجھے اپنے بھی کام ہیں۔ شاکر کے ساتھ جاب کے سلسلے میں جانا ہے۔''

پریڈی روڈ کے دوسری جانب لائنز ایریا کو جاتی ہوئی سڑک جس کے دونوں اطراف کچے پکے مکانات کی قطاریں تھیں جبکہ ہر دو یا تین گھروں کے بعد چھوٹی موٹی دکانیں کھلی تھیں جو کہ گھر کے ہی ایک کمرے کو دکان کی شکل دے کر بنائی گئی تھیں جو کہ چائے پتی کے ساشے' رنگ برنگی سستی ٹافیوں' ڈٹرجنٹ پاؤڈر کے ساشے اور ایسی ہی سستی اشیاء سے سجائی گئی تھی' صرف بڑے رقبے پر امام بارگاہ کی عمارت تھی جبکہ سامنے تمام گھر نہایت ادنیٰ معلوم پڑتے تھے۔

گلیوں میں مختلف عمروں کے بچے لٹو' کنچے اور مختلف کھیل میں منہمک تھے۔ نوجوان ٹولیوں کی شکل میں سگریٹ پیتے' پان کھاتے' آتے جاتے لوگوں کا ایکسرے نکالنے میں مشغول تھے۔ بوڑھے کسی پان کے کھوکھے یا سبزی کی دکان پر بیٹھے فضول باتوں میں الجھتے نظر آرہے تھے۔ کچھ لڑکیاں بالیاں ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے شناسا چہرے کو دیکھ کر مسکراہٹ کا پیغام دے جاتیں جن کا خیر مقدم اگلے کئی گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر کیا جاتا۔ ڈبو' کیفے جگہ جگہ قائم تھے جو کہ یہاں کے قومی کھیل کی صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔

آدھے گھنٹے کی تگ و دو کے بعد اسے کوڑے خانے کے عقب میں شرفن کا گھر بھی مل گیا۔

ٹین کے کنستر سے بنا ہوا دروازہ جس کے اطراف لکڑی کا فریم بنا ہوا تھا' دیوار رنگ و روغن سے ناآشنا۔

''ارے' زرمین بی بی! اندر آئیں' بڑی بیگم صاحبہ نے بتایا تھا۔ آپ کو کچھ کام ہے' لوگوں سے ملنا ہے۔ میں آپ کو ایک دو لوگوں سے ملوا دوں گی جو گھروں میں پیکنگ کا کام کرتی ہیں۔ سلائی کڑھائی کا کام بھی کرتی ہیں۔''

٭......٭......٭......٭

''یہ چمن خالہ ہیں۔ یہ ٹافیاں' چپس وغیرہ پیک کرتی ہیں۔ آپ ان سے باتیں کریں جب تک میں گھر کا کام نبٹا آتی ہوں۔''

گہری سانولی رنگت والی چمن خالہ ناک میں بڑی سی سرخ نگ والی لونگ سجائے' قدرے بھاری جسم پر شوخ رنگوں والے پرنٹ کی قمیص پہنے' ہاتھوں میں پھنسی بے تحاشہ چوڑیاں دہائی دیتی نظر آرہی تھیں۔

''تم اکیلی آئی ہو؟''

''نہیں' میرا کزن بھی آیا ہے۔ باہر گلی کے کونے پر کھڑا ہے۔''

''ارے بھئی' اندر لے آؤ' باہر کیوں کھڑا کیا ہے؟''

''نہیں' کوئی بات نہیں' اچھا نہیں لگتا کہ آپ کے گھر......''

''اچھے برے کی بات ہی نہیں' ہم کون سا پردہ کرتے ہیں پھر میرے بیٹے کے دوست' میری بیٹی کی سہیلیوں کے بھائی بھی تو آتے رہتے ہیں۔ سب کی خالہ جو ٹھہری' چلو جاؤ' بلالاؤ۔''

چمن خالہ کے اصرار کے آگے سرمد کو اندر آتے بنی۔

چمن خالہ کا ایک ہی کمرا تھا جس میں دری بچھی تھی' اس پر پھول دار چادر تھی' کمرے کی چھت کے آدھے حصے پر مچان بنا ہوا تھا جس پر صندوق رکھے تھے۔ مچان کے ایک جانب ایک سیڑھی لگی تھی جو مچان پر چڑھنے کے کام آتی تھی۔

دیوار پر ایک آئینہ لگا تھا اور ساتھ میں لکڑی ٹھونک کر شیلف سا بنایا گیا تھا جس پر کریم پاؤڈر اور دو تین سستی لپ اسٹک سجی ہوئی تھیں۔ ایک گوشے میں ٹیلی وژن رکھا تھا جس کے اوپر انڈین اداکار کی تصویر فریم کر کے لگائی گئی تھی۔ سرمد ایک کونے میں بیٹھ کر سیل فون پر گیم کھیلنے میں مشغول ہو گیا۔ زرمین' چمن خالہ کے مختصر سے باورچی خانے کی چوکھٹ پر بیٹھی انٹرویو لے رہی تھی۔

''خالہ! شبنم کہاں ہے؟'' اچانک باورچی خانے کی کھڑکی سے پڑوسن لڑکی کا چہرہ نمودار ہوا۔

''وہ سلمیٰ کے ساتھ گئی ہے تانگہ اسٹینڈ تک اپنا دوپٹہ رنگوانے۔'' چمن خالہ نے روٹیاں پکاتے ہوئے جواب دیا۔

''توبہ ہے' بڑی گرمی تھی آج۔'' گھر میں داخل ہوتی بڑبڑاتی لڑکی اجنبی لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''اے لو' شبنم آگئی۔ شبو' یہ زرمین ہے' شرفن نے جن کے بارے میں بتایا تھا۔''

''اچھا' اچھا' تو یہ ہیں وہ جو ہماری غریبی کا پوسٹ مارٹم کرنے آئے ہیں۔'' شبنم کا طنزیہ جملہ زرمین کو شرمندہ کر گیا۔

''چلو زرمین' اب چلنا چاہیے' مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' زرمین نے شبنم کا جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ سوچے ہی تھے کہ سرمد کی آواز نے جہاں اس کے الفاظ روکے تھے' وہیں شبنم کی نظریں بھی آواز کی سمت اٹھیں۔

فیروزی پھول دار لان کے سوٹ میں کھڑی دبلی پتلی لڑکی آنکھوں میں کاجل کی کئی تہہ جمائے' ہاتھوں میں اپنی ماں کی طرح خوب چوڑیاں ٹھونسی ہوئی تھیں۔ وہ یک ٹک سرمد کو تکے جا رہی تھی۔

''اچھا خالہ! آپ کا بہت بہت شکریہ' اب ہم چلتے ہیں۔'' زرمین' سرمد کے ساتھ روڈ پر نکل آئی۔

٭......٭......٭......٭

''سلام! شرفن باجی......!''

''آؤ شبنم' بیٹھو۔''

''آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آئیں؟'' شبنم نے شرفن کے ساتھ بیٹھی زرمین کو مخاطب کیا۔ ''میری کوئی بات بری لگی ہو تو بھئی' مجھے معاف کر دیں۔ دراصل اس روز گرمی زیادہ تھی اس لیے میرا مزاج بھی گرم ہو گیا تھا اور آپ سے غلط رویہ......''

''ارے نہیں' کوئی بات نہیں اور میں ناراض ہرگز نہیں ہوں' مجھے تو بس اپنا تھوڑا سا کام کرنا تھا' سو وہ میں یہاں آنے والی عورتوں سے بات چیت کر کے مکمل کر لوں گی۔''

''ہرگز نہیں' آپ کو میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا ورنہ میں سمجھوں گی' آپ اب تک ناراض ہیں۔''

''اگر وہ نہیں جانا چاہتیں تو کیوں مجبور کر رہی ہو؟''

''تم تو چپکی بیٹھی رہو شرفن باجی' میں انہیں اپنی سہیلیوں سے بھی ملوا دوں گی تاکہ یہ اپنا کام کر سکیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے' میں چلتی ہوں۔'' زرمین نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

گلی کے کونے پر پرانی ٹنکیوں کی مرمت کی دکان سے گزر کر چمن خالہ کا گھر آتا تھا۔ دکان میں جا بجا پرانی لوہے کی ٹنکیوں اور کنستر کے انبار لگے تھے جو ٹنکیوں کی پیوند کاری کے کام آتے تھے۔ دکان میں کام کرتا بوڑھا شخص بھی کسی پرانی بوسیدہ ٹنکی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا زنگ زدہ وجود مگر تیزی سے مرمت کرتے ہاتھ نئی ٹونٹی کی مانند لگ رہے تھے۔ وہ یوں کام کر رہا تھا جیسے کچھ دن اور قابل استعمال بننے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کوشش میں مصروف ہو۔

''اری شبو' کہاں جارہی ہے؟ سورج سر پر آن گیا ہے' تیری ماں کو اب تک ہوش نہ آیا روٹی بھجوانے کا۔''

''جی ابا! ابھی بھجواتی ہوں گھر جا کے۔'' کہتی ہوئی شبنم آگے بڑھ گئی۔

''سنو' آپ اکیلی ہی چلوگی میرے ساتھ؟''

''ہاں تو اور کس کو لینا ہے۔''

''بھئی' اس دن جو لڑکا ساتھ آیا تھا' وہ نہیں آیا کیا؟''

''اچھا' وہ...... وہ سامنے کھڑا ہے۔''

''اسے بھی ساتھ لے لو۔''

''ارے نہیں' آج اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا' وہ اندر نہیں جائے گا۔''

''کیسے نہیں آئے گا گھر میں' میں اس سے بات کرتی ہوں۔''

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے دو نئے چہروں کا سامنا کرنا پڑا۔

''آؤ' آؤ زرمین جی' اور بیٹا' تم بھی آؤ۔'' سرمد کو مخاطب کرتے ہوئے خالہ نے کہا۔

''یہ میری بڑی بیٹی راحت ہے' دو گلی چھوڑ کر اس کا گھر ہے اور یہ میرا لڑکا جمال ہے۔'' دونوں کا حال حلیہ چمن خالہ اور شبنم کے قریبی رشتے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ چمن خالہ اپنے آگے رکھی کھلی ٹافیوں کو رنگ برنگی پنیوں سے لپیٹ رہی تھیں جبکہ راحت ان کی مدد کے ساتھ اپنا منہ بھی میٹھا کیے جارہی تھی۔

''اے اماں......! تم نے ابا کو کھانا نہیں بھجوایا' ابھی آتے وقت مجھے ٹوک رہے تھے۔''

''ہنڈیا تو کب کی پکی رکھی ہے' جا راحت' کھانا نکال دے' جمال دے آئے گا۔''

زرمین' خالہ اور راحت کے پاس بیٹھی مزید معلومات حاصل کرنے میں مشغول تھی جبکہ شبنم مسلسل کسی نہ کسی بہانے سرمد کے گرد منڈلا رہی تھی۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ سرمد کا سیل فون شبنم کے ہاتھوں میں تھا اور سرمد اسے آپریٹ کرنا سکھا رہا تھا۔

•......•......•......•

''یہ کیا بھئی' گاڑی کیوں روک دی؟''

''زرمین' کچھ پھل اور بسکٹ وغیرہ لے لیتے ہیں۔ میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ چمن خالہ کے گھر ہی کھالوں گا۔''

''تم تو پھل شوق سے نہیں کھاتے پھر آج کیسے؟''

''پھل اپنے لیے نہیں' خالہ کے گھر کے لیے اور بسکٹ' پیسٹری میں کھاؤں گا۔ تھوڑا ان لوگوں کے لیے بھی لے لیتے ہیں۔ دیکھو' ہم اتنی دفعہ جا چکے ہیں' یہ خیال تو تمہیں آنا چاہیے تھا' غریب لوگ ہیں' کچھ نہ کچھ تو لے جانا چاہیے۔''

''ارے واہ' تم تو بڑے سمجھدار ہو گئے ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔''

•......•......•......•

''ارے بیٹا' اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' پھلوں کا شاپر ہاتھ میں لیتے ہوئے چمن خالہ نے کہا تھا۔ ''چلو زرمین' تمہیں میں پڑوس کے لوگوں سے ملوادوں۔''

''ٹھیک ہے سرمد' تم جاؤ' ایک گھنٹے بعد آ کر لے جانا مجھے۔''

''اے ہے...... سرمد کو کیوں بھیج رہی ہو؟ بے چارہ بیٹھا رہے گا' اتنی گرمی میں آنے جانے کی کیا تک بنتی ہے؟''

''ہاں' ہاں' تم ہو آؤ' میں یہیں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔''

''سلام چمن خالہ......!'' دروازے کے پٹ سے جھانکتا چہرہ ابھرا۔ ''یہ لو خالہ! میں حیدرآباد گیا تھا' تمہارے اور شبنم کے لیے چوڑیاں لایا ہوں' ساتھ میں ربڑی بھی۔''

''شکریہ بیٹا......! آؤ بیٹھو۔''

''نہیں' ایک چکر پہلے علاقے کا لگا آؤں پھر آتا ہوں' تم چائے بنا کر رکھو۔''

''بڑا اچھا لڑکا ہے' جمال کا دوست ہے۔'' زرمین کو بتاتے ہوئے خالہ اسے پڑوسن کے گھر لے گئیں جبکہ سرمد' خالہ کے گھر رک گیا تھا اور پھر ایسا اکثر ہونے لگا۔ خالہ' زرمین کو لے کر محلے کے گھروں میں چلی جاتیں جبکہ سرمد اُن کے گھر پر رک جاتا۔

•......•......•......•

''سوری سرمد' تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ چلو......''

''ارے' تم کہیں جارہی ہو؟'' اچانک زرمین کی نظر شبنم پر پڑی جو گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس' فل میک اپ کیے کلائیوں تک بھری نیلی چوڑیاں پہنے تیار کھڑی تھی۔

''وہ...... دراصل زرمین......! شبنم نے آج تک پیزا نہیں کھایا...... اس لیے میں نے سوچا' ہم اسے Pizza Hut لے چلتے ہیں۔''

•......•......•......•

''ارے' کون ہے بھئی؟'' دروازے کی اوٹ سے اجنبی چہرے کو دیکھ کر زرمین چونکی۔

''سوری' چمن خالہ گھر پر ہیں؟''

''نہیں' چمن' شبو سب لوگ کسی کی میت پر گئے ہیں۔ بتاؤ' کیا کام ہے؟''

''میں زرمین ہوں' کتنی دیر میں وہ لوگ آئیں گی؟''

''اے لو' مجھے کیا پتا' ہو سکتا ہے' جلدی آجائیں یا پھر شام ہو جائے۔''

''زرمین' چھوڑو' تم کل آجانا۔'' سرمد نے مداخلت کی۔

''اگر تم انتظار کرنا چاہو تو کرسکتی ہو۔ چمن بتا رہی تھی' کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں' یہاں سب جان پہچان والے آتے ہیں۔'' بڑی بی نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

''سرمد' میں تھوڑی دیر انتظار کرلوں گی۔''

''ٹھیک ہے' میں ایک گھنٹے بعد آتا ہوں۔''

''آپ چمن خالہ کی......''

''بڑی بہن ہوں' چندا نام ہے میرا۔''

''دراصل پہلے کبھی دیکھا نہیں۔''

''کیسے دیکھتی' پرسوں تو آئی ہوں لکھنؤ سے۔ سات برس پہلے پاکستان آئی تھی۔ لکھنؤ میں اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس رہتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد نواسوں نے نظریں پھیر لیں۔ سارا سارا دن گھر میں اکیلی پڑی رہتی پھر دونوں نواسوں نے گھر بیچ کر بٹوارہ کرلیا۔ مجھ پر اتنا احسان کیا کہ چمن کے پاس آنے کا بندوبست کردیا۔ کوئی اور تو تھا نہیں جس کے پاس زندگی کے باقی دن کاٹ لیتی۔ تم بتاؤ' تم کہاں سے آئی ہو اور چمن سے کیسی جان پہچان ہے؟ حلیے سے تو تم اس علاقے کی نہیں لگتیں؟''

''جی' چمن خالہ سے کام رہتا ہے اور پھر میری اس علاقے میں جان پہچان چمن خالہ نے ہی کرائی ہے۔''

''پان چھالیہ کا شوق رکھتی ہو؟'' بڑی بی نے پان لگاتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔''

''بھئی' میں تو جو کھا رہی ہوں' وہی پیش کرسکتی ہوں۔''

''تکلف کی ضرورت نہیں' مجھے آپ کی باتیں سن کر مزا آرہا ہے۔ آپ کی صرف بیٹی تھی' بیٹا کوئی نہیں ورنہ آپ کا سہارا ہوتا۔''

''اچھا ہوا جو اللہ نے مجھے بیٹی دی' کم از کم اتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی تو اچھے سے گزر گئی' باقی بھی گزر رہی جائے گی۔ اگر بیٹا ہوتا تو کم بخت کی روٹی کا انتظام بھی خود مجھے کرنا پڑتا۔ بیٹیاں تو ہمارا سہارا ہوتی ہیں' اب چاہے وہ گا بجا کر پیسے لائیں یا کیسے بھی یا اگر کسی کو ایمان داری کا بھوت سوار ہو تو بھلے سے جھاڑو بہارو کر کے لائے۔ اب بھیا' زندگی کا سفر بھی تو کاٹنا ہے' سفر تو چلتا رہتا ہے' کبھی ہم اپنی ماؤں کا سہارا بنے پھر ہماری بیٹی اور پھر جو وقت عقل مندی سے گزارے جیت اسی کی ہوتی ہے ورنہ میں بھی چمن کی طرح ٹافیاں اور مرمرے ہی پیک کرتی نظر آتی اور اب لگتا ہے' راحت کا انجام بھی چمن جیسا ہونے والا ہے آنے والے وقت میں۔ میں نے بھی دنیا دیکھی ہے' ابھی سے بتائے دے رہی ہوں۔''

''اللہ جنت نصیب کرے میری بیٹی کو' شہزادیوں جیسی زندگی گزاری اس نے اور مجھے بھی آرام دیا۔ وہ تو نگوڑمارے اس کے بیٹوں نے آخر وقت میں سکھ لینے نہ دیا۔ نکمے' نکھٹو' آوارہ گردی میں تمام پونجی ختم کردی......''

''کیا کرتے تھے آپ کے داماد؟''

''ارے داماد سے کیا لینا دینا' وہ تو بس شائقین' قدردان کو لانے تک کے ذمے دار ہوتے تھے...... اصل ہنر اور حسن تو میری بیٹی کے پاس تھا۔''

''کیا ہنر تھا ان کے پاس؟'' زرمین پر تجسس لہجے میں بولی۔

''ہمارے دادا' پردادا ذات کے بھانڈ تھے' اپنے وقت کے نامی گرامی بھانڈ' وقت بدلا' ان کے فن کے قدردان نہ رہے' بات فاقوں تک پہنچی پھر ہم لوگوں میں سے جس کی آواز بہتر ہوتی' میلوں ٹھیلوں میں گا بجا کر کچھ کما لیتے' ساتھ میں ایک عدد ہارمونیم بجانے والا رکھ لیتے' آمدنی میں سے چوتھائی حصہ اسے دے دیتے۔ آواز کے ساتھ بناؤ سنگھار اور اداؤں کا آنا بھی ضروری ہوتا۔ کسی بڑے آدمی کی تقریب کے موقع پہ لوازمات بڑے کام آتے۔ اگر کسی کا دل آ گیا پھر سمجھو کہ بس چاندی ہی چاندی...... ہائے...... کیا دن تھے' سب کچھ صحیح چل رہا تھا۔ چمن کی آواز بڑی سریلی ہوا کرتی تھی۔ ایک تقریب میں بہادر شاہ ظفر کی غزل بڑی ترنگ میں گا رہی تھی اور تمام لوگ جھوم رہے تھے اور بار بار اسی غزل کی فرمائش کر رہے تھے۔ اس دن تقریب سے واپسی پر میزبان نے ہمیں بخشش کے ساتھ جوڑے بھی دیئے تھے۔ اسی دن ہارمونیم بجانے والے کے ساتھ اس کا نیا شاگرد بھی تھا جس کا باپ نوٹنکی میں کام کرتا تھا۔ بعد میں اس کی دوستی چمن سے خوب ہوگئی۔

ان ہی دنوں ایک امیر سرپھرا خود کو آواز کا قدردان ظاہر کرتا ہوا چمن سے عقد کرنے کا خواہش مند ہوا۔ بدلے میں سارے گھر بھر کا خرچہ اور دوسری مراعات' بیس تولہ سونا دینے کو تیار تھا مگر جانے اس نوٹنکی والے کی اولاد نے چمن کو کیا پٹی پڑھائی کہ اس سے نکاح کر بیٹھی اور ادھر پاکستان آ گئی۔ دیکھو تو ذرا اس نوٹنکی والے کی اولاد کو' نوٹنکی چھوڑ' اب پرانی ٹنکیاں بناتا پھرتا ہے اور یہ عشق کی ماری ٹافیاں پیک کرتی ہے یعنی دونوں کی تان 'ٹ' پر ٹوٹی۔'' چندا پان کی گلوری منہ میں ڈال کر ہنسنے لگی۔

''جوانی اپنا مختصر وقت پورا کرکے چوروں کی طرح وجود سے نکل جاتی ہے' نئی نوخیزی کو جلا بخشنے اور اس کی جگہ بوڑھی' کمزور روح تمسخر اڑاتی' خواب اور حقیقت کا فرق واضح کرتی ہے۔''

''آپ تو بڑی دلچسپ خاتون ہیں' اندازِ بیاں بھی خوب ہے۔''

''اجی' عمر گزری ہے اہلِ لکھنؤ کی جوتیاں سیدھی کرتے پر بی بی' ایک بات ہے' پاکستان آنے کے بعد ذات پات کا چکر سمجھو کہ ختم ہوگیا۔ کل چمن بتا رہی تھی' پڑوسن کی بیٹی کی شادی کسی بینک کے ملازم سے ہوئی ہے۔ لڑکے کا تعلق یوپی کے معزز گھرانے سے ہے جبکہ ہمیں تو معلوم ہے' لڑکی والے ذات کے نائی ہیں' بس ذرا لڑکی خوبصورت تھی' بات بن گئی مگر مجال ہے جی' جو اگر یہ ہندوستان میں ہوتے تو کوئی نیچی ذات والے سے شادی کرتا۔ ناک کٹنے کا ڈر ہر دم سر پر سوار رہتا اور......'' چندا بی بی کی بات درمیان میں تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے بھئی؟''

''سرمد......!'' باہر سے سرمد کی آواز آئی۔

''اچھا خالہ' اب اجازت دیں' میرا کزن آ گیا ہے۔ چمن خالہ آئیں تو میرا بتا دیجیے گا زرمین آئی تھی۔ آپ کے ساتھ وقت گزارنا بہت اچھا لگا۔ اللہ حافظ!''

•......•......•

''اب کب آنا ہوگا؟'' باہر نکلتے ہی سرمد نے پوچھا تھا۔

''شاید اب نہیں...... کام تو تقریباً مکمل ہو چکا ہے' آج تو میں ان کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے آ گئی تھی مگر ملاقات ہی نہیں ہوئی بلکہ ان کی خالہ سے سیر حاصل معلومات مل گئی اور جو حیرت مجھے ان کے لائف اسٹائل کو دیکھ کر ہوتی تھی' وہ دور ہوگئی۔''

''کیسا لائف اسٹائل؟'' سرمد نے حیرت سے کہا۔

''بھئی' سخت ترین گرمی میں چوڑیوں سے بھرے ہاتھ' کاجل بھری آنکھیں' گھر میں ایکٹرز کی فریم شدہ تصاویر' وقت بے وقت محلے کے لڑکوں کی بے جا آمد و رفت اور......''

''بری بات' کچھ بھی ہو' انہی لوگوں کی بدولت تم نے اپنا کام مکمل کیا۔''

''میں برائی نہیں کر رہی' صرف یہ بتا رہی ہوں' پہلی بار اپنے اردگرد رہنے والوں اور ان لوگوں کا طرزِ زندگی دیکھا۔ خیر چھوڑو۔'' زرمین دانستہ طور پر چندا خالہ سے ہونے والی گفتگو گول کر گئی۔ ''کسی جوس شاپ پر گاڑی روکو' بڑی پیاس لگی ہے۔''

•......•......•

''زرمین' تم سے ایک بات کرنی ہے؟''

''کہو۔''

''شبنم پرائیویٹ میٹرک کرنا چاہتی ہے' اب اسے مسئلہ انگریزی اور میتھس پڑھانے کا ہے۔ دراصل میں نے ہی اسے کہا تھا کہ تم پرائیویٹ پڑھ لو۔ آٹھویں تک پڑھنے کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔''

''تو مسئلہ کیا ہے؟ پڑھنے دو' اچھا ہے' کم از کم میٹرک تو کر لے گی ورنہ اب تک تو اسے انٹر کر لینا چاہیے تھا۔''

''ارے مسئلہ ہے تبھی تو کہہ رہا ہوں۔ تم اور میں جس کو بھی موقع ملے' وقت نکال کر اسے ٹیوشن دے دیا کریں گے۔''

''کیا......؟ تمہاری نوکری شروع ہوئے صرف دو دن ہوئے ہیں اور میرے ریسرچ کو لے کر دس کام ہیں اور یہ شبنم سے تم نے اتنی ساری باتیں کب کر لیں؟ مجھ سے تو اتنی مختصر باتیں کرتی ہے؟''

''تم تو اپنے کام میں مصروف ہوتی تھی تو وہ تم سے کیا بات کرتی؟''

•......•......•

''واہ سرمد! تمہاری تو قسمت زوروں پر ہے۔ کیا لڑکی ڈھونڈی ہے پھوپھی جان نے' ایک تو خوبصورت' ساتھ میں ڈاکٹر بھی۔ بھئی' کم از کم گھر والوں کا اس مہنگائی میں علاج معالجہ مفت ہو جائے گا اور تمہارے ساتھ چلتی حسین بیوی اور اس کے......''

''زرمین' میں شبنم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر فوزیہ سے تو کوئی بھی امیر کبیر آدمی شادی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر لے گا۔ اسے رشتوں کی کمی نہیں مگر شبنم غریب ہے‘ ضرورت مند ہے۔“

”ہیں......! یہ کیا کہہ رہے ہو تم اور یہ سب کب ہوا؟“

”دیکھو زرمین‘ سمجھنے کی کوشش کرو‘ پہلے مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ شروع میں تو ہمدردی کی بنا پر ان لوگوں سے گھلا ملا پھر مجھے شبنم کی معصومیت اچھی لگنے لگی مگر دورانِ ٹیوشن ادراک ہوا کہ میں اسے چاہنے لگا ہوں اور شبنم بھی بلکہ شاید وہ مجھ سے زیادہ......“

”تم ٹیوشن پڑھاتے تھے اور مجھے بتایا بھی نہیں؟ خیر‘ وہ تمہارا مسئلہ ہے مگر یہ آٹھ‘ نو مہینوں میں چاہت اور اب بات شادی تک پہنچ گئی۔ تمہیں پتا ہے‘ وہ لوگ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ گھر والے کسی صورت نہیں مانیں گے۔ میں نے تمہیں آج تک نہیں بتایا تھا کہ شبنم کی چندا خالہ نے اپنا سارا شجرہ نسب کھول کر رکھ دیا تھا۔ ان لوگوں سے رشتہ......“

”ہاں‘ شبنم نے بتایا تھا کہ چندا خالہ ذرا سنک گئی ہیں‘ ان کی باتوں کو اہمیت مت دو۔“

”غلط‘ بالکل غلط‘ وہ بالکل ہوش و حواس میں ہیں بلکہ چندا خالہ کے توسط شبنم کو یہ بات پتا چل گئی ہوگی کہ خالہ نے مجھے اپنے خاندان کے حوالے سے انٹرویو دے دیا ہے‘ تبھی تم سے ان کے بارے میں یہ بات کہہ رہی ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو پلیز‘ تم ایک بار ان لوگوں سے کہو کہ وہ شبنم کا رشتہ کہیں اور طے نہ کریں۔ تھوڑا ٹائم دلوا دو‘ بس اسی دوران میں گھر والوں کو کنوینس کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے...... میں چلی جاؤں گی مگر کوئی فضول آسرا نہیں دوں گی کیونکہ مجھے گھر والوں کا اچھی طرح علم ہے‘ وہ تمہارے فیصلے میں کوئی ساتھ نہیں دیں گے۔ اب جاؤ‘ مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے۔“

•......•......•......•

”کیسا رہا زرمین‘ تمہارا انٹرویو؟“

”چچی جان‘ ٹھیک ہی رہا‘ اب دیکھیں‘ آگے کیا ہوتا ہے۔“

”زرمین‘ ادھر آؤ تو۔“

”کیا بات ہے سرمد‘ پریشان کیوں لگ رہے ہو؟“

”زرمین‘ شبنم کا فون آیا تھا‘ وہ پریشان تھی‘ گھر والے اس کی شادی کہیں طے کر رہے ہیں۔ اگر کل تک اس کی ماں سے رشتے کی بات نہ کی تو وہ اپنی جان دے دے گی۔ میں نے کہا‘ کل زرمین‘ چمن خالہ سے مل لے گی‘ باقی باتیں بعد میں ہو جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے‘ میں کل چلی جاؤں گی مگر آئندہ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔“ زرمین بوجھل دل لے کر کمرے سے نکل آئی۔ کچھ بھی ہو‘ اسے اپنی خاندانی قدروں کا پاس تھا۔

”زرمین......!“

”اب کیا ہوا سرمد؟ کیوں پریشان ہو رہے ہو اور مجھے بھی پریشان کر رہے ہو؟“

”زرمین‘ شبنم بہت جذباتی لڑکی ہے‘ میں سوچ رہا تھا جو کام کل کرنا ہے‘ وہ آج کیوں نہیں؟“

”مگر اب تو شام ہو رہی ہے‘ رات ہونے والی ہے‘ تم اسے فون کر لو۔“

”فون بھی تو بند آ رہا ہے اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔“

”اچھا چلو‘ میں آتی ہوں۔“

”امی......! میں زرمین کو آئسکریم کھلا کر لا رہا ہوں۔“

”سرمد‘ آٹھ مہینوں بعد دوبارہ ان گلیوں میں آئی ہوں‘ فرق صرف رات اور دن کا ہے‘ یہ لو بجلی بھی چلی گئی۔ چلو بھئی‘ کل آ جائیں گے‘ اندھیرے میں راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا۔“

”پاگل مت بنو‘ اب گھر کے قریب پہنچ ہی چکے ہیں۔“ دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دونوں کے کانوں میں آواز پڑی۔

”اری چمن‘ ذرا وہ گیت تو سنا جسے سن کر وہ امیرزادہ فدا ہو گیا تھا۔ اگر میری مان لیتی تو آج بڑھاپا سکھ سے گزر رہا ہوتا۔“ چندا خالہ کی آواز ابھری۔

”ارے آپا‘ اب وہ آواز کہاں رہی۔“

”اماں......! سنا بھی دو‘ یہاں کون سا کوئی غیر بیٹھا ہے جو مذاق بنائے۔“ پھر فضا میں ایک بھدی آواز ابھری۔

’راجہ جی‘ ہم تو ہاری داسی
جنم جنم کی پیاسی
جو تو نہ ہی
کیسے گزرے زندگانی؟‘

”اری چمن‘ تو نے اپنی بیٹیوں کو اپنا ہنر کیوں نہ سکھایا؟ راحت تو تجھ پر گئی عشق کی ماری پر شبنم کو تو سکھایا ہوتا؟“

”آپا‘ شبنم زیادہ سمجھدار ہے‘ بغیر محنت کے لمبا ہاتھ مار لے گی۔ وہ میرے اور راحت سے مختلف ہے‘ گھاٹے کا سودا نہیں کرے گی۔“

”ارے‘ یاد آیا‘ شبو‘ کیا ہوا؟ بات کی تو نے سرمد سے؟ کہیں ایسا نہ ہو‘ وہ صرف آسرا دیتا رہے اور تو انتظار کرتی رہے؟“

”اماں......! سٹھیا گئی ہو کیا؟ ایک سرمد پر دنیا ختم تھوڑی ہو گئی ہے۔ وہ ہے نا جمال بھیا کا دوست جس کی صدر میں کپڑوں کی دکان ہے‘ اکیلا وارث ہے۔ کل نیا پرنٹ دیکھا تھا اس کی دکان پر‘ کہہ رہا تھا۔ گھر آ کر دوں گا۔ باقی امیدواروں کو تو میں لفٹ اس لیے نہیں کراتی کہ سب اسی علاقے کے ہیں‘ بعد میں بھی اسی علاقے میں ہی رہوں راحت باجی کی طرح فائدہ......! کم از کم اس علاقے سے باہر کی دنیا بھی تو دیکھوں۔“

وہ تو چندا خالہ نے خاندانی لوگوں کے بارے میں بتایا تھا کہ مجھے بھی شوق ہو گیا۔ دیکھوں تو ذرا ان لوگوں کے قریب جا کر‘ کیسے ہوتے ہیں یہ خاندانی لوگ‘ ہمیں کمی ذات کا سمجھنے والے......“

’راجہ جی‘ ہم تو ہاری داسی
جنم جنم کی پیاسی‘

شبنم لہک لہک کر گانے لگی۔ سب کا مشترکہ قہقہہ ابھرا۔ سرمد پر گھڑوں پانی پڑ گیا‘ تاہم رات کے اندھیرے میں اس کا غم ظاہر نہیں ہو سکا۔ اندھیرا اس وقت مہربان کی صورت اختیار کر لیتا ہے جب انسان اپنے غم کسی دوسرے کے سامنے آشکار کرنے سے گریزاں ہوتا ہے۔

گاڑی سبک رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی جبکہ زرمین کے کانوں میں پھوپھی جان کی ہزار بار دہرائی بازگشت گونج رہی تھی۔

”بٹیا......! ہر انسان اپنی ذات اور خاندان کے زیرِاثر رہتا ہے۔ آج اگر ہم لوگ مستحکم اور پُراعتماد ہیں تو اپنی وضع داری کی قدر کرنے کی بنا پر۔“

”کیا تقسیم کے وقت صرف مخصوص خاندان اور ذات کے لوگ پاکستان آئے تھے؟“

”ہرگز نہیں‘ اس میں ڈوم‘ چمار‘ میراثی‘ پیشہ کرنے والی وغیرہ‘ سب شامل تھے‘ بس پاکستان کم کا میلہ ثابت ہوا اور وہ لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔ اکثر نے تو اپنا پیشہ بدل لیا اور ذات چھپا گئے پر اصلیت پھر بھی نہیں چھپ سکتی‘ ایک نہ ایک دن سچائی سامنے آ ہی جاتی ہے۔“

ماضی کے سائے سدا ہمارے ساتھ رہتے ہیں‘ وہ کبھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہم حال میں ہونے کے باوجود ماضی ہوتے ہیں۔ ہماری انفرادی زندگیاں ماضی کی مجموعیت کی سب سے بڑی تفسیر ہیں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY MONDAY AT 8:00PM

آپ بیتی

یہ سچ بیتی سنانے والے آپ کے اور ہمارے درمیان ہی موجود ہیں

نازیہ بتول رضا

اپنوں نے غم دیے تو....

قابل اجمیری کا خیال

راستہ کٹ ہی جائے گا قابلؔ
شوق منزل اگر سلامت ہے

گھر اور خاندان کی محبتوں، نفرتوں سے کشید کی گئی خاص کہانی



میری امی جب ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئیں تو بہت سی دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی تنہا تھیں۔ ہندوؤں اور سکھوں نے ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے پورے خاندان کو ختم کر ڈالا تھا۔ ان حالات میں وہ غموں کا پہاڑ سینے پر لیے ہجرت کی صعوبتیں سہتے ہوئے کس طرح پاکستان آئیں، یہ ایک الگ داستان ہے۔

اس وقت چونکہ سب کا غم مشترکہ تھا اس لیے سب ایک دوسرے کے دکھ بانٹ رہے تھے۔ امی کی طرح میرے ابو کے گھر والے بھی فسادات میں مارے گئے تھے لہٰذا وہ بھی تنہا رہ گئے تھے اس لیے سب نے باہمی مشورے سے ان دونوں کی شادی کر دی، یوں میری امی اپنے جیون ساتھی کے ساتھ سکون کی زندگی گزارنے لگیں۔ امی کے پڑوس میں ایک نہایت نیک خاتون اور ان کے شوہر رہتے تھے لیکن ان کے کوئی اولاد نہ تھی، ہر سال اولاد دنیا میں تو آتی تھی لیکن زندہ نہ رہ پاتی تھی۔ اس سلسلے میں دونوں میاں بیوی بہت دکھی رہتے تھے اور اولاد کی دعائیں مانگتے نہ تھکتے تھے۔

دن یونہی گزر رہے تھے کہ اللہ نے ان کو ایک بیٹے سے نوازا۔ دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی بہت منتوں، مرادوں کے بعد اس دنیا میں آیا تھا اور ہر بار کی طرح اس بار بھی والدین اس کی زندگی کی دعائیں کر رہے تھے۔ اللہ اللہ کر کے وہ بچہ دو سال کا ہو گیا۔ وہ اپنے والدین کی آنکھ کا تارا تھا۔ ماں باپ دن رات اللہ سے اس کی صحت اور خوشیوں سے بھری زندگی کی دُعائیں کرتے نہ تھکتے تھے۔

انہی دنوں میری امی کے گھر بھی خوشخبری آ گئی۔ میرے دو بھائی مجھ سے پہلے ہی اس دنیا میں آ چکے تھے اور میرا نمبر تیسرا تھا۔ جب امی کی پڑوس والی خاتون جن کا نام ساجدہ تھا، انہوں نے یہ خبر سنی تو خوشی سے پھولی نہ سمائیں اور دُعا کرنے لگیں۔

''کاش، اللہ عزوجل تمہیں بیٹی عطا کرے تو اس کو میں لے لوں گی۔ مجھے بیٹی کی بڑی آرزو ہے۔''

میری امی بولیں۔ ''ہاں ہاں، کیوں نہیں، میری بیٹی ہوئی تو میں تمہیں دے دوں گی، ویسے بھی ہم دونوں ہی اللہ کی اس نعمت سے محروم ہیں اور وہ بچی ہم دونوں کے پاس ہی رہے گی۔'' یہ بات کر کے ساجدہ خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئیں۔

کچھ ہی عرصے بعد میں اس دنیا میں آ گئی۔ میں چونکہ اکلوتی تھی اور دونوں گھر والوں کی آنکھ کا تارا تھی اس لیے خوب خوب خوشیاں منائی گئیں لیکن کس کو خبر تھی کہ اس ننھی سی بچی کے مقدر میں کتنے دکھ ہیں اور یہ ان دکھوں کو سہہ بھی پائے گی کہ نہیں؟

خیر، یونہی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے میری پرورش ہونے لگی اور مجھے ایک ساتھ دو دو ماں اور باپ کا پیار ملنے لگا۔ اپنے سگے والدین کو میں امی، ابو اور پالنے والے ماں باپ کو اماں ابا کہنے لگی۔ میری ہر فرمائش منہ سے نکلتے ہی پوری ہوتی تھی۔

میں فطرتاً بہت سیدھی سادی تھی جیسا جس نے کہا، مان لیا۔ امی ابو کے گھر بھی خوش تو اماں ابا کے پاس بھی شاد رہتی تھی۔ دونوں مائیں میرا خوب خوب خیال رکھتیں۔ میری امی تھوڑی غریب تھیں اس لیے میری زیادہ فرمائشیں میرے اماں ابا ہی پورے کرتے۔ امی اکثر منع بھی کرتیں۔

''ساجدہ، تم اس کی ہر فرمائش پوری نہ کیا کرو، اس کی عادتیں بگڑ جائیں گی۔''

جواب میں میری اماں مسکرا کر کہتیں۔ ''ارے، ایسے کیسے، کیا میں اس کی ماں نہیں ہوں؟ آئندہ مجھے منع نہ کرنا۔''

میرے لیے مہنگی سے مہنگی چیز آتی۔ میں مہنگے ترین کپڑے پہنتی، غرض میری ہر فرمائش پوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتی۔ میں چونکہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی تھی' یہی دونوں گھر میری کل کائنات تھے اس لیے باہر کے راستوں سے بھی ناواقف تھی۔ جہاں جانا ہوتا' دروازے سے سوار ہوکر دروازے پر اترتی۔ مجھے یاد ہے'ایک دن تفریحاً میرے بھائی مجھے کہیں لے گئے' واپسی میں تھوڑا فاصلہ رہ گیا تو مجھ سے کہنے لگے۔

''بے بی! مجھے یہاں سے گھر کا رستہ نہیں معلوم' اب تم ہی بتاؤ' کہاں جانا ہے؟'' یہ سننا تھا کہ میں رونے لگی اور سمجھی کہ ہم بھٹک گئے ہیں۔

''بھائی......! اب ہم گھر کیسے جائیں گے؟ مجھے تو اپنے گھر کا راستہ بھی معلوم نہیں۔'' اس پر میرے بھائی ہنسنے لگے۔

''میری بھولی بہن......! یہ آگے والی گلی ہماری ہی تو ہے' چلو' گھر چلو۔'' اور میں خوشی خوشی لوٹ آئی۔

ابھی میں محض پندرہ برس کی تھی کہ میرے رشتے آنے لگے۔ میں خوبصورت بھی تھی اور کم عمر بھی لہٰذا میرے لیے رشتوں کی لائن لگ گئی تھی۔ انہی دنوں میرے ابا کی بہن بھی میرا رشتہ لے کر آگئیں۔ امی ابو کو یہ رشتہ مناسب لگا کہ اماں' ابا نے مجھے پالا تھا تو اس طرح ان کا حق تھا کہ وہ میرے لیے جو بہتر سمجھیں' کریں۔ یوں میری چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی کہانی ہوگئی۔

جہیز کے معاملے میں بھی میں خوش قسمت رہی۔ اماں ابا نے بھی مجھے جہیز دیا اور امی بھی انتھک محنت کے بعد میرے لیے چند برتن اور سونے کے جھمکے ہی کر پائی تھیں' یہ جھمکے اور یہ برتن مجھے جان سے بڑھ کر عزیز تھے۔

میرے شوہر ایک فرمانبردار اور ذمہ دار بیٹے تھے۔ ان سے بڑے دو بھائی شادی کے فوراً بعد الگ گھر میں جا بسے تھے اور ان کی بیویوں نے ان کو واپس پلٹنے بھی نہ دیا تھا حالانکہ میری تین نندیں کنواری تھیں لیکن بڑے بھائی اپنے فرض کو بھلا بیٹھے تھے لہٰذا یہ ذمہ داری میرے شوہر نے اپنے کاندھوں پر اٹھالی تھی اور اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھا بھی رہے تھے۔ شادی کی پہلی رات انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا۔''کبھی بھی مجھ سے الگ گھر کی فرمائش نہ کرنا' میری ماں بہنوں کا مجھ سے بڑھ کر خیال رکھنا۔ میری ماں بہت دکھی ہیں اور میں گھر چھوڑ کر ان کو مزید دکھی نہیں کرسکتا لہٰذا اسی گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔''

میں چونکہ سیدھی سادی تھی اور ماں نے بھی ایسی تربیت کی تھی کہ بیٹا' سسرال ہی اب تمہارا گھر ہے' اب وہاں سے مر کر ہی نکلنا سو میرے لیے تو الگ گھر کا سوچنا ہی مشکل تھا لہٰذا میں نے اسی گھر کو اپنا سب کچھ مان لیا حالانکہ میں خود بھی کم عمر تھی لیکن نندوں کو اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھنے لگی اور ان کا ہر کام خود کرنے لگی۔

میرے آنگن میں پہلی ولادت بیٹی کی ہوئی جس پر سب خوش ہوئے' خوب خوشیاں منائی گئیں اور چھٹی کے موقع پر میری بڑی نند نے اپنے بیٹے کے نام کی انگوٹھی میری بیٹی کی انگلی میں ڈال دی اور کہا۔''بھائی جان! یہ بچی آج سے میری امانت ہے۔''

میرے شوہر چونکہ ماں بہنوں پر جان چھڑکتے تھے' ان کے لیے بہن سے بڑھ کر اور کیا تھا اس لیے بہن کی خوشی میں خوش ہوگئے۔

میں اپنے سیدھے پن کی بدولت اپنا سارا زیور اور بھاری برتن جو مجھے جان سے بھی عزیز تھے' سسرال میں ساس کے ہاتھوں گنوا چکی تھی لیکن مجھے کچھ پروا نہ تھی' میں اپنے گھر میں ہر حال میں خوش رہنا چاہتی تھی۔ یہ بات میں نے اپنے میکے والوں سے بھی چھپائے رکھی۔

میرے بھائی اکثر مجھ سے پوچھتے۔''تم اپنا زیور کیوں نہیں پہنتی ہو؟''

اس پر میں بھولپن سے جواب دیتی۔''بھائی......! وہ بہت بھاری زیور ہیں' میں تھک جاتی ہوں' مجھ سے نہیں پہنے جاتے۔'' اور یوں بات آئی گئی ہو جاتی۔ ویسے بھی میرے بھائی غصے کے کچھ زیادہ ہی تیز تھے اس لیے میں ان کے سامنے کچھ کہنے سے کتراتی تھی۔ ہر حال میں اپنے گھر میں خوش رہنا چاہتی تھی۔

زندگی یونہی گزر رہی تھی کہ مجھ پر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور میں ان حالات سے گزری جن کے بارے میں' میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ہوا یوں کہ اچانک میرے شوہر کا کام چھوٹ گیا' اس دن وہ جب اپنے کام سے لوٹے تو بہت بجھے بجھے سے تھے۔

''کیا بات ہے' آج آپ بہت چپ چپ سے لگ رہے ہیں؟ کوئی پریشانی ہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں' میرا کام چھوٹ گیا ہے......ڈھونڈ رہا ہوں' انشاء اللہ' جلد ملنے کی امید ہے۔ تم پریشان مت ہو۔'' وہ مجھے تسلی دے رہے تھے یا خود کو' میں سمجھ نہیں پائی۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے اور میرے شوہر کو کام نہ ملا۔ وہ روز صبح کام ڈھونڈنے نکلتے اور رات کو مایوس اور اداس سے گھر میں گھستے۔ ان دنوں وہ اتنے پریشان تھے کہ مجھ سے بھی ٹھیک سے بات نہ کرتے اور اپنے کام کی فکر میں گھلتے رہتے۔ میں یوں تو صابر وشاکر تھی لیکن اپنے شوہر کی بے روزگاری کی وجہ سے ان کی جو حالت تھی' اس کو دیکھ کر کڑھتی رہتی لیکن منہ سے کچھ نہ کہتی۔

اُن دنوں جب ہم دونوں میاں بیوی پریشان تھے اور اپنے رب سے اچھے دنوں کی دعائیں مانگ رہے تھے اور صرف اسی کی ذات سے امیدیں وابستہ کیے بیٹھے تھے تو مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ میرے سسرال والے تو صرف پیسے کے ہیں' میں اب تک اپنی تمام تر خدمتوں' ریاضتوں کے باوجود ان کے دل میں گھر نہیں کر پائی ہوں' ان کے دل میں نہ میرے لیے کوئی محبت ہے اور نہ کوئی مقام۔ مجھ پر تو جیسے دہری پریشانی آپڑی تھی' کوئی مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہ کرتا جیسے یہ سب حالات میری وجہ سے ہوئے ہیں۔ پہلے میرے شوہر بہت اچھا کماتے تھے اور گھر کے تقریباً تمام خرچے اور ماں بہنوں کی فرمائشیں وہی پوری کرتے تھے اور اب اس پریشانی کے عالم میں وہ سب نہ صرف مجھ سے بلکہ میرے شوہر سے بھی منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ میرے شوہر ویسے ہی خاموش اور شرمندہ رہنے لگے تھے کہ اس نئی افتاد سے میں پریشان ہوگئی۔

انہی دنوں میرے گھر ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گھر میں خوب خوشیاں منائی جاتیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی لیکن ہوا بالکل برعکس۔

شوہر خوش تو تھے لیکن اپنی پریشانی میں وہ خوشی کو ظاہر نہ کر پائے اور نہ گھر کے کسی فرد نے کوئی خاص خوشی کا اظہار کیا۔ میں بجھ کر رہ گئی بلکہ اس کے بعد میرے سسرالیوں کے ظلم میں تیزی آگئی اور انہوں نے مجھے بالکل تنہا کردیا۔ اس سے پہلے بھی میں سارے گھر کا کام تنہا کرتی تھی' سب کی خدمتیں کرنا' سب کا خیال رکھنا لیکن کوئی مجھے کھانے کو نہ کہتا بلکہ سب ایک ساتھ کھا لیتے اور دسترخوان پر کھانا پکانے والے کی کمی محسوس نہ ہوتی۔

بیٹے کی ولادت کے بعد میں بہت کمزوری محسوس کررہی تھی اور بھوک بھی شدید تھی' کچھ کھانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طلب ہو رہی تھی، میری ساس نندیں کھانا بنانے میں لگی تھیں اور میں خود کو تسلیاں دے رہی تھی کہ ابھی میری ساس کھانا لا کر میرے آگے رکھیں گی کہ اچانک میری نند جو کچھ فاصلے پر رہتی تھی، اس کا بیٹا آیا اور بولا۔

''نانی اور خالہ، آپ سب کو امی بلا رہی ہیں، فوراً آجائیں اور جو کچھ پکایا ہے، وہ بھی لے چلیں۔''

میری ساس نندوں نے جو کچھ پکایا تھا، وہ سب اٹھایا۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ایک زچہ گھر میں موجود ہے، اس کو بھی بھوک لگی ہوگی، اس کو بھی کھانا دینا ہے، وہ سب چلی گئیں اور میں نے اکیلے گھر میں کچھ بھوک کی شدت سے اور کچھ خوف کے مارے رونا شروع کر دیا۔ میں جلدی سے دروازے تک گئی تاکہ کنڈی لگا لوں اور کچھ خوف کم ہو، کیا دیکھتی ہوں، میری امی چلی آ رہی ہیں۔ وہ اندر آئیں، ماں کو دیکھ کر میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں نے رونا شروع کر دیا۔ وہ گھبرا گئیں۔

''کیا بات ہے بیٹی؟ کیوں رو رہی ہے؟ کسی سے کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' میری حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ ''کچھ بتا تو سہی، مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تو کیوں رو رہی ہے؟ اچھا چل، اندر چل کے اطمینان سے بیٹھ، دیکھ، میں تیرے لیے کیا لائی ہوں۔'' انہوں نے ساتھ لائے ہوئے شاپر میں سے ایک لفافہ نکالا اور پھر باورچی خانہ سے پلیٹ لے آئیں۔

گرما گرم پکوڑے تھے۔ میرے آنسو اور تواتر سے بہنے لگے لیکن ماں سے کچھ کہنے کی ہمت اور عادت ہی نہیں تھی۔ کبھی اپنے گھر کی کوئی بات اپنی ماں سے نہیں کرتی تھی۔ آج نجانے کیسے میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے اور میں لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آنسوؤں پر بند باندھنے میں ناکام رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ واقعی ماں، ماں ہوتی ہے۔ اولاد چاہے بتائے نہ بتائے، وہ ہر دکھ کو جان جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ اگر اولاد تکلیف میں ہو تو ماں کو قبر میں بھی سکون نہیں ملتا، شاید اسی لیے میری بھوک کا ماں کو احساس ہو گیا اور وہ میرے لیے کھانے کا انتظام کرتی آئیں۔ خیر، ماں کی پریشانی اور میرے آنسوؤں سے اُن کی آنکھوں میں آئی نمی دیکھ کر میں نے خود کو سمیٹا اور قدرے نارمل ہو گئی۔

''امی......! آج آپ فیکٹری سے جلدی کیسے لوٹ آئیں؟ آپ تو شام میں آتی ہیں ناں، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''ارے بیٹا! بس کام کے دوران تیری یاد ستانے لگی تو دل چاہا کہ تجھ سے ملوں، تجھے دیکھوں، پورا ہفتہ گزر گیا تھا ناں، تجھے دیکھے ہوئے، بس پھر کام میں دل نہ لگا، سو چلی آئی تجھ سے ملنے، سوچا، تیرے لیے پکوڑے لے چلوں، تیری نندیں بھی شوق سے کھاتی ہیں۔ ارے ہاں......'' وہ ایک دم چونکیں۔ ''سب کہاں ہیں، کوئی نہیں ہے کیا گھر میں؟'' وہ گھر خالی دیکھ کر بولیں۔

''امی......! وہ سب میری نند کے گھر گئے ہیں، وہی جو گلی میں رہتی ہے رضیہ باجی۔''

''اچھا، اچھا لیکن تجھے اکیلا چھوڑ کر؟ اچھا چھوڑ، تو نے کھانا کھا لیا؟''

میں نے سر جھکا دیا اور ہولے سے کہہ دیا۔ ''ہاں۔'' میرے جواب سے انہیں تسلی نہیں ہوئی، وہ فوراً باورچی خانے میں گئیں، کچھ دیر کھٹر پٹر کی آوازیں آتی رہیں، وہ واپس آئیں اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے کہ کھانا کھا لیا ہے؟ باورچی خانے میں کچھ نہیں ہے، اب مجھے سب

ی بتا، کیا بات ہے؟''

میں نے روتے روتے سب بتا دیا لیکن پچھلی ی پھر بھی گول کر گئی۔

''یہ سب کب تک آئیں گی؟'' میری بپتا سن کر ردہ ہو گئیں۔

''پتہ نہیں۔''

''اچھا تیرا پیٹ تو ابھی خالی ہوگا، میں ابھی کھانا لاتی ہوں گھر سے۔'' وہ عجلت میں برقع اوڑھتی چلی گئیں اور میں آوازیں دیتی رہ گئی۔ یباً ایک گھنٹے بعد وہ دوبارہ آ گئیں۔ اس وقت سی نے پلٹ کر میری خبر بھی نہ لی تھی۔ امی نے ی جلدی میرے لیے کھانا نکالا اور ٹرے سجا کر ے آگے رکھ دی۔ مرغی کا سالن اور چپاتیاں ں۔

''اب جلدی سے کھانا کھا لے میری بچی! تو ے سے بھوکی بیٹھی ہے، مجھے معاف کر دے میری ''یہ کہہ کر وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے ں۔

''امی......! آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں، ی ساس نندیں بہت اچھی ہیں، میرا بہت خیال ی ہیں، بھول گئی ہوں گی جلدی میں۔ آپ پلیز، بند کریں ورنہ......ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں ۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ یہ دھمکی ر ثابت ہوئی اور امی نے جلدی سے اپنے آنسو کر لیے۔

''اچھا چل، آج میں تجھے اپنے ہاتھ سے کھانا تی ہوں۔''

اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ میری ساس یں روزانہ کھانا پکاتیں اور رضیہ باجی کے گھر کھانا کر چلی جاتیں۔ میں بھوکی رہ جاتی، کوئی سوچتا نہیں۔ امی فیکٹری سے سیدھی میرے پاس آتیں، مجھے کھانا کھلاتیں اور میرے بچے یاسر کے گندے کپڑے بھی دھوتیں۔ میں منع کرتی لیکن وہ ایک نہ سنتیں۔

انہی دنوں میرے شوہر نے کوشش کر کے اپنا کاروبار شروع کیا۔ محنتی تو وہ شروع سے ہی تھے لہٰذا کچھ ہی دنوں میں ہمارے حالات اچھے ہو گئے۔ میرے شوہر خوب کمانے لگے۔ وہی نندیں جو مجھے پوچھتی نہ تھیں، اب ہمہ وقت میرے گھر نظر آنے لگیں۔ کنواری نندیں روزانہ فرمائشیں کرتیں۔

''بھیا...... ! آج تو خوب سارے آم لے آؤ۔'' ندا کہتی۔

''میرا دل تو چاہ رہا ہے، پرنس روڈ کے دہی بڑے کھاؤں۔'' بشریٰ فرمائش کرتی۔

میرے شوہر مسکرا کے شادی شدہ بہن سے پوچھتے۔ ''اور تمہیں کیا کھانا ہے؟''

انتظار؟

چاند بادلوں کی اُوٹ میں
چھپ رہا ہے
سحر بھی لبادۂ شب
اُتار رہی ہے
رات بھر اک شخص
رت جگوں میں
جاگا ہے
اُس کی سرخ آنکھیں
خود سے
ہمکلام ہیں کہ!!
تیرے انتظار کا سفر
کب ختم ہوگا؟؟؟

عبدالحکیم ساجد۔ مچن آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کہتیں۔ ''بھائی......! میں تو فنگر فش کھاؤں گی' بہت ساری لانا' ایک پلیٹ بھر کر تو میں کھالوں گی۔'' اور میرے شوہر مسکرا مسکرا کر سب کی سنتے اور پوری بھی کرتے۔ میں نے کبھی اپنے شوہر کو روکنے کی یا کان بھرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں سب کے ساتھ مل جل کے محبت کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ میں گھر میں چہل پہل اور خوشحالی دیکھ کر بہت خوش تھی اور دُعا کرتی تھی کہ یارَب! میرے گھر کو کسی کی نظر نہ لگے۔ میری امی بھی اب میری طرف سے مطمئن ہوگئی تھیں' یہ انہی کی دُعاؤں کا کرشمہ تھا۔

وقت یونہی گزرنے لگا۔ میرے شوہر نے تن تنہا تین بہنوں کی شادیاں کیں۔ جہیز میں ان کی پسند کی ہر چیز دی' ان کو ساتھ لے کر شادی کی شاپنگ کرائی' غرض ہر ایک چیز ان کی پسند کی دلائی۔ شادی کے کپڑے لانے کے لیے ان کے ہاتھ میں رقم رکھ دی کہ تم اپنی پسند سے لے لینا۔ اس طرح سب کی خوشی کا خیال رکھا۔

اپنے شوہر کی طرح میں بھی ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ اپنے لیے کپڑے بناتی۔ نند کہتی۔ ''اللہ! بھابھی......! یہ سوٹ کتنا حسین ہے' یہ میرے جہیز میں رکھ دو' تم اپنے لیے اور بنالو' یہ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

اور میں خوشی خوشی وہ سوٹ اس کے جہیز کے لیے پیک کردیتی۔

اسی طرح پندرہ سال گزر گئے۔ جب میں اپنی سب سے چھوٹی نند کی شادی کررہی تھی تو میری بڑی بیٹی پندرہ برس کی ہوچکی تھی۔ میں نے اب تک اس کے لیے ایک سوٹ بھی نہیں رکھا تھا' سب نندوں پر خرچ کر بیٹھی تھی اور مطمئن تھی۔ محلے والے اکثر مجھے سمجھاتے کہ کچھ اپنی بیٹی کے لیے بھی جمع کرو' کچھ بچت کرو لیکن میں اپنے سسرالیوں میں کچھ ایسے مگن اور مطمئن تھی کہ مجھے کوئی خدشہ تھا نہ کوئی اندیشہ۔ مجھے اپنے رشتوں پر اور اپنے خلوص پر پورا بھروسہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب میں سب پر اپنا پیار اور خلوص لٹا رہی ہوں' یہ میرے اپنے مجھے بھی اکیلا نہ چھوڑیں گے۔ میری چھوٹی نند کی شادی بھی خوش اسلوبی سے نمٹ گئی۔ حسبِ سابق میرے شوہر نے اور میں نے جی جان سے ہر کام بڑھ چڑھ کر کیا۔

آفت تو مجھ پر تب ٹوٹی جب میرے شوہر کے کاروبار میں نقصان ہونے لگا اور شہر کے حالات ایک دم خراب رہنے لگے' دنگا فساد' فائرنگ' کرفیو اور دہشت گردی ہونے لگی' ایسے میں کام بھلا کیا اچھا ہوتا لہٰذا خسارہ ہونے لگا۔

ایک دن میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ شہر کے حالات بہت خراب تھے۔ میرے ایک جیٹھ شہر کے اس حصے میں رہتے تھے جہاں اکثر و بیشتر حالات خراب رہتے تھے۔ ان دنوں ٹیلی فون کی سہولت بھی عام نہ تھی۔ محلے بھر میں تقریباً ایک ہی گھر میں فون کی سہولت موجود ہوتی تھی۔ ہمارے پڑوس میں بھی ایک گھر میں فون تھا اور ہم نے اپنے عزیز رشتے داروں کو ان کا نمبر دے رکھا تھا تاکہ خیر خیریت پتہ چلتی رہے۔ پڑوسی بھی اچھے تھے' فوراً اطلاع کرتے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک سے میں چونکی۔ ''کون ہے؟''

''بھابی......! میں ہوں' دروازہ کھولیے۔'' آواز ہمارے پڑوس کی بچی کی تھی۔ ''بھابی......! آپ کا فون ہے' ایاز انکل کا فون ہے' وہ بلا رہے ہیں' کہہ رہے ہیں' جلدی سے بلواؤ۔'' وہ یہ کہہ کر جلدی سے بھاگ گئی۔ ایاز میرے جیٹھ تھے۔ میں نے جلدی

...ے اپنی ساس کو فون سننے بھیجا اور خود پریشان سی بیٹھ ...ی۔

''یاالٰہی! سب خیریت ہو۔'' میں گڑگڑا کر رب ...ے دُعا مانگ رہی تھی۔ میری ساس لوٹ آئیں ...ن ان کے چہرے سے پریشانی چھلک رہی تھی۔

''امی......! سب خیریت تو ہے ناں؟ بھائی ...حب نے اتنی صبح صبح کیوں فون کیا؟''

''تم فوراً ریاض کو اٹھاؤ' مجھے بہت ضروری کام ...ے۔'' وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے ...اپنے شوہر کو اٹھا کر تمام صورتِ حال بتائی۔ وہ ...سوچنے لگے کہ کیا بات ہوسکتی ہے؟ بہن بھائیوں ...وہ ویسے بھی سو جان سے فدا تھے' اب تو بات ...یشانی کی تھی۔ وہ فوراً میری ساس کے کمرے میں ...ے۔

''امی......! کیا بات ہے' جلدی بتائیں؟''

میری ساس رونے لگیں اور ...ں۔ ''بیٹا......! ابھی ابھی ایاز کا فون آیا تھا' وہ ...ت پریشان ہے' حالات خراب ہونے سے اس کا ...م ٹھپ ہوکر رہ گیا ہے' کل سے اس کے بچے ...کے ہیں' شہر میں کرفیو لگا ہے' کیا کروں' کچھ سمجھ ...ں آرہا' اب تم ہی کچھ کرو۔'' یہ کہہ کر وہ پھر رونے ...ں۔

''ہاں' ہاں' امی......! میں خود جاتا ہوں' آپ ...شان نہ ہوں۔'' انہوں نے ساس کے آنسو ...نچھے۔

''لیکن شہر میں تو کرفیو لگا ہے' آپ کیسے جائیں ...؟'' اب پریشان ہونے کی باری میری تھی۔

''تم چھوڑو' میں کسی بھی طرح جاؤں گا' یہ میرا ...ی ہے' وہ میرے بھائی کے بچے ہیں۔''

''ناشتہ تو کرلیں۔'' میں بولی۔

''ابھی میرے حلق سے ایک لقمہ نہیں اترے گا

کچھ بھی نہیں

قلم ہاتھ میں لیے
بیٹھی ہوں
کتنی ہی دیر سے
جہاں
کہنے کے لیے
سب کچھ ہو
وہاں کچھ بھی نہیں ہونا
لکھنے کے لیے!

فرحت جمال۔ کراچی

جب تک میں بچوں کو نہ کھلادوں۔'' میرا سر فخر سے تن گیا کہ میرا شوہر واقعی میرے جیسا دل رکھتا ہے۔ اپنے گھر میں سب سے الگ ہے' میں اُن کی سلامتی کی دُعائیں کرنے لگی۔

وہ ایاز بھائی کے گھر کیسے پہنچے' یہ ایک الگ داستان ہے۔ اس واقعے کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ جان سکیں کہ میں اور میرے شوہر اپنے گھر بار کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے تھے بلکہ یہی نہیں' اگر میں اس طرح کے واقعات تحریر کرنے بیٹھوں تو شاید پوری کتاب بن جائے۔ بہرحال ہم نے سب کی راہوں میں پھول بچھائے اور بدلے میں مجھے اور میرے شوہر کو کانٹے ملے۔

•......•......•

حالات نے پھر پلٹا کھایا اور میرے شوہر کے کاروبار میں زبردست نقصان ہوا۔ جمع کچھ نہ تھا' وہ سب کما کر ساس کے ہاتھ پر رکھتے تھے' وہ خرچ کردیتیں۔ میرے شوہر اپنا جیب خرچ بھی لٹا دیتے' جب کاروبار میں نقصان ہوا تو ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب باقاعدہ میرے سسرالیوں نے مجھ سے لڑائی جھگڑے شروع کر دیئے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر مجھ سے لڑتے، میں پریشان ہو جاتی۔

ایک دن میرے شوہر کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے۔ میں بچوں کے ساتھ گھر میں کام میں مصروف تھی کہ میرے ساس، سسر نے چھوٹی سی بات کو بتنگڑ بنا کر مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں جب سن سن کے تھک گئی تو میری ہمت برداشت جواب دے گئی اور میں نے صلح کی خاطر روتے ہوئے اپنی خدمتیں بیان کرنا شروع کیں۔ میرے ساس، سسر سے یہ بات برداشت نہ ہو سکی اور انہوں نے نجانے کیوں مجھے، میرے بچوں کے ساتھ گھر سے نکال دیا۔

میں اس اچانک افتاد سے گھبرا گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی حالانکہ میں نے تو کبھی ان سے بدتمیزی بھی نہیں کی تھی پھر ان لوگوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میرے ساس سسر اس حد تک گر گئے کہ انہوں نے ایک پل کے لیے بھی نہ سوچا کہ میں اس بھری دوپہر میں جوان بچی اور چھوٹے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ میری امی کا تو پانچ برس قبل انتقال ہو چکا تھا۔ میں ایک دم خود کو تنہا محسوس کرنے لگی۔ میری حالت اس درخت کی طرح تھی جو عمر بھر اپنے مالک کو سایہ اور پھل دیتا رہا اور جب اس پر خزاں آ گئی تو اس کے مالک نے اسے جڑ سے کاٹ دیا۔

''یاالٰہی! میں کیا کروں، اس وقت کہاں جاؤں؟ جوان بچی ہے، چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔'' میری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ اپنی ناقدری پر، اپنی بے بسی پر۔

میں چل پڑی اور اپنی اماں کے گھر جانے کے لیے بس میں سوار ہو گئی۔ اب وہی میرا آخری سہارا تھیں۔ سگی ماں تو نہ تھیں، پر انہوں نے مجھے پالا تھا اور بہت چاہتی تھیں، وہ بھی اُن دنوں ابا کے ساتھ اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتی تھیں کیونکہ ان کا لاڈلہ اور اکلوتا بیٹا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ گھر میں رہتا تھا۔ جب میں پریشان حال اماں کے گھر پہنچی تو پہلے تو وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر ٹھٹک گئیں پھر خوشی سے مجھے گلے لگا لیا۔

''کیسی ہے میری بچی......؟ بڑے دن سے چکر لگایا، لگتا ہے تو بھی ہمیں بھول گئی ہے، آتی ہی نہیں ہے؟'' وہ آبدیدہ ہوتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔ جواباً میں نے انہیں سب کچھ کھل کر بتا دیا کہ میں یہاں کس طرح آئی ہوں۔ ساری بات سن کر وہ ششدر رہ گئیں۔

''تیرے ساس سسر کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ جوان بچی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ تجھے گھر سے نکال دیا اور وہ بھی تیرے شوہر کی غیر موجودگی میں، انہیں ذرا شرم نہ آئی؟'' وہ اپنا غصہ نکالتی رہیں اور میں روتی رہی پھر مجھے چپ کرانے لگیں۔ ''نہ رو میری بچی......! تیرے اماں، ابا ابھی زندہ ہیں، یہ گھر آج بھی تیرا ہے تو جب تک چاہے، یہاں رہ سکتی ہے تو ہمارے اوپر بوجھ نہیں ہے، آرام سے رہ۔''

میں، اماں کے گھر ریاض کا انتظار کرنے لگی۔ میں جانتی تھی، حالات جاننے کے بعد وہ، مجھے اور بچوں کو ڈھونڈتے سیدھے وہیں آئیں گے اور یہی ہوا بھی، ریاض رات آٹھ بجے واپس آئے۔ میں انہیں دیکھتے ہی رونے لگی۔ وہ بھی مجھے بجھے بجھے سے لگے۔ انہوں نے مجھ سے تفصیل پوچھی، میں نے بتا دی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور زندگی میں پہلی بار میں نے انہیں روتے دیکھا۔

اماں نے انہیں چپ کرایا تو وہ بولے۔ ''آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ا دل ٹوٹ گیا' میں ہمیشہ اپنے گھر والوں کے تھ رہا' میری بیوی نے ہر دکھ سکھ میں میرا ساتھ ۔ ان گھر والوں کے لیے میں نے اور میری بیوی نے کتنی قربانیاں دیں' انہیں اپنا سمجھا لیکن آج انہوں نے میرے سارے بھرم کو مٹی میں ملا دیا۔ میں نے ھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرے والدین کبھی ایسی کت بھی کر سکتے ہیں۔'' وہ ٹوٹے لہجے میں بول ہے تھے۔

''چلو شائستہ! اس طرں اماں کے گھر رہنا ٹھیک یں ہے' ہم کچھ بھی بندوبست کرلیں گے۔'' یہ سننا ا کہ اماں ناراض ہوگئیں۔

''اگر آج تم لوگ اس طرح واپس گئے میرے مرنے میں بھی نہ آنا۔'' ان کی آنکھوں میں نسو بھرے تھے۔ میں نے ریاض کی طرف دیکھا' ہ تحمل سے اماں کو سمجھانے لگے۔

''اماں......! دیکھیں' آپ میری بات کو سمجھیں' یہاں اس طرح رہنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ آپ تو جانتی ہیں' میں کبھی اپنے سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اگر شائستہ اور بچے آپ کے پاس رہ جائیں تو کوئی بات نہیں' میں کہیں بھی رہ لوں گا۔ جب کوئی کرائے کا گھر مل جائے گا تو میں اِن کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ ابھی فی الحال آپ مجھے جانے دیں۔'' ریاض اپنی بات ختم کرکے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اماں نے شکوہ بھری نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا۔

''کر دیا ناپرایا ایک پل میں اپنی اماں کو؟''

''نہیں اماں......! ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں جلدی سے بولی۔

''ارے' تم کو جہاں جانا ہے' جاؤ' میرا مرا منہ دیکھو گے اگر ابھی گئے تو اب فیصلہ کرلو۔'' وہ اٹھ کر کمرے سے جاتے ہوئے بولیں۔

ریاض مجھ سے بولے۔ ''اس طرح اماں کو ناراض مت کرو' میں جلد از جلد کوئی کرائے کا مکان دیکھتا ہوں' تم بھی کوشش کرو لیکن ہم گھر وہیں لیں گے جہاں میرے ماں باپ رہتے ہیں۔'' میں نے اطاعت میں سر جھکا دیا۔

پندرہ دن کے اندر اندر ہم کرائے کے گھر میں شفٹ ہوگئے۔ ابھی مجھے یہاں شفٹ ہوئے دو ہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ میری نند جنہوں نے بچپن میں میری بیٹی کو مانگ لیا تھا' آندھی طوفان کی طرح میرے گھر آئیں اور کھڑے کھڑے بولیں۔

''ہاں بھئی' تمہیں اپنی بیٹی کی منگنی برقرار رکھنی ہے یا میں اپنے بیٹے کے لیے دوسری لڑکی دیکھ لوں؟'' ان کے تیور مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے' میں کانپ کر رہ گئی۔ انہوں نے اس طرح اچانک یہ بات کہہ دی' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس بات کا ان کو کیا جواب دوں؟

''باجی......! آپ بیٹھیں تو آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ کیا آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے؟ جو بات ہے' آپ کھل کر بولیں۔'' میں تحمل سے بولی۔

''نہیں...... مجھے کوئی بات نہیں کرنی ہے' تم بتاؤ' ویسے بھی میرے بیٹے کو تمہاری بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ یہ منگنی توڑ دوں۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔

''باجی......! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں' ریاض کو آجانے دیں پھر ان سے بیٹھ کر بات کریں۔'' میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

''ارے' مجھے کوئی بات نہیں کرنی ہے' میں فیصلہ کر چکی ہوں بلکہ میں نے لڑکی بھی پسند کرلی ہے' صرف تمہیں بتانے آئی تھی۔ اب تم خود بھائی صاحب کو بتا دینا' میں جا رہی ہوں۔'' وہ جانے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے پلٹیں۔ میں ان کے پیچھے دوڑی۔
''باجی......! بیٹھیں تو میری بات تو سنیں۔''
لیکن وہ سنی' ان سنی کرتی ہوئی نکلتی چلی گئیں اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میری بیٹی کی اس منگنی کے بارے میں سب جانتے تھے۔ اب اس کے لیے جو مشکلات کھڑی ہوتیں' وہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ لوگ کیا سوچیں گے کہ ضرور لڑکی میں کوئی خرابی ہوگی جبھی پھوپی نے بچپن کی منگنی توڑ دی۔ رات کو ریاض تھکے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ہمت ہی نہیں ہورہی تھی انہیں کچھ بتانے کی لیکن بتائے بغیر چارہ بھی نہ تھا' سو اپنی ہمت مجتمع کرنے لگی اور الفاظ کے تانے بانے بُننے لگی۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ریاض کو اتنی بڑی بات کیسے بتاؤں؟ میری اضطراری کیفیت کو ریاض نے بھانپ لیا۔
''کیا بات ہے' کوئی ضروری بات کرنی ہے مجھ سے؟'' وہ ٹٹولتے لہجے میں بولے۔
''ہاں' میں آپ کے لیے کھانا گرم کرکے لاتی ہوں۔'' میں کچن کی طرف چل دی۔ وہ منہ ہاتھ دھوکر لوٹے۔ میں نے کھانے کی ٹرے ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ کھانے لگے۔
''ہاں' اب بتاؤ' کیا بات ہے؟''
''وہ...... دراصل آج باجی آئی تھیں۔''
''اچھا' خیریت؟'' وہ ٹھٹک کر رک گئے۔
''ہاں' وہ چاہتی ہیں کہ اپنے بیٹے شاہد کی منگنی ہماری سعدیہ سے توڑ کر کہیں اور کردیں۔''
''کیا......؟ اتنی بڑی بات وہ اتنی آسانی سے کرکے چلی گئیں؟'' ریاض کو جلال آگیا' بات ہی ایسی تھی۔
''تم نے کچھ کہا نہیں' کچھ پوچھا نہیں' اس نے یہ حرکت کیوں کی؟''
''میں کیا پوچھتی' وہ تو فیصلہ کرکے آئی تھیں' بیٹھیں بھی نہیں' بس بات کرکے یہ جا' وہ جا۔''
''اچھا' اب بھائی غریب ہوگیا ہے نا اور اس کے پاس اب دولت بھی نہیں ہے تو وہ غریب کی بیٹی لے کر کیا کرے گی؟ خیر' تم پریشان مت ہو۔ اللہ وارث ہے۔ ہماری بیٹی کو انشاء اللہ' اس سے اچھا گھر ملے گا۔'' وہ یقین سے بولے۔
''انشاء اللہ!'' میں نے صدقِ دل سے آمین کہا۔ یوں اپنے سسرالیوں کا یہ وار بھی میں چپ چاپ سہہ گئی۔
دن گزرتے رہے اور اللہ کے فضل و کرم سے میں نے اپنی بیٹی کی شادی ایک نہایت اچھے گھر میں کردی لیکن اس شادی میں باوجود بلانے کے' میرا کوئی سسرالی رشتے دار شریک نہ ہوا اور میں نے اکیلے ہی سارے انتظامات کیے پھر میری دوسری بیٹی کی شادی کا موقع آیا۔ اُن دنوں میرے حالات بہت بدتر تھے' سسرالی رشتے داروں سے تو شرکت کی بھی امید نہ تھی' جہیز بھلا کیا خاک دیتے۔
میں نے جن لوگوں کی ہر خوشی کا ہر پل خیال رکھا تھا' اپنی ضرورت پر ان کی خوشی کو مقدم رکھا تھا اور جن کی شادیاں میں نے اور میرے شوہر نے اپنے ہاتھ سے کی تھیں' مجھے پکا یقین تھا کہ یہ لوگ مجھے میری بچیوں کی شادی میں اکیلا نہیں چھوڑیں گے' یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ لوگ شرکت بھی نہیں کریں گے۔ میری بیٹی کی شادی میں صرف محلے والوں نے شرکت کی' خاندان کا کوئی فرد شامل نہ تھا۔ اُس دن میں اور میرے شوہر ٹوٹ کر رہ گئے۔
ریاض اپنے بہن بھائیوں سے بہت پیار کرتے تھے' وہ سب کو یاد کرکے اکثر روتے تھے۔ میں اپنے بچوں کی چار شادیوں سے فارغ ہوگئی۔ اس عرصے میں کسی سے بھی میری خوشیوں میں شریک ہونے کی توفیق نہیں ہوئی پھر میری نند کے گھر شادی کا موقع

...اور وہ اپنے بیٹے کا کارڈ لے کر ہمارے گھر آئیں ...ن کھڑے کھڑے ہی۔
''یہ لو' شاہد کی شادی کا کارڈ ہے۔ اگر آنا چاہو تو ...انا۔'' انہوں نے کارڈ میرے آگے رکھا۔
''بہت بہت مبارک ہو۔'' میں کھلے دل سے بولی۔
''ہاں' تم کو بھی' اچھا' میں چلتی ہوں۔'' وہ فوراً پلٹیں۔
''بیٹھیں تو سہی۔'' میں نے روکنا چاہا۔
''نہیں' ابھی بہت ساری جگہوں پر جانا ہے۔ ...احافظ!'' اور وہ چلی گئیں۔ میں ان کے رویّے پر ...ان رہ گئی' بھلا کوئی کسی کو اس طرح بلاتا ہے شادی ...اور وہ بھی اپنے بھائی بھاوج کو؟
میں نے ریاض کو بتایا' انہوں نے صاف انکار ...ردیا جانے سے۔
''میں یا کوئی بھی اس شادی میں نہیں جائے گا ...لا اس طرح بلایا جاتا ہے اپنے بھائی کو کہ آنا چاہو تو ...جانا؟ اور پھر میری بیٹیوں کی شادی میں یہ سب کہاں ...ے؟ سب نے مجھے اکیلا کردیا۔'' ریاض یہ کہتے کہتے ...پڑے' میری آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی۔
میرا ظرف دیکھیے کہ جب بھی مجھے اپنے سسرال ...ں کسی کی بیماری کی اطلاع ملتی' میں فوراً دوڑی چلی ...اتی عیادت کرنے حالانکہ مجھے وہاں کوئی عزت و ...قیر نہ ملتی لیکن میں اپنے دل سے مجبور تھی۔ ریاض کو ...ھی ساتھ چلنے کو کہتی لیکن وہ ٹال جاتے' میں جانتی تھی ...کہ وہ اپنے بہن بھائیوں کے لیے تڑپتے ہیں لیکن ...یں کیا کرتی' کیسے ملاتی انہیں جبکہ ان کے بہن ...ھائیوں نے انہیں بلاوجہ دودھ میں سے مکھی کی طرح ...کال پھینکا تھا؟ میری نظروں میں وہ دن پھر جاتے ...جب ریاض اپنی بہنوں کے ناز نخرے اٹھایا کرتے ...تھے مگر انہیں اس کا کیا صلہ ملا؟
اکیلا پن...... نفرتیں...... دوریاں......
میں ان کا دکھ سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی اور دُعا کرتی کہ وہ دن پھر لوٹ آئیں۔ اتنا سب ہونے کے باوجود بھی میرے دل میں کسی کے لیے نفرت یا کدورت نہیں تھی۔ میں تو شروع سے مل جل کر رہنے کی قائل تھی اور میں نے یہ ثابت بھی کیا' میں نے سب کی ہر خوشی میں شرکت کی' جتنا سب مجھ سے دور ہوتے' میں اتنا ہی دلی طور پر ان سے قریب ہوتی۔
تھوڑے عرصے بعد میں نے کوشش کرکے ریاض کو ان کی بہنوں سے ملوا دیا۔ اس دن ان کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لگتا تھا کہ انہیں کوئی گمشدہ دولت مل گئی ہو۔ میں ان کی خوشیاں دیکھ کر نہال ہوگئی اور رَب سے دُعائیں کرنے لگی۔
''یارَب! میرے شوہر کو اس سے زیادہ خوشیاں دیکھنا نصیب فرما۔ (آمین!)''
لیکن یہ خوشیاں بھی میرے شوہر کو اور مجھے راس نہ آئیں۔ بہنوں سے بڑے ہونے کے باوجود میں اور ریاض ان سے خود ملے لیکن وہ لوگ شاید ہم سے اب کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتے تھے اسی لیے ہمارے جانے کے باوجود وہ لوگ ہمارے گھر نہیں آئیں۔
وہ ساس' سسر جنہوں نے میرے ساتھ ہر طرح سے ظلم و ستم روا رکھے اور مجھے گھر سے بھی نکال دیا' ان کے آخری وقت میں ان کے سرہانے میں اور میرے شوہر ہی تھے۔ اس وقت میرے ساس' سسر شرمندہ تھے۔
آج بھی مجھ سے کوئی نہیں ملتا ہے لیکن میری حقیقت جو بھی جانتا ہے' وہ میری سسرال میں خدمت و قربانی کو دہراتا ہے اور میرے لیے یہی بہت ہے۔ دُعا ہے کہ کبھی نہ کبھی ریاض کے بہن بھائی جن پر وہ جان دیتے ہیں' ریاض کی محبت سے کھنچے چلے آئیں۔ (آمین!)
مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا' انشاء اللہ!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY SUNDAY AT 8:00PM
ہوئے بیگانے کیوں
PRESENTS

ٹینا مخدوم

یہ ہے زندگی کا فیصلہ

رسا چغتائی کا خیال

ایک آنسو، ایک لمحہ، ایک خواب
ہم ہیں اور گرتی ہوئی دیوارِ شب

زندگی کے فیصلوں میں اوپر والے کو شامل کرنے والوں کی روداد

دل اور دماغ کے بیچ ہونے والی جنگ بھی عجیب ہوتی ہے۔ اس جنگ میں جیت بھی اپنی ہوتی ہے اور ہار بھی اپنی۔ اندر ہونے والی ہار کبھی کبھی پوری زندگی ہارنے کے برابر ہو جاتی ہے۔ میرے اندر بھی صبح سے ایک جنگ جاری تھی۔ دل کچھ کہتا اور دماغ کسی اور بات پر بضد تھا۔ کیا کروں کیا نا کروں یہی سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ گھر میں کوئی ایک فرد بھی تو ایسا نہیں تھا جو میرا دکھ سمجھ سکتا جسے میری پرواہ ہوتی۔ سب کو صرف عدیل بھائی کا دکھ اور اکیلا پن نظر آ رہا تھا۔ اگر کسی کو پرواہ ہے تو فروا اور سنی کی جنہوں نے ابھی اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟ یہی کچھ سوچتے سوچتے اچانک جیسے میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا اور ہر طرف دھواں سا پھیل گیا چند لمحے میرے ہوش و حواس باقی نا رہے پھر آہستہ آہستہ غبار ڈھلا تو مجھے سب صاف دکھائی دینے لگا اور میرے دل اور دماغ نے ایک ہی فیصلہ کیا کہ نہیں اب مزید ''اُترن'' نہیں چاہیے۔

☆......☆

ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ابا جان نمازی، پرہیزی اور سادہ لوح شخص ہیں۔ کبھی کل کا نہیں سوچا۔ جو آج ہے، کھالو۔ کل کے لیے اللہ پر توکل کرو۔ ان کا یہی فلسفہ رہا۔ امی کی دو سال پہلے ڈیتھ ہو گئی۔ ان کی زندگی میں صرف باجی کی ہی شادی ہوئی باقی سب کی شادی کا خواب آنکھوں میں سجائے اور بیماریوں سے لڑتے لڑتے وہ ہار گئیں۔ باجی کے بعد میں یعنی حنا اور پھر تیسرے نمبر پر آصفہ تھی۔ سب سے چھوٹا بھائی جو ہم سے بھی بڑا لگتا تھا، ابا کی خواہش کے مطابق L.L.B کر رہا تھا ہم بڑی دونوں بہنوں نے انٹر تک ہی پڑھا تھا۔ باجی کی شادی کے بعد میں گھر داری میں لگ گئی۔ آصفہ B.A کر رہی تھی۔ ابا روز صبح کو نکلتے تو رات کو واپس آتے۔ کھانا بھی دکان پر ہی منگوا لیتے۔ ابا کی ایک بڑی

WATCH EVERY Fri-Sat AT 8:00PM
انوکھی
PRESENTS



پرچون کی دکان تھی جس میں اللہ نے بہت برکت دی تھی۔ ابا تھے بھی بڑے نیک کبھی تہجد تک نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ بچے بھی سب نیک نمازی ہوں پر ان کی یہ خواہش اتنی زیادہ پوری نہ ہو سکی۔ بچوں میں صرف میں ہی پانچ وقت کی نماز پڑھتی تھی۔ باقی سب جمعہ کو ہی یہ فرض ادا کرتے تھے۔

خیر، زندگی صبر و شکر کے ساتھ گزر رہی تھی۔ باجی کی شادی اچھے گھرانے میں ہوئی تھی۔ وہ لوگ کافی امیر تھے۔ ابا کو باجی کی طرف سے بڑا اطمینان تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ میری باقی دونوں بیٹیوں کا نصیب بھی بڑی کی طرح کرے اور ہم ابا کی اس دعا پر دل ہی دل میں آمین کہہ دیتے۔ باجی اپنی گاڑی میں آتیں تو محلے کی عورتیں اپنے دروازوں سے جھانک جھانک کر دیکھتی تھیں۔ ہم باجی کے گھر جاتے تو بڑا مزا آتا۔ اتنا بڑا گھر، بڑا سا لان جس میں رنگ برنگ پھول اور اچھے اچھے کھانے لیکن ابا ہمیں بہت کم ہی وہاں جانے دیتے تھے۔ میں اکثر نماز میں یہی دعا کرتی کہ میری شادی بھی ایسے ہی کسی امیر گھر میں ہو، پر اس دل کا کیا کرے جو اچانک ہی علی رضا نے چُرا لیا تھا وہ ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔ ہم بچپن سے ساتھ ہی کھیلے تھے پھر کافی عرصہ کے لیے وہ غائب ہو گیا تھا۔ اس کے گھر والوں نے اُسے کسی اور شہر میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اتنے سالوں میں، میں بھی اُسے بھول گئی تھی کہ علی رضا نام کا کوئی لڑکا ہمارے ساتھ کھیلا ہے پر ایک دن اچانک ہی میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

کالج میں وہ میرا آخری دن تھا دل کافی بوجھل تھا کیوں کہ ابا نے منع کر دیا تھا کہ باجی نے بھی انٹر کیا ہے تو تم بھی اب گھر داری سیکھو اور گھر کو سنبھالو کیوں کہ ان دنوں باجی کی شادی ہونے والی تھی۔ جیسے ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں دکھی دل کے ساتھ اپنی گلی میں مڑی وہ میرے سامنے بالکل قریب آ گیا تھا میں نے سنبھلتے ہوئے نظریں اٹھائیں تو وہ مسکرا رہا تھا۔

''حنا' تم......'' میں نے اپنا دوپٹا درست کیا جو سر سے اتر گیا تھا۔

''ارے' اتنی بڑی ہوگئی ہو۔''

''کیا فضول بات کر رہے ہو' اتنے سال گزر گئے تو کیا میں بونوں کی نسل میں سے ہوں کہ اُتنی ہی چھوٹی رہوں۔'' میں نے چڑ کر کہا تو وہ مسکرانے لگا۔ اس وقت ایک تو میں اداس تھی اوپر سے اس کا مسکرانا مجھے زہر لگ رہا تھا میں کنی کترا کر تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھی پر اس کا آخری جملہ میرے کانوں میں ضرور پڑا ''آج بھی مرچی چبا رہی ہو بچپن کی طرح'' گھر آ کر میں نے ٹھنڈا پانی پیا کچھ سانس بحال ہوئی تو اپنے رویے پر شرمندگی ہونے لگی کہ آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا کہ میں نے اتنا بگڑ کر جواب دیا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد میں نے اسے دیکھا تھا وہ بچپن میں دبلا پتلا سا تھا اب اچھا خاصا ہنڈسم ہوگیا تھا کہ میں اسی کے بارے میں سوچنے لگی۔ ویسے تو میں بھی صورت کی اتنی بری نہیں تھی بس بچپن سے ہی احساس کمتری کا شکار ہوگئی تھی شاید اسی وجہ سے طبیعت میں تھوڑی تیزی آ گئی تھی۔

باجی بہت خوبصورت تھیں۔ سرخ و سفید رنگت، لمبے بال، قد بھی اچھا تھا جبکہ میں ان کے مقابلے میں اتنی خوبصورت نا تھی اس لیے جو بھی ہم دونوں کو دیکھتا' باجی کی تعریف کچھ زیادہ ہی کر دیتا ہماری امی کافی سادہ مزاج کی تھیں۔ عورتوں کی باتیں سن کر ان کو لگتا تھا کہ میں واقعی بدصورت اور باجی کی نوکرانی لگتی ہوں جس کا اظہار وہ اکثر کر دیا کرتی تھیں اور میں رونے لگتی۔ شاہد یہی وجہ تھی کہ میں کافی تنہائی پسند ہوگئی تھی گھر میں مجھے سب سے الگ رہنا اچھا لگتا تھا۔ زیادہ تر خاموش رہتی اور چھوٹی چھوٹی سی بات پر چڑ جاتی جبکہ کالج میں میرا بالکل الگ رویہ ہوتا وہاں پر میں بہت خوش اخلاق مشہور تھی۔ پڑھائی میں بھی کافی اچھی تھی پوزیشن ضرور لاتی جس پر گھر میں سوائے ابا کے کوئی خوش نہ ہوتا۔ آصفہ کی زیادہ تر باجی سے ہی بنتی تھی۔ بھائی کی امی کے ساتھ گھٹتی اور میں گھر میں صرف ابا کو ہی اپنا خیر خواہ سمجھتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی عید کے علاوہ مجھے کوئی نیا سوٹ ملا ہو ہمیشہ باجی کے ہی وہ کپڑے جو چھوٹے ہو جاتے یا پھٹ جاتے تو امی انہیں دوبارہ درست کر کے مجھے دے دیتیں پہلے پہل تو میں نے اترن پہننے سے اعتراض کیا تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ میرے پاس بہت کم کپڑے ہیں تو رفتہ رفتہ میں نے ان کو استعمال کرنا شروع کر دیا پھر جیسے ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا' باجی کے کپڑے، باجی کے سینڈل، میک اپ جیولری سب ہی چیزیں ان کی مجھے ملتیں اور میں نے بھی سمجھوتہ کر لیا کہ شاید ہر گھر میں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ مجھے اترن پہننے کی عادت ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار تو میری فرینڈز بھی ٹوک دیتی تھیں کہ یار تو اپنے گھر میں سوتیلی ہے کیا جو ہمیشہ اپنی باجی کی چیزیں ہی تجھے پہننی پڑتی ہیں اور میں خاموش رہتی کیا بتاتی کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے انہیں ہر چیز نئی مل جاتی ہے اور وہ کسی شہزادی کی طرح وہ چیزیں استعمال کر کے مجھے بھیک میں دے دیتی ہیں۔ بہرحال یہ سلسلہ چلتا ہی رہا پھر باجی کی شادی ہوگئی۔ میں خوش تھی کہ چلو اب میری جان چھوٹی اب میں نئی چیزیں استعمال کر کے آصفہ کو دوں گی پر ایسا کچھ نہیں ہوا آصفہ کو تو ہر چیز نئی مل جاتی کیوں کہ اس کا قد کاٹھ مجھ سے چھوٹا تھا جبکہ باجی اور مجھے شاید قدرت نے اسی لیے ایک جیسا قد اور پیر کا ناپ بھی برابر دیا تھا تا کہ ان کی اترن میں آسانی سے استعمال کر سکوں۔ ان کی شادی کے بعد

بھی میں ان کی اترن ہی استعمال کرتی تھی پر اب مجھے اتنا برا نہیں لگتا تھا ایک تو وہ اب قیمتی کپڑے اور سینڈل استعمال کرتی تھیں اور دوسرا وہ الگ رہتی تھیں جس کی وجہ سے میری دوست یا محلے والی کسی کو پتا نا چلتا کہ یہ چیزیں میری ہیں یا باجی کی دی ہوئی۔

امی کے انتقال کے بعد میں اور بھی چپ چپ ہوگئی تھی گھر کی ساری ذمہ داری مجھ پر آ گئی تھی پر آج جب علی رضا کو دیکھا تو جیسے زندگی کو ایک نئی راہ مل گئی تھی۔ شام کو میں چھت پر کسی کام سے گئی تھی۔ ہمارے گھر کی چھت اور علی رضا کے گھر کی چھت ایک ساتھ تھیں۔ میری نظر ان کی چھت پر پڑی وہ ایک موٹی سی کتاب پکڑے مجھے ہی دیکھ رہا تھا میں خفیف سا مسکرائی تو جیسے اسے ہمت مل گئی وہ اٹھ کے قریب آ گیا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں اور تم؟'' میں نے بھی رسماً پوچھ لیا۔

''ارے' کیا بتاؤں بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگا ہوں تمہیں تو پتا ہے ابو میرے یہاں رہنے اور پڑھنے کے حق میں بالکل نہیں تھے لیکن میں نے بھی سوچ لیا کہ سی ایس ایس کا امتحان میں اپنے ہی شہر جا کر دوں گا۔ دعا کرو میری تیاری اچھی ہو جائے اور میں یہ ایگزام پاس کر لوں'' اس کی لگن دیکھ کر واقعی میرے دل سے دعا نکلی تھی۔

''اگر پڑھائی اسی محنت سے کرو گے تو انشاءاللہ' ضرور پاس ہو جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر میں نیچے آنے لگی تو اس نے روک لیا۔

''سنو۔'' میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یار' تم واقعی بڑی ہوگئی ہو اور خوبصورت بھی'' آخری الفاظ اس نے کچھ آہستہ بولے تھے اور میرا دل جیسے بلیوں اچھلنے لگا۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ وہ اتنا ہینڈسم ہوگیا ہے اور اتنا زیادہ پڑھ لکھ گیا ہے' ضرور اس کی پسند بھی ویسی ہی بڑی ہوگی۔ کوئی امیر ماں باپ کی گاڑیوں میں گھومنے والی لڑکی۔ میں شرماتی ہوئی نیچے اتر آئی تھی جانے کیوں ایک دم سب کچھ مجھے اچھا اچھا لگ رہا تھا نیچے آئی تو ابا نے کہا کہ آصفہ باجی کے گھر جا رہی ہے اگر تو بھی جانا چاہے تو چلی جا' پر میرا دل نہیں کر رہا تھا سو انکار کر دیا آصفہ نے کچھ حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

اب چھت پر میرا باقاعدگی سے جانا معمول بن گیا تھا۔ بس شام کا انتظار ہوتا تا کہ تھوڑی دیر ہی سہی' علی رضا سے بات کر سکوں۔ اس سے باتیں کر کے تمام دن کی تھکن اتر جاتی تھی۔ تقریباً دو ماہ ہوگئے تھے میں باجی کے گھر نہیں گئی تھی۔ باجی بھی حیران تھیں۔ باجی اور عدیل بھائی آئے تب بھی میں زیادہ تر اپنے خیالوں میں ہی گم رہتی اور ویسے بھی باجی کو کون سا ہماری پرواہ تھی' وہ تو عدیل بھائی اصرار کر کے لے آتے تھے۔ وہ طبیعتاً بڑے اچھے تھے اور باجی پیسہ دیکھ کر بدل گئی تھیں۔ شادی سے پہلے کہتی تھیں کہ جاتے ہی حنا کے لیے رشتے دیکھوں گی اور اس کی شادی بھی کسی اچھے خاندان میں کروادوں گی پر اب ان کے دو بچے ہوگئے تھے۔ فروا اور چھوٹا سنی۔ اب تو ان کو یہ یاد بھی نا رہا تھا کہ امی نہیں ہیں' کون ہم دونوں بہنوں کا سوچے گا؟ بس جب بھی آتیں تو اپنی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا رونا روتیں یا مصروفیت کے قصے سناتیں اب اتنا تو ہم بھی سمجھتے تھے کہ چار پانچ نوکروں کے ہوتے ہوئے وہ کتنا مصروف رہتی ہوں گی خیر میں نے تو اب ان سے امید رکھنا چھوڑ دی تھی اتنا تک نہیں ہوتا تھا کہ کبھی فون کر کے ہی پوچھ لیں اس لیے اب میں بھی بہت کم ہی ان سے بات کرتی آصفہ کو وہ اکثر فون کر کے بلوا لیتیں کہ فروا اور سنی کو سنبھالنا ہے میں پارٹی وغیرہ میں جا رہی ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک دو بار ابا نے بھی کہا۔ ''گھر میں اتنی نوکرانیاں ہیں اور سب سے بڑھ کر تمہاری ساس موجود ہے' وہ بچوں کو سنبھال لے گی۔'' مگر باجی کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ''میں بچوں کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔'' آصفہ تو بہت خوش ہوتی اسے تو بس موقع چاہیے ہوتا تھا باجی کے گھر جانے کا۔ بھائی بھی زیادہ تر ابا کی دکان پر ان کا ہاتھ بٹاتے یا پڑھائی کرتے تھے۔ یوں علی رضا ہی میرے لیے سب کچھ بن گیا میں اس کے ساتھ اپنی ساری باتیں شیئر کرتی اور وہ مجھے اچھے اچھے مشورے دیتا کبھی اگر میں اداس ہوتی تو مجھے اتنا ہنساتا کہ میں بھول ہی جاتی کہ میں کس بات پر اداس تھی۔ مجھے اس نے کافی اچھی اچھی کتابیں لا کر دیں کہ اپنا ٹائم الٹی سیدھی سوچوں میں پاس نہ کیا کرو بلکہ اچھی کتابیں پڑھا کرو۔ اور میں سمجھتی ہوں یہ اس کا مجھ پر بڑا احسان تھا کہ مطالعے سے میں کافی سمجھدار اور باشعور ہو گئی۔ وہ اکثر مجھے سمجھاتا کہ گھر میں بیٹھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بندہ دنیا سے غافل ہو جائے اپنی ذات کو بھول جائے۔ خود پر توجہ دو۔ ٹی وی پر صرف ڈرامے اور فلمیں ہی نہیں نیوز اور معلوماتی پروگرامز بھی دیکھو۔ اس کی انہی سب باتوں نے مجھ پر گہرا اثر کیا اور میں واقعی ویسا ہی کرنے لگی جیسا وہ کہتا۔ میں جو اچھا پروگرام دیکھتی' اسے بتاتی اور وہ مختلف موضوعات پر مجھ سے بحث کرتا۔ مجھے مزید ان کے بارے میں بتاتا۔ اکثر کہتا کہ مجھ سے مختلف ٹاپک پر بحث کیا کرو اچھی دلیل دو مجھے اپنی بات پر قائل کرو مجھے پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہا تھا پر اتنا ضرور مجھے لگتا کہ دن بدن میرا ذہن کھول رہا تھا۔ میں وہ تھی جو کبھی اپنے حق کے لیے ایک لفظ نہ بول پاتی۔ کوئی زیادتی ہوتی تو گھنٹوں اس پر چپکے سے روتی رہتی۔ سارا دن چپ چاپ گھر میں پڑی رہتی اور بے مقصد وقت گزارتی

لیکن آج جب میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں وہ اندر پاس، ڈرپوک اور کم گو حنا ہوں ہی نہیں۔ اب اگر کوئی مجھ سے ملتا تو یہی سمجھتا کہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہوں۔ لوگوں کی رائے پر مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ ذہین تو میں اسکول اور کالج میں بھی تھی بس اعتماد نہیں تھا۔ آج میں جو بھی تھی صرف علی رضا کی وجہ سے۔ وہ عام لڑکوں کی طرح ہرگز نہیں تھا کہ سارا وقت پیار محبت کی باتیں کرے بلکہ یوں کہا جائے کہ آج تک اس نے مجھ سے کھل کر اظہار ہی نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھار وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں ایسا کچھ کہہ دیتا جس سے اس کے اندرونی احساسات کا اندازہ ہو جاتا پر وہ بہت سمجھ دار تھا۔ کبھی کبھار میں سوچتی کہ اتنی محنت تو شاید ایک ٹیچر بھی اپنے اسٹوڈنٹ پر نہیں کرتا کہ جتنی علی رضا نے مجھ پر کی۔ پہلے پہل تو وہ میری باتوں پر صرف ہنستا تھا پھر بہت ہی پیار سے سمجھا دیتا۔

''آج کے دور میں اتنی سادگی اچھی نہیں، تمہیں خود کو بدلنا پڑے گا تب ہی تم کامیاب ہو گی کل کو اگلے گھر جاؤ گی تو ساس اور نندیں تمہاری چٹنی بنا دیں گی۔'' اور میں ہنسنے لگتی۔ اتنا تو کبھی امی نے بھی مجھے نہیں سمجھایا تھا۔ وہ اکثر کوکنگ کر کے کچھ نا کچھ میرے لیے لاتا جو واقعی بہت ٹیسٹی ہوتا پھر ہم کھانوں پر باتیں کرتے۔ اب صحیح معنوں میں مجھے لگنے لگا تھا کہ دنیا واقعی خوبصورت ہے اور زندگی اتنی بھی بُری نہیں کہ اسے صرف جیا جائے۔ ایک طرح سے میں نے اپنی ایک الگ دنیا بسالی تھی لیکن شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔



''کتنے دن لگیں گے واپس آنے میں؟''

''پتا نہیں۔'' وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اداس ہوں پر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کہیں میں کھل کر ہی نا

رو دوں۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ مجھے ذرا ذرا سی بات پر رونے والی بزدل لڑکیاں پسند نہیں اور نہ جانے آج کہاں سے وہی پرانی حنا مجھ میں لوٹ آئی تھی میں رونا نہیں چاہتی تھی لیکن ضبط کر رہی تھی۔

''بس ایک ماہ کی ہی بات ہے'' اس نے بڑے نارمل انداز میں کہا جیسے کوئی بات ہی نا ہو۔ ''اچھا جب تک میں واپس آؤں تم وہ ساری کتابیں پڑھ کر ختم کر دینا ایسا نہ ہو کہ پچھلی بار کی طرح لائبریرین مجھ سے لڑ پڑے'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دی۔ مجھے اس کی اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ اب اس سے بچھڑنے کا احساس بھی مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ ''اچھا میرے لیے دعا ضرور کرنا تا کہ میں پاس ہو جاؤں اور پھر حنا مجھے اتنی اچھی جاب مل جائے گی کہ دیکھنا میری گاڑی کے آگے اور پیچھے سکیورٹی والے ہوں گے۔ ایک باوردی واچ مین ہمیشہ میرے بنگلے کے سامنے کھڑا ہو گا۔'' وہ آنے والے وقت کا تصور کرتے ہوئے خوش ہو رہا تھا اور میرے دل سے واقعی دعا نکلی کہ اللہ اس کے سارے خواب پورے کر دے۔

''اور پتا ہے......'' اچانک اُسے کچھ یاد آیا۔ ''سب سے پہلے میں امی اور ابو کو حج پر بھیجوں گا۔ ان کو بڑی خواہش ہے۔'' وہ سپنوں میں اتنا کھو گیا تھا کہ میں اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔

''اچھا تم خود حج کرنے نہیں جاؤ گے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے شرارت سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''ارے نہیں بھئی' میں تو بڑھاپے میں اپنی بیوی کے ساتھ جاؤں گا۔'' میں بھی ہنسنے لگی لیکن جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں خود کو نہ روک سکی۔

''علی' جلدی آنا' پتا ہے میرا کوئی دوست نہیں ہے' بس تم ہی ہو جس کے ساتھ میں اپنے دکھ درد شیئر کرتی ہوں۔ ایک مہینہ شاید تمہارے لیے تو بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوٹا ہو پر میرے لیے بہت بڑا ہے۔ خدانخواستہ اگر کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو میں کس سے مشورہ کروں گی؟''
اس کے چہرے پر اب سنجیدگی تھی۔
''حنا' میں نے ہمیشہ چاہا ہے کہ تم ایک ایسی بہادر لڑکی بنو جسے کسی سہارے کی ضرورت نا پڑے۔ اپنے اندر اتنا اعتماد پیدا کرو کہ اپنے فیصلے خود کر سکو۔ تمہیں زندگی میں کسی بھی معاملے میں کسی کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ میرا بھی نہیں۔'' اس نے میرا پر زور دے کر کہا میرے آنسو نکل پڑے جنہیں کافی دیر سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی حالانکہ میں جانتی تھی کہ میں اس سے بے حد محبت کرتی ہوں پر یہ بات مجھے ہرگز منظور نہیں تھی کہ اظہار کرنے میں' میں پہل کروں اس لیے ہر ممکن کوشش کی کہ اس پر ظاہر نا ہونے دوں مگر آنکھوں نے غداری کر دی اور آنسو باوجود سخت کوشش کے رک نہ سکے اور ٹپ ٹپ کر گرنے لگے۔
''اچھا اب میں چلتا ہوں' صبح سویرے نکلنا ہے اور جب میں واپس آؤں تو مجھے ایک بہادر اور نڈر حنا نظر آئے جو کسی کو خاطر میں نا لائے جو اپنے فیصلے خود کرتی ہو۔'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا کہ ہاں میں گردن کو ہلایا اس نے ایک ہلکی سی چپت میرے سر پر ماری اور مڑ کر جانے لگا میرے قدم تو من من بھاری ہو رہے تھے میں ابھی دو قدم ہی آگے بڑھی کہ اس نے پھر پیچھے سے آواز دی۔
''سنو۔'' میں رک گئی اب ہمارے بیچ کافی فاصلہ تھا وہ اپنی سیڑھیوں تک پہنچ گیا تھا جو نیچے گھر کی طرف جاتی تھیں میری ساری توجہ اس کی طرف تھی'' ویسے تو مجھے روتی ہوئی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں مگر میری یہ سوچ آج بدل گئی ہے کچھ پاگل سی روتی آنکھوں والی لڑکیاں اتنی بھی بری نہیں ہوتیں'' اتنا کہہ کر وہ نیچے چلا گیا اور میں خوشی سے نہال ہو گئی۔

☆......☆

''آصفہ' تم خود ہی دیکھو یہ...... یہ تو مجھ سے بہت بڑا ہے بلکہ یہ تو تقریباً ابا کی عمر کا ہے۔ باجی نے اتنے عرصے بعد یہ رشتہ میرے لیے ڈھونڈا ہے۔''
جب آصفہ نے مجھے تصویر دکھائی جو کہ باجی نے بھیجی تھی میرے رشتے کے لیے تو میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ مجھے باجی سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ باجی نے میرے لیے کیسے اس رشتے کو پسند کر لیا تھا' میں پریشان ہو گئی تھی۔ آصفہ کو بھی یہ رشتہ اچھا نہیں لگ رہا تھا بس باجی کی وجہ سے وہ چپ تھی کیوں کہ بچپن سے ہی ان کی ہاں میں ہاں ملانا آصفہ کی عادت تھی اس بار بھی وہ مجھ سے بحث کرتی مگر شاید اسے بھی کہیں یہ لگ رہا تھا کہ واقعی میں اتنے برے سلوک کے بھی قابل نہیں یا پھر کہیں اسے یہ ڈر ہو کہ میرے بعد اس کا نمبر ہے اس کے لیے بھی پھر ایسا ہی کوئی بڈھا ڈھونڈا جائے گا۔ میں نے سختی سے منع کر دیا کہ میں اس آدمی سے ہرگز شادی نہیں کروں گی اور جیسے ہی یہ خبر باجی تک پہنچی' وہ دوڑی چلی آئیں۔
''مجھے سمجھ نہیں آتا تمہیں کس بات پر اعتراض ہے؟ عمر بھی اتنی تو بڑی نہیں اور آج کل تو دیکھو 'لڑکیاں خود چاہتی ہیں کہ بڑی ایج کا آدمی ہو جو میچور ہو' کم عمر سا جذباتی نوجوان صرف دیکھنے اور دکھانے میں اچھا لگتا ہے' اس کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب میرے پاس اتنا بھی ٹائم نہیں کہ تمہارے لیے پرنس چارلس جیسا کوئی لڑکا تلاش کروں۔ شکر کرو' آج کے دور میں ایسا امیر آدمی ایک قبول صورت اور لوئر کلاس کی لڑکی سے شادی کے لیے راضی ہوا ہے۔''
باجی کے الفاظ جیسے چھری کی طرح میری روح کو زخمی کرتے جا رہے تھے۔ وہ لیکچر جھاڑ رہی تھیں' ساتھ میں یہ بھی باور کرا دیا کہ میں کوئی حور پری نہیں کہ کسی نوجوان کا رشتہ مجھے ملے گا۔
''بس آگے تمہاری مرضی ابا کی وجہ سے میں نے بڑی مشکل سے یہ رشتہ تلاش کیا تھا کہ ابا کا کچھ بوجھ ہلکا ہو سکے پر ان کو کیا پتا کہ ان کی رانی صاحبہ کا دماغ ساتویں آسمان پر ہے پتا نہیں کون کون سی کتابیں پڑھ پڑھ کر سمجھ رہی ہے کہ کوئی شہزادہ اس سے شادی کرے گا۔'' زہر میں بجھے الفاظ سن کر میرا دماغ پھٹنے لگا۔
''باجی' جب آپ کو عدیل بھائی جیسا اچھا شوہر مل سکتا ہے تو کسی اور کو کیوں نہیں؟ اور رہی بات آپ کے اس احسان عظیم کی تو آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی مصروفیت میں سے قیمتی وقت نکال کر مجھ بدصورت اور جاہل لڑکی کے لیے اتنا اچھا رشتہ ڈھونڈا۔ اللہ نے چاہا تو میری شادی ہو گی ورنہ اپنے باپ اور بھائی کی خدمت کرتے کرتے زندگی گزار دوں گی۔'' برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے باجی کو سنادی اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی آئی کیوں کہ رونے کی عادت سے مجبور تھی اور ان کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی اس لیے آنسوؤں کو چھپانے کا یہی بہترین طریقہ تھا۔ میرے یوں جواب دینے اور اٹھ کر آ جانے سے ان کا پارہ اور چڑھ گیا اور انہوں نے مجھے کھری کھری سنائی تھیں۔ میں مسلسل روئے جا رہی تھی مگر ان کا آخری جملہ اتنا کڑوا تھا کہ میں نے اس کے بعد اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ آج علی رضا مجھے شدت سے یاد آ رہا تھا شاید وہ ہوتا تو مجھے تسلی دیتا مجھے سمجھاتا مگر ابھی تو اسے گئے ہوئے ایک ہی ہفتہ ہوا تھا باجی کے جانے کے بعد بھی میں کمرے سے نہیں نکلی۔ پتا نہیں کب روتے روتے مجھے نیند آ گئی تھی۔ کافی دیر کے بعد میں نے دروازہ کھولا میری حالت دیکھ کر ابا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ آصفہ نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔
''میری پیاری بچی' جیسا تو کہے گی' ویسا ہی ہو گا۔'' ابا نے شفقت سے میری پیشانی پر بوسہ دیا تو جیسے میرے سارے دکھ درد ہوا ہو گئے اور میں پرسکون ہو گئی۔ اس دن کے بعد باجی نے آنا جانا بالکل چھوڑ دیا۔ آصفہ، بھائی یا ابا کبھی کبھار جا کر مل آتے پر میرا دل نہیں چاہتا تھا ان سے ملنے کو کیوں کہ میں جب بھی ان کے بارے میں سوچتی تو ان کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگتے۔
''پتا نہیں کس چیز پر اس کو غرور ہے؟ دیکھنا ایک دن بوڑھی ہو کر ایسے رشتے کے لیے بھی ترسے گی شکل صورت تو ہے نہیں اور اوپر سے مجھ سے مقابلہ کر رہی ہے۔ عادل جیسا لڑکا تو اُسے خواب میں بھی نہیں ملے گا یہ تھوڑی بہت جو عزت ہے نا' یہ میری وجہ سے ہے۔ میرے کپڑے پہن کر سمجھتی ہے نصیب بھی میرے جیسا ہو جائے گا۔ آئینہ دیکھ پھر خواب دیکھ۔'' مجھے توقع نہیں تھی کہ باجی مجھے اتنا حقیر سمجھتی ہیں۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ ان سب باتوں کو بھلا دوں اور شاید علی ہوتا تو جلد ہی میں سب بھلا دیتی ۔ وہ بھی پتا نہیں کہاں کھو گیا تھا میرے پاس تو اس کا

دل کی تمنا

دل کی تمنا
ہرے شجر کی شاخ سے
میں نے......
بہت برس پہلے باندھی تھی
پر......
تمناءِ دل کہیں بہت دور
کالے اندھیروں میں گم ہوتی گئی
کہ اب تو......
ساون میں گیلے پتوں کے نیچے
آرزوءِ دل سوکھی پڑی ہوئی ہے

شفق شیکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نمبر بھی نہیں تھا کبھی لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے اپنے آپ کو کتابوں میں گم کر لیا میں مزید ان فضول باتوں کو سوچ کر اپنا وقت خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ باجی کے گھر جانا میں نے چھوڑ دیا تھا پر فروا اور سنی کی بہت یاد آتی تھی وہ معصوم بچے مجھے بہت پیارے تھے اتنے دن ہو گئے تھے میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں تھا بھائی کو کہا تھا کہ دونوں کو اپنے ساتھ لے آئیں لیکن باجی نے ان کو آنے نہیں دیا۔

علی رضا کا انتظار کرتے کرتے تین ماہ گزر گئے تھے اس کا کچھ پتا نہیں تھا گھر پر تالا تھا اور ان کے کسی رشتہ دار کے متعلق بھی کچھ علم نہیں تھا لیکن مجھے امید تھی کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔ دل میں کبھی کبھار وسوسے آتے۔ ان بُرے بُرے خیالات کو نظر انداز کرنے کے لیے میں خود کو مصروف کر لیتی۔ پھر اچانک چار ماہ بعد اس کا فون آ گیا پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا اس نے خوش ہوتے ہوئے بتایا تھا۔

''تمہاری دعائیں رنگ لائی ہیں اور میں نے ایگزام پاس کر لیا' مجھے مزید دو یا تین ماہ لگ جائیں گے پھر میں اپنی گاڑی میں آؤں گا اور تم دیکھنا مجھے پہچان ہی نہ سکو گی۔'' میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی پر کچھ نہ کہہ سکی تھوڑی دیر کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔ ایک سوال بار بار میرے دل میں آ رہا تھا کہ 'کیا وہ مجھ سے پیار کرتا ہے؟' اس نے کبھی اظہار ہی نہیں کیا تھا اور اب جب کہ وہ اتنا بڑا آفیسر بن گیا ہے تو کیا اس کے بعد بھی میں اسے اچھی لگوں گی؟ اس نے تو کبھی ایسا کچھ بھی نہیں کہا تو میں کیوں اس کے سپنے دیکھتی ہوں۔ کیوں تصور میں اسی کو اپنا ہمسفر دیکھتی ہوں؟ کیوں میں ہر وقت اُسی کے بارے میں سوچتی ہوں؟ ایک سوالات کی جنگ تھی جو میرے اندر چل رہی تھی۔ وہ تو بس مجھے ایک بہادر لڑکی بنانا چاہتا تھا۔ شاید ہمدردی میں۔ اوہ خدایا میں کیا کروں؟ اب دن رات میں یہی سوچنے لگی خود کو تسلی دیتی کہ علی صرف میرا دوست تھا اور رہے گا یہ تو میری غلطی تھی کہ میں نے اس کے خلوص کا غلط مطلب لے لیا۔ آہستہ آہستہ میں نے خود کو سنبھال لیا اب میری کوشش ہوتی کہ اس کو اگر یاد کروں تو محض ایک دوست کی طرح۔ یوں ایک ماہ مزید گزر گیا کہ ایک دن باجی ہمارے گھر آئیں۔ میں تو سب بھلا چکی تھی میں نے خوش دلی سے ان کو گلے لگا لیا لیکن شاید ان کا دل اب بھی میری طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔ میں نے فروا اور سنی کو بہت پیار کیا اور جب وہ جانے لگیں تو میں نے باجی سے معافی مانگ لی حالانکہ میں جانتی تھی کہ میرا اتنا قصور نہیں تھا پھر بھی چھوٹی ہونے کے ناتے میں ہی جھک گئی بدلے میں انھوں نے پھر زہر اُگل دیا۔

''ٹھیک ہے چھوٹی بہن ہو' معاف کرتی ہوں پر بہن' اب میں مزید اس سلسلے میں تمہاری مدد نہیں کروں گی ہاں' آصفہ کے لیے ایک دو رشتے دیکھے ہیں۔'' اس نے آصفہ کے گال پر پیار کیا۔ میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ علی رضا تو مجھے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ انسان چاہے کچھ بھی پلاننگ کرے ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے اس لیے کسی انسان سے امید رکھنے سے بہتر ہے اللہ سے اچھے کی امید رکھی جائے اور اب میں نے بھی اس بات کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا تھا۔ میں اب زیادہ تر وقت اللہ کی عبادت میں ہی گزارتی۔ عبادت میں جو مزہ میں نے پایا' شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ میں اکثر سوچتی اسی لیے سارے اولیاء اللہ رات بھر کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے تھے۔ یہی سب سے بہترین طریقہ ہے ہر برے خیال اور بری عادت کو ختم کرنے کا۔

☆......☆

ایسا ہو جائے گا' یہ تو کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں 'کس کو پتا تھا کہ اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی جو ابھی صرف دو بچوں کی ماں ہے' اس دنیا سے چلی جائے گی۔ میں اور آصفہ، فروا اور سنی کو سنبھالے بیٹھے تھے۔ ہر آنکھ اشک بار تھی' سب ہمدردی سے فروا اور سنی کو پیار کر رہے تھے اور ان معصوم بچوں کو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ اتنی بھیڑ کیوں لگی ہے اور ان کی مما کہاں گئیں؟

واقعہ یوں ہوا کہ عادل بھائی اپنی امی کو لے کر کراچی گئے تھے دو دن کے لئے ان کی آنکھوں کا چیک اپ کروانا تھا۔ رات میں باجی' بچوں اور نوکروں کے ساتھ اکیلی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر ڈاکو ان کے گھر میں گھس آئے۔ بقول نوکروں کے باجی نے چیخنا شروع کر دیا بچے اپنے کمرے میں تھے اور ڈاکوؤں نے باجی پر فائر کر دیا۔ مال تو وہ کچھ نہ لے جا سکے کہ ان کو موقع ہی نہیں ملا لیکن ایک ایسا گھاؤ دے گئے جو شاید کبھی نا بھر سکے۔ بچوں کو دیکھ دیکھ کر میرا دل بند ہو رہا تھا کہ ماں سے بڑھ کر ان کا کون خیال کرے گا۔ دل کٹ جاتا جب وہ اپنی توتلی زبان میں مما کو پکارتے۔

وقت کا کام ہے گزرنا' سو وہ اپنی رفتار سے گزرنے لگا سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ بچے ہمارے ساتھ آ گئے۔ ویسے بھی اکثر وہ آ جاتے تھے اس لیے ان کو لگا اس بار بھی وہ ہمارے گھر کچھ دنوں کے لیے آئے ہیں۔ آصفہ اور میں سارا دن ان کو بہلاتے۔ کوشش کرتے کہ وہ باجی کو یاد نہ کریں۔ شام کو عادل بھائی ان کو آئس کریم کھلانے لے جاتے۔ فروا کے اسکول کھلنے والے تھے۔ ان کی دادی دونوں بچوں کو سنبھال نہیں سکتی تھیں اس لیے انھوں نے ابا سے میرا ہاتھ مانگ لیا۔ یہ خبر مجھے ملی تو میرے سر پر جیسے پہاڑ گر گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں عادل بھائی کو اپنا سگا بھائی سمجھتی ہوں۔'' میری تو جیسے چیخیں نکل گئیں۔ اس بار ابا بھی خاموش تھے۔ عادل بھائی کی امی خود آئی تھیں۔ بھائی اور آصفہ نے ضد پکڑ لی کہ ہاں کہہ دو اور میرے لیے یہ دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔

''کچھ تو سوچو' یہ دونوں چھوٹے بچے کیسے زندگی گزاریں گے؟ اگر عادل بھائی نے کسی اور عورت کے ساتھ شادی کر لی تو تم خود سمجھتی ہو' سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے۔'' بھائی مجھے سمجھانے لگا۔

''کوئی بات نہیں' ہم فروا اور سنی کو اپنے پاس رکھ لیں گے۔'' میں نے ایک کمزور سی دلیل دی۔

قریب ترین راستہ

ایک دولت مند آدمی کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک روز کچھ تو وہ انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے اور کچھ سردی سے خود کو بچانے کی خاطر تھوڑی تھوڑی دیر بعد شراب پیتا رہا۔ شام کو جب اس نے اپنا سامان سمیٹ کر کار میں رکھا تو وہ بالکل ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔

کار چلانے کے کچھ سیکنڈ بعد ہی جب پانی اس کے پیروں کو چھونے لگا تو اس نے سوچا۔

''اف یہ تو بارش آ گئی ہے' میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ آج پانی برسنے لگے گا۔ خیر اب مجھے جلد سے جلد اپنے گھر تک پہنچنا چاہئے۔''

اتنے میں اس کی نظر ایک کسان پر پڑی جو اپنے گھر جا رہا تھا۔ رہنمائی کے لیے اس نے کسان سے پوچھا۔

''بھئی شہر تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ کون سا ہے؟''

کسان نے جواب دیا۔ ''میری رائے میں سڑک کا راستہ ٹھیک رہے گا۔ ندی میں کار چلاتے ہوئے جائیں گے تو شہر بہت دیر سے پہنچیں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟'' آصفہ نے غصے سے کہا۔ ''ان کا گھر دیکھو اور یہ بچے جن سہولیات کے عادی ہیں' وہ کہاں سے لاؤ گی تم؟'' میں حیرت سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ لوگ کیسے ظالم ہوتے ہیں' کسی کے احساسات و جذبات کا خیال ہی نہیں کرتے۔ فروا اور سنی کا دکھ مجھے بھی تھا' پر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں اپنی ساری زندگی اس آدمی کے ساتھ گزار دوں جنہیں میں اپنا بھائی کہتی آئی ہوں یا جو شاید خود بھی مجھے صرف بچوں کی وجہ سے قبول کرلیں لیکن وہ جگہ کبھی نا دے سکیں جو ان کے دل میں باجی کے لیے تھی۔ اس سے تو اچھا تھا میں اس بوڑھے سے شادی کرلیتی جس کو کم از کم میں اپنا بھائی تو نہیں سمجھتی تھی۔

اُف خدایا! میں کیا کروں؟ میں نے سر تھام لیا تھا۔

دل اور دماغ کی جنگ جاری تھی ایک طرف فروا اور سنی کا سوچتی تو دل کہتا کہ ہاں کہہ دوں اور دوسری طرف عدیل بھائی کو میں تصور میں بھی شوہر کے روپ میں دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ مجھے کل فیصلہ سنانا تھا۔ ابا نے عدیل بھائی کی امی کو کچھ دن سوچنے کا کہہ کر ٹال دیا تھا اور مجھے کل تک اپنا فیصلہ سنانے کو کہا تھا۔ میرے لیے یہ رات بہت بھاری تھی۔ میں رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ دل کسی طور ماننے کو تیار نہیں تھا اور دوسری طرف مجھے کوئی آس بھی نظر نہیں آ رہی تھی کہ علی رضا مجھے اپنا لے گا یا شاید وہ ہوتا تو کم از کم مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی۔ وہ ساری رات میں نے مصلے پر روتے روتے گزاری۔ اپنے رب سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور یہی دعا کرتی رہی کہ جو بھی فیصلہ کروں' وہ میرے حق میں بہتر ہو اور تو ہی مجھے صحیح فیصلہ کرنے کی قوت دے۔

فجر کے وقت تک میں نے فیصلہ کرلیا تھا اب یہ صحیح تھا یا غلط' اس کا مجھے پتہ نہیں تھا پر اتنا یقین تھا کہ میں فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی تھی۔ صبح کسی نے بھی مجھ سے کچھ نا پوچھا۔ پتا نہیں کیوں۔ شاید وہ اس انتظار میں تھے کہ میں خود ہی ان کو بتا دوں مگر میں اب پرسکون تھی اور بجائے رونے دھونے کے بہت سکون سے روٹین کے کام کرنے لگی۔ دوپہر کو آصفہ میرے پاس آئی۔ پہلے مجھے غور سے دیکھنے لگی اسے شاید لگ رہا ہو کہ میں رونی صورت بنا کر ''ہاں'' یا پھر ''نا'' کہہ دوں گی۔

میں نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہی ہو' کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟'' میرے شگفتہ لہجے پر وہ حیران رہ گئی اور پھر کچھ موڈ آف کر کے بولی۔

''تو پھر تم نے کیا سوچا؟''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کس بارے میں؟''

وہ میری اس بے نیازی پر زچ ہو کر بولی۔ ''عدیل بھائی سے شادی کرنے کے بارے میں اور کس بارے میں؟'' میں اس کے قریب گئی اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''یار' تو مجھ سے صرف دو سال چھوٹی ہے تو کیوں نہیں کر لیتی؟'' اس نے غصے سے میری بانہیں جھٹک دیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی ایسا کہتے ہوئے؟'' اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ میں نے بھی کمال ڈھٹائی سے کہا۔

''جب تمہیں نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے۔ جس طرح تمہیں برا لگ رہا ہے' مجھے بھی اسی طرح برا لگ رہا ہے اور دوسری بات یہ کہ اگر مجھے برا نہ بھی لگتا تو بھی میں نہ یہی کہتی۔ ایک تو میں اس قابل نہیں کہ عدیل بھائی جیسا شوہر ملے کیوں کہ باجی کے بعد تم ہی زیادہ خوبصورت ہو' دوسرا بچے مجھ سے زیادہ تم سے اٹیچ ہیں اور تیسرا باجی نے خود ہی کہا تھا کہ اب میں آصفہ کے لیے ہی رشتہ ڈھونڈ رہی ہوں تو اس کا مطلب ہے اب تمہاری باری ہے۔ میں اب ایسے ہی بغیر شادی کے زندگی گزار دوں گی۔'' پتا نہیں کہاں سے ایک خود اعتمادی میرے اندر آ گئی تھی شاید یہ وہ سارا زہر تھا جو بچپن سے میں اندر ہی اندر اتار رہی تھی۔ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھی کہ آصفہ ہی سب سے زیادہ اس شادی کی حمایت کرے گی مگر ان تلخ باتوں کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایسا کچھ کہتی کیوں کہ جب تک انسان کے خود پر نہیں گزرتی' اسے احساس نہیں ہوتا اور ایسا ہی ہوا شام کو جب ابا نے مجھ سے پوچھا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی کہ کہیں میں اس کا نام ہی نہ لے دوں۔ خیر' میں خودغرض نہیں تھی کہ خود کو بچانے کے لیے اسے آگے کر دیتی۔ میں نے بڑے ہی اعتماد کے ساتھ ابا کو منع کر دیا۔

''ابا' دیکھیں میں عدیل بھائی کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں اور ان کو میں کبھی بھی شوہر کا درجہ نہیں دے سکوں گی۔ دوسرا بچوں کی دادی ان سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اگر عدیل بھائی نے دوسری شادی کر بھی لی تو بچے دادی کے ساتھ ہی رہیں گے اور ہم بھی بچوں سے بالکل غافل نہیں ہوں گے پھر بھی اگر آپ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں تو صرف آپ کی خاطر میں ہاں کہہ دوں گی لیکن یاد رکھیے گا میں کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ جو سکون مجھے یہاں روکھی سوکھی کھانے میں ملتا ہے' شاید وہاں کے مرغ مسلم میں نہ ملے۔'' میں جانتی تھی ابا کبھی بھی زبردستی کے قائل نہیں رہے انھوں نے خاموشی سے ہمیشہ کی طرح میرے سر پر بوسہ دیا جس کا مطلب تھا کہ جیسا تم چاہو' وہی ہوگا اور ایک بار پھر ابا نے میری زندگی مجھے لوٹا دی۔ میں نہیں جانتی ابا نے ان کو کیسے منع کیا ہوگا؟ بہرحال میں نے اب سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا۔ بعد میں آصفہ نے بتایا کہ عدیل بھائی خود بھی راضی نہیں تھے۔ ان کی امی بضد تھیں وہ اکثر بچوں کو لے کر آتے تھے۔

تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ بھائی کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی ہم نے بھائی کی منگنی کر دی تھی۔ BLL کے بعد وہ پریکٹس کر رہے تھے۔ ایک دن اچانک علی رضا کی کال آ گئی آصفہ نے کال ریسیو کی تھی۔ میں کچن میں تھی اس نے مجھے بلایا کہ کوئی لڑکا ہے تمہارا پوچھ رہا ہے اس نے آصفہ کو اپنا نام نہیں بتایا تھا حالانکہ وہ اسے جانتی تھی پر آواز پہچان نہ سکی لیکن میں تو اس کے ''ہیلو'' سے ہی جان گئی۔ بہت سارے شکوے گلے آ کر زبان پر اٹک گئے رسمی دعا سلام کے بعد اس نے بتایا تھا۔

''کل واپس آ رہا ہوں مگر صرف دو چار دن کے لیے۔ سامان وغیرہ لیں گے اور پھر میں اپنے بنگلے میں شفٹ ہو جاؤں گا۔'' میں نے اس کو دل سے مبارک باد دی تھی کیوں کہ میں واقعی یہ چاہتی تھی کہ وہ جتنی محنت اور لگن سے پڑھتا تھا' اس کا اسے پھل ملے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور میں مسکرانے لگی کہ بھلے ہی اسے مجھ سے محبت نہ ہو پر آج بھی وہ اپنی خوشی میرے ساتھ ہی شیئر کرنا پسند کرتا ہے۔

دوسرے دن ہم دونوں چھت پر تھے ایک سال کے بعد میں اسے دیکھ رہی تھی وہ کافی بدل گیا تھا شاید خوشیاں اور سکون چیز ہی ایسی ہیں کہ انسان میں خوبصورتی پیدا کر دیتی ہیں۔ میری سوئی ہوئی محبت اچانک اسے اپنے سامنے پا کر جاگ گئی تھی۔

''حنا' یہ تم نے اپنا کیا حال کرلیا ہے؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی چیخ کر کہا اب میں اسے کیا کیا بتاتی کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ ''ارے' میں نے تو اچھی خاصی تندرست حنا کو یہاں چھوڑا تھا پر یہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ سچ سچ بتاؤ تم نے اپنی یہ حالت کیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرلی ہے؟'' اس کی یہ بے تابی مجھے اچھی لگ رہی تھی اور میں جو سمجھتی تھی کہ میں بہت مضبوط ہوگئی ہوں' اندر سے ٹوٹنے لگی۔ بہت کوشش کے بعد بھی ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میں کیسے اسے سمجھاتی کہ جس حنا کو اس نے اتنا اعتماد دیا تھا جسے وہ بولڈ لڑکی بنانا چاہتا تھا' حالات سے لڑلڑ کر اندر سے بالکل کھوکھلی ہوگئی ہے۔ روتے روتے مجھے احساس ہی نا ہوا کہ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں میرے ہاتھ تھام لیے ہیں۔

''بس کرو نا یار' اب میں نے ایسا تو ہرگز نہیں کہا تھا کہ اتنا زیادہ رونے والی لڑکیاں مجھے اچھی لگتی ہیں'' اس کے الفاظ پر بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر میرے آنسو صاف کیے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگی اس کو بھی علی کی دوستی سمجھوں یا محبت۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا کہ اس نے انگلی سے اشارہ کرکے منع کردیا۔

''آج کوئی دکھ والی بات نہیں ہوگی۔ ایک اور خوش خبری سنانے کے لیے میں بے چین ہورہا ہوں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلو بتاؤ۔''

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر رازداری سے بولا۔ ''پتا ہے میں جلد از جلد شادی کرنے والا ہوں۔'' ایک لمحے کو دل میں کچھ ٹوٹ گیا مگر میں نے اپنے اندرونی جذبات کو قابو کرلیا۔

''اچھا' یہ تو بڑی اچھی نیوز ہے۔ کیا وہیں پہ کوئی لڑکی پسند کرلی یا گاڑی اور بنگلے کے ساتھ وہ بھی فری میں مل گئی؟'' اس نے میری بات پر زوردار قہقہہ لگایا۔

''تمہیں جلن تو نہیں ہورہی؟'' اس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں چند لمحوں کے لیے گڑبڑا گئی۔

''نہیں...... نہیں تو...... مجھے کیوں جلن ہوگی؟ میں تو...... میں تو یہی چاہتی ہوں کہ اللہ کرے' تمہیں سب سے اچھی لڑکی مل جائے جو تمہیں بہت خوش رکھے۔'' میں نے دل سے دعا دی۔

'یار' پھر تو......'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو مجھے تم سے شادی کرنی چاہیے کیوں کہ میری نظر میں سب سے اچھی تم ہو اور مجھے خوش بھی صرف تم ہی رکھ سکتی ہو۔ اگر اپنے آنسوؤں کا کم سے کم استعمال کرو تو......'' میں حیرت سے دنگ اسے دیکھتی رہ گئی کہ جو کچھ میں اتنے عرصے سے سننا چاہتی تھی' وہ اب سن رہی تھی۔ جب مجھے بالکل اس بات کی امید نہیں تھی۔

''بس اب اتنا غور سے بھی مت دیکھو' کہیں مجھے نظر نہ لگ جائے......'' اس نے شرارت سے کہا تو میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ ''چلو اب تم تیاری پکڑو' شام تک امی ابو تمہارے گھر آجائیں گے۔ امید ہے کہ آپ کے ابا حضور اس ناچیز کا رشتہ قبول فرمائیں گے اور ہاں' اب جلدی سے شادی کرکے لے جاؤں گا تمہیں اس لیے آج سے ہی تمہیں مجھ سے پردہ کرنا چاہیے۔'' شاید اتنے عرصے کے بعد میں کھل کر خوش ہورہی تھی۔ ''چلو بھئی' نیچے جاؤ اور اپنے ہونے والے ساس اور سسر کی خدمت کی تیاری کرو۔ کیسی کیسی لڑکیاں ہیں' ایک ہفتے کے اندر شادی ہونے والی ہے اور ہونے والے شوہر نامدار کے سامنے بے حیائی سے کھڑی ہیں؟''

میں نے ایک مکا پیار سے اس کے سینے پر مارا اور وہ ''آہ'' بھر کے گرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا' میں دوڑ کر نیچے آگئی۔ پیچھے سے اس کا آخری جملہ میرے کانوں میں پڑا۔ ''بدلہ لوں گا اس کا......'' اور میں سوچنے لگی کہ واقعی اللہ پر اپنی زندگی کے فیصلے چھوڑنے سے انسان کو ہی فائدہ ہوتا ہے کیوں کہ اللہ کے فیصلوں میں انسان کا کبھی خسارہ نہیں ہوتا۔

WATCH EVERY SUNDAY AT 8:00PM
ہوئے بیگانے کیوں
PRESENTS

شعیب محی الدین فریدی

دل تو پاگل ہے ناں!

شاداب صدیقی کا خیال

جدائی بہت ہی گراں بار ہے
طلب گار غم ہے شبوں کا علاج

ایک شادی شدہ شخص کی عجیب محبت سے جڑا سوال خاص



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر چہ بیتے ہوئے لمحات کو یاد کرنا بہت جان لیوا ثابت ہوتا ہے لیکن میں قارئین سچی کہانیاں کے لیے مندمل زخموں سے کھرنڈ کھرچ رہا ہوں۔ یقین جانیے اپنی بہت مصروف زندگی میں سے بڑی مشکل سے یہ کہانی لکھنے کا وقت نکالا ہے۔ مجھے لکھنے کا شوق تو ہمیشہ سے رہا ہے لیکن مصروفیت کی وجہ سے آج کل بہت کم لکھنے کا موقع ملتا ہے۔ رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک گورنمنٹ اسپتال میں ڈیوٹی، پھر ریسٹ بھی کرنا پڑتا ہے۔ پانچ بجے شام سے سات بجے شام تک کلینک بس اس طرح سے زندگی کٹ رہی ہے۔ بہرکیف میں اپنے آپ کو زیادہ ہی مصروف رکھتا ہوں۔ اگر فرصت کے لمحات میسر آئیں تو پھر اس ظالم کی یاد ستاتی ہے۔

☆......☆

ان دنوں میری شعبۂ حادثات میں مارننگ ڈیوٹی تھی۔ فروری کا مہینہ تھا۔ آٹھ فروری کو دس بجے وہ ایمبولینس پر میرے پاس لائی گئی تھی...... بیس سال کی ایک دوشیزہ اور وہ بھی الہڑ جوان، اوپر سے نفسیاتی دباؤ کے زیر اثر تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

میں نے اسے چیک کیا۔ اس نے ایک نگاہ التفات مجھ پر ڈالی اس کی آنکھوں میں غم کا جہاں آباد تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی تازہ ٹھوکر لگی ہے۔ میں بھی پہلے سے غم رسیدہ تھا۔ دل والے ہی دل والوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اس کو میں نے تسلی دی، حوصلہ دیا، جینے کی امنگ دی...... وہ میری ہمدردی اور میرے رویے سے بہت متاثر ہوگئی تھی۔

میں نے اسے نفسیاتی وارڈ میں داخل کرلیا تھا جو کہ میرے وارڈ کے ساتھ والا وارڈ تھا۔ اس سے جب میری بے تکلفی بڑھی تو پھر وہ روزانہ میرے دفتر میں میرے روبرو بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کرنے لگی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بتاتی اور میرے بارے میں بھی سب کچھ پوچھتی تھی۔

میں نے اسے اپنی زیست میں گزرے تمام حالات سچ سچ بتا دیئے تھے۔ اس طرح ہم دونوں میں گہری دوستی اور تعلق بن گیا تھا۔

میری عمر تیس سال ہے اور میں شادی شدہ دو بچوں کا باپ ہوں لیکن دل پہ کسی کا بھلا کیا زور چلتا ہے؟ دیکھتے ہی دیکھتے میں اس کے اور وہ میرے دل میں اتر گئی بلکہ گھر کرگئی اور جب بات حد سے بڑھی تو اس نے مجھے شادی کی آفر کی تھی۔ میں نے اسے اونچ نیچ سمجھائی تھی کہ...... میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں، کیا گوارا اور گزارہ کرلوگی؟

اس نے حامی بھرلی کہ مجھے منظور ہے۔ میں نے پھر بھی سوچنے کے لیے اسے وقت دیا۔ یقین جانیے اس کے بغیر رہا مجھ سے بھی نہیں جاتا تھا لیکن میں آگے آنے والے حالات سے ڈرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ میرے لیے بہت ہی اہم ہوگئی تھی۔ اس کا مجھ سے جدا ہونا اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا زندہ جسم سے کسی اعضا کا الگ ہونا۔ اس سے میری روز فون پر گفتگو ہوتی اور ہر چھٹی والے دن ہم ملاقات کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیتے تھے۔ اس تمام عرصہ میں نے نہ اس سے کوئی ناجائز ڈیمانڈ کی تھی اور نہ اس نے کوئی ایسی حرکت کی تھی۔ ایک پاک صاف دوستی اب محبت میں بدل گئی تھی۔

ایک ماہ بعد اس نے ایک روز اچانک فون پر مجھے بتایا تھا کہ میرے گھر والے میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں جس پر میں راضی نہیں ہوں۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں اس کے گھر آؤں۔

میں نے دوسرے دن اس کی والدہ کو فون کال کی تھی اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر والوں سے مشورہ کرکے ایک روز مجھے اپنے گھر بلا لیا تھا۔

میں اپنے ایک قریبی دوست کے ساتھ ان کے گھر پہنچا تھا۔ وہ دو بہنیں اور دو ہی بھائی تھے، اس کی بڑی بہن اور بڑے بھائی کی شادی ہوچکی تھی۔ چھوٹے دو تھے جن میں ایک وہ میری دوست تھی۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائیوں نے میرا پورا انٹرویو لیا تھا اور میں نے ان کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کچھ ڈیمانڈز کی تھیں جن میں ایک پانچ مرلے کا پلاٹ لڑکی کے نام، طلاق کی صورت میں پانچ لاکھ حق مہر، پچاس ہزار نقد اور پانچ تولے سونا تھا۔

میں نے یہ سب کچھ اس کی خوشی کے لیے قبول کرلیا تھا لیکن میرا سچ بولنا ہی میرے لیے وبال بن گیا تھا۔ میرا بیٹا ان کی نگاہوں میں اٹکنے لگا تھا کیونکہ وہ میری وراثت میں برابر کا حقدار تھا۔ اس کے بعد ہونے والی ملاقاتوں میں ہونے والی گفتگو اور اس کے رویے میں مجھے بڑی نامانوس سی سرد مہری سی محسوس ہوئی تھی۔

تقریباً ایک ماہ بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ آئی اور تمام رشتے ناطے ایک پل میں ہمیشہ کے لیے توڑ گئی۔ اس وقت جو میری کیفیت تھی، وہ میں یا میرا خدا جانتا ہے۔ میں نے ان سے انکار کی وجہ بہت دریافت کی تھی...... جو انہوں نے کسی صورت نہیں بتائی تھی۔

میں نے اس دن سے لے کر آج تک نہ اس سے گلہ کیا اور نہ ہی بے وفا ہونے کا طعنہ دیا یہ اس کی اپنی سوچ اور فیصلہ تھا دوستی میں پہل بھی اس نے کی تھی اور ختم بھی اس نے کی۔ میرا یہ عشق، دیوانگی، محبت، افیئر، دوستی، پیار، چاہت یا جو بھی آپ کہنا چاہیں، صرف چار ماہ چلی۔ ان چار ماہ میں، میں اپنے آپ سے بے گانہ ہوگیا۔ گھر تک کو بھول گیا۔ نہ اپنا ہوش رہا نہ بیوی بچوں کا۔ اس نے میری انا، میری مردانگی کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

☆......☆

کچھ عرصے بعد وہ پھر میرے پاس آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نیا چاہنے والا تھا۔ معلوم نہیں یہ اس کا دل بہلانے کا مشغلہ ہے یا پھر وہ کسی بے وفا مرد کا بدلا دوسرے مردوں کو ٹرپا کر لیتی ہے۔ بہرحال وہ میری مزاج آشنا تھی۔ اس کی گفتار اس کی سوچ مجھ سے بہت ملتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور تھی یا کسی نے اسے مجبور کیا تھا۔ حالانکہ اس نے میرے ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی تھیں اور شادی پر بھی اس نے مجھے خود مجبور کیا تھا۔ پھر بھی خود بلایا تھا پھر جب سب کچھ ختم کرنے آئی تھی تو کافی دیر میرے سامنے بیٹھی آنسو بہاتی رہی تھی۔ معلوم نہیں اس کی کیا مجبوری تھی جو وہ میری نہ ہوسکی۔

اس دن کے بعد سے میں نے اس سے رابطہ بالکل منقطع کردیا ہے۔ اب مجھے بھی ہوش آگیا ہے، میری ایک عزت تھی، وقار تھا، رعب تھا، اعتماد تھا جو میں کھو بیٹھا۔ میں اپنے آپ کو اب بہت کمتر محسوس کرتا ہوں۔

آپ قارئین بتائیں کہ میں کیا کروں؟ آپ یقیناً یہ نکتہ اٹھائیں گے کہ ایک شادی شدہ، بچوں کے باپ کو محبت کے چکروں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو میرے بھائیو......! اور بہنو......! اس کا جواب اپنے دل سے پوچھیے گا کہ...... یہ دل تو پاگل ہے ناں!

میں اپنی اس کہانی کا اختتام ایک مشہور شاعر کی مشہور نظم سے کرنا چاہوں گا۔

سب سے چھپا کر درد جو وہ مسکرا دیا
اس کی ہنسی نے تو آج مجھ کو رلا دیا
ہر لمحے سے اٹھ رہی تھی میرے درد کی داستان
چہرہ بتا رہا تھا کہ سب کچھ گنوا دیا
آواز میں ٹھہراؤ تھا آنکھوں میں نمی تھی
اور لہجہ کہہ رہا تھا میں نے سب کچھ بھلا دیا
جانے کیا اس کو لوگوں سے تھی شکایتیں
تنہائیوں کے دیس میں خود کو بسا لیا
خود بھی وہ ہم سے بچھڑ کر ادھورا سا ہوگیا
مجھ کو بھی اتنے لوگوں میں تنہا بنا دیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY TUESDAY AT 8:00PM
پرواز
BASED ON A TRUE STORY
PRESENTS

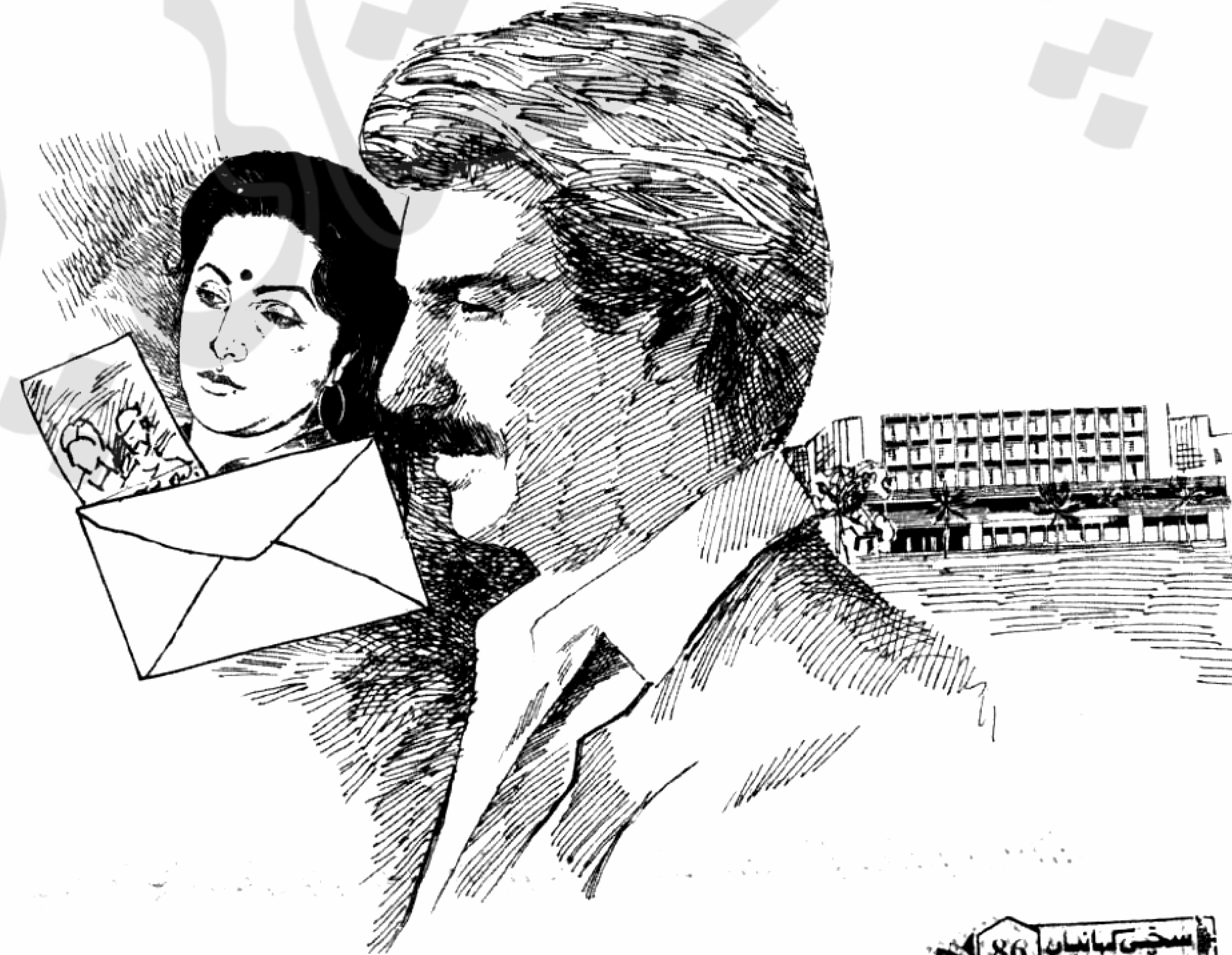
عارفہ شاہ

خوشبو بکھر گئی

نور جہاں نوری کا خیال

جو بوند بوند غم زندگی کو پیتے رہے
تو قطرہ قطرہ غموں نے ہمیں سنبھالا ہے

زندگی کے پچیس برس جہنم کی نذر کرنے والی حرماں نصیب عورت کا المیہ قصہ



پچیس برس زندگی کا ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں کوئی بھی شخص بہت کچھ دیکھ لیتا ہے۔ اسے زندگی کے بہت سے تجربات ہو جاتے ہیں۔ ماہ و سال کے گزرتے لمحوں میں وہ خوشیوں کی بہاریں بھی دیکھتا ہے تو دکھوں کی خزاں سے بھی اس کا سامنا ہوتا ہے۔ پچیس برسوں کے موسموں میں وہ ہر قسم کے حالات سے گزر جاتا ہے۔

اس کا اور میرا ساتھ بھی پچیس برسوں پر محیط تھا۔ وہ میری کولیگ تھی۔ بہت سوبر سی اور اپنے کام سے کام رکھنے والی برسوں سے اس کا ایک معمول تھا کہ دفتر آتی بے حد انہماک سے سر جھکائے فائلوں میں سر دیئے مصروف رہتی اور اپنے کام سے کام رکھتی۔ اب وہ ریٹائر ہونے والی تھی۔ لہٰذا اپنے ساتھیوں کو پارٹی دینا چاہتی تھی۔ اسی سلسلے میں اس نے آج صبح نو بجے مجھے اپنے گھر بلایا تھا اور نہایت شیریں لہجے میں مجھ سے دعوت کا انتظام کرنے کی درخواست کی تھی۔

اگلے دن میں صبح ہی صبح اس کے گھر میں تھی۔ تین گھنٹوں میں اس نے اپنی بیٹی اور ملازمہ کے ساتھ مل کر میری ہدایات کے مطابق دعوت کی تمام تیاری مکمل کر لی میں نے ہاتھ بٹانا چاہا مگر اس نے بہت پیار سے منع کر دیا۔

''بہن عاطقہ! آپ کے مشورے سے میری دعوت کا بھرم رہ جائے بس آپ کی یہی مہربانی بہت ہے۔ اب آپ میرے بیڈروم میں چلیے وہیں کھانا کھا کر آپ آرام کریں گی اور رات آٹھ بجے دعوت میں ادھر سے ہی شامل ہوں گی۔'' اس نے خلوص اور محبت بھرے انداز میں کہا۔ گھر میں میرے کئی کام ادھورے پڑے ہوئے تھے مگر میں اس کی خاطر وہاں رک گئی۔

کھانے کے بعد ہم دونوں بیڈ پر نیم دراز تھیں۔

''عاطقہ درانی! کبھی کبھی دل چاہتا ہے۔ کسی کو اپنا وہ دکھ سناؤں جو پچھلے پچیس سالوں سے مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اب میرا ریزہ ریزہ وجود مجھ سے سمٹتا ہی نہیں دوست۔ پچیس سال سے میں زخمی روح کے ساتھ سسک سسک کر جی رہی ہوں اور اب جب کہ بڑھاپا بھی میرے وجود پر دستک دے رہا ہے تو دل یہی کرتا ہے کہ کسی کو اپنا دکھ بتاؤں۔'' وہ آنسوؤں سے رو رہی تھی مجھے لگا جیسے اس کے ضبط کے وہ تمام بند ٹوٹ گئے ہیں جنہیں اب تک روکے ہوئے تھی۔

''مسز رئیس خان آپ کیا کہہ رہی ہیں آپ کو میں نے ہمیشہ مطمئن و پرسکون ہی دیکھا ہے۔ آپ کا بھرا پُرا گھر ہے۔ شوہر ہے۔ معاشرے میں آپ لوگوں کا ایک مقام ہے پھر یہ دکھ، یہ کسک، یہ آنسو......'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ کی دراز سے ایک ڈائری نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے بولی۔

''پہلے اسے پڑھ لیں۔ عاطقہ پھر میں اپنا حالِ دل بیان کروں گی۔''

ڈائری کے پہلے صفحے پر شعر تھا

کتنی حسرت سے لپٹتا رہا دیواروں سے
میں تڑپتا ہوا جب تیرے نگر سے نکلا

پچیس سال پہلے جب میں رشتہ داروں کی نفرت و حقارت کے تیر برساتے لہجوں سے گھبرا کر تمہارے شہر سے منہ موڑ کر بمبئی چلا آیا تھا۔ محض اپنے بابا جان کی منت سماجت پر۔ انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے کہ یہ ظالم بستی چھوڑ دو جو تم چاہتے ہو تمہاری دسترس سے بہت دور ہے۔

مسز رئیس خاں، تم جو اپنے تئیں بہت سکھی زندگی گزار رہی ہو۔ خود کو بھرے پُرے گھر میں بھی تنہا پاتی ہو، زندگی کا اتنا لمبا عرصہ گزار کر بھی آج تم تنہا ہو۔ بے چین ہو۔ سکون کی دولت سے نا آشنا ہو۔ مادی اشیاء تمہیں سکون نہیں دے سکتیں۔ کہاں ہیں وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شامیں جہاں تم اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا بن کر ان کے آنگن کو اجالا بخشا کرتی تھیں۔ تم والدین کی بہت لاڈلی تھیں۔ میری چچا زاد تھیں ہمارے گھر ساتھ ساتھ تھے مگر فاصلہ سات سمندر سے بھی زیادہ تھا۔ امارت اور غربت کی ازلی رکاوٹ میرے آڑے آتی گئی۔ اس وقت میری عمر بیس سال تھی۔ تم ان دنوں سن سولہ میں تھیں کیا تعریف کروں کہ تم ان دنوں کیا تھیں۔ بس ایک کھلتا گلاب تھیں۔ کسی کام سے مجھے تمہارے ہاں بھیجا جاتا۔ ان دنوں پردے کا رواج تھا۔ تم کمرے سے باہر آتیں منہ موڑے مجھ سے کام پوچھا جاتا مگر میں کام تو کیا بتاتا اپنا آپ فراموش کر دیتا۔ میری روح گویا جدا ہو کر تمہارے ارد گرد منڈلانے لگتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ خوشبوں کا ریلا مجھے بہائے لے جا رہا ہے۔ میں مدہوش سا ہو جاتا اور بے خودی میں ایک ٹک تمہیں دیکھتا رہتا۔ میری محبت کی نظر پہچان کر بھی تم انجان بن جایا کرتیں۔ دو چار بار ایسا ہی ہوا اور ایک روز جب گھر میں میری دھنائی ہوئی تو پتہ چلا تمہارے والد اور بھائی کافی عرصہ سے میری حرکات نوٹ کر رہے تھے۔ تمہارے والد دندناتے ہوئے ہمارے گھر آ گئے۔

''بھائی صاحب اپنے لچے، لفنگے بیٹے کو سنبھال کر رکھیے۔ میری پھول سی بیٹی کے لیے اس کے پاس کیا مستقبل ہے۔ اس کے پاس کیا ہے؟ کتنا بینک بیلنس ہے؟ کتنے گھر ہیں؟ کیا اوقات ہے اس کی؟ میرا بیٹا امریکہ میں ہے اسے بھی اس کی حرکتوں کے بارے میں بتا چکا ہوں وہ کہتا ہے کہ میں اسے گولی سے اڑا دوں گا۔'' اف اتنی ذلت، اتنی تحقیر میں نے تمہیں اسی دوران دو چار خط لکھے تم نے جواب بھی دیا۔ تھوڑی سی حوصلہ افزائی کی مگر تم خود ڈانواں ڈول تھیں میرے پاس تمہیں دینے کے لیے پُر آسائش زندگی نہیں تھی۔ کاش تمہارا ساتھ ملتا تو میں تمہارے نصیب سے ضرور ترقی کرتا۔

میری ماں زندہ نہیں تھی۔ باپ ہی تھا۔ سوتیلی ماں کس طرح کی ہوتی ہے۔ اس کا مجھے اندازہ تھا۔ میں اس کے سارے زخم سینے پر سہہ لیتا تھا۔ میری آس، امید صرف تم تھیں۔ پھر میں نے تمہاری یاد میں شاعری شروع کر دی۔ میں نے تمہارا نام خوشبو رکھا۔ اسی خوشبو کے سہارے تمہیں ارد گرد ڈھونڈ کرتا مگر تم تو میرے لیے وہ سراب تھیں جو جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔

تمہارا بڑا بھائی میری جان کے درپے ہو گیا۔ میرے ابا کو میری بہت فکر تھی سو انہوں نے واسطے دے کر مجھے بمبئی بھجوا دیا۔ میں بازی ہار کر، لٹ لٹا کر دیارِ غیر میں آ بسا مگر تم میرے حواس پر چھا گئی تھیں۔ کام کرتے ہوئے میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ جاتے اور میرے ارد گرد وہی خوشبو پھیل جاتی جو تمہارا خاصہ تھی۔ وہی مخصوص خوشبو میرے چاروں طرف چھانے لگتی میں مدہوش سا ہو کر ارد گرد سے بیگانہ ہونے لگتا۔ صرف خوشبو کا احساس ہی رہتا باقی کچھ یاد نہ رہتا کیا کر رہا ہوں، کہاں ہوں، ہوش آتا تو خود کو اپنے کمرے میں پاتا۔ میرے ساتھی کب مجھے چھوڑ کر جاتے مجھے کچھ معلوم نہ ہوتا۔ ایک دن اسی عالمِ مدہوشی میں میری ٹانگ پر گہری چوٹ لگ گئی۔ میں قریباً معذور ہو گیا۔ والد صاحب کو خط لکھا۔ انہوں نے مجھے فوراً واپس آنے کا کہا اور ان کے حکم پر واپس آ گیا۔

سال بعد واپس آیا تو بہت خوش تھا کہ چلو تمہاری صورت تمہاری خوشبو سے اپنی ذات کو معطر کر لوں گا مگر میری بدنصیبی کہ تمہاری شادی ہو چکی تھی یہ تو ہونا ہی تھا۔ تمہاری شادی کیا ہوئی میں زندہ درگور ہو گیا۔ زندگی کا کتنا ہی عرصہ یونہی گزر گیا۔ میں نہ زندوں میں رہا تھا نہ مُردوں میں مگر باپ کی جھکی کمر اور آنسوؤں سے تر چہرے نے مجھے پھر جینے پر مجبور کر دیا۔ اب میں نے ایک بڑا اسٹور کھول لیا تھا۔ جسے میں پورا وقت دیتا کاروبار چمکنے لگا۔ اسٹور پر آنے والی ہر لڑکی پر خوشبو کا گمان ہوتا میرے ارد گرد تمہاری معطر خوشبو ہر لمحہ حصار کیے رہتی۔

ایک دن حد ہی ہو گئی۔ خوشبو نے میرے ہاتھ میں لسٹ پکڑا دی۔ ''پلیز جلدی سے یہ سامان دے دیجئے مجھے بہت جلدی ہے۔'' میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ دنیا مافیہا سے بے خبر۔ ''آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔'' وہ اِک ادا سے مسکرا اٹھی۔

''تم خوشبو ہو۔ کیا شادی کے بعد ہر پہچان بھلا دی جاتی ہے۔'' میں نے کہا تھا۔

''جی میرا نام ماہ پارہ ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔'' وہ دوپٹے کا کونہ منہ میں دبا کر شرمانے لگی۔

''اوہ۔'' میں نے گہری سانس لی۔ میرے ارد گرد سے وہ مخصوص خوشبو غائب ہو گئی۔

دوسرے دن سرِ شام بن سنور کر میں اس کے دروازے پر سائل بن کر جا کھڑا ہوا۔ وہ نہ سہی اس کا پرتو تو تھا۔ میں اس پر دل و جان سے مر مٹا۔ پھر دولت اور ایمان کا زیاں ہونے لگا۔ ایک سال گزر گیا۔ جب میں ماہ پارہ سے مل کر آسودگی سے سانس لینے لگتا تو من مچلنے لگتا۔ دل کی چاہ شدید ہو جاتی کہ وہی مخصوص خوشبو مجھے اپنے حصار میں لے کر مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے مگر...... برائی کی دلدل میں ڈوب کر میں محبت کی الوہی کلیوں سے پوتر پھولوں سے زیادہ معطر خوشبو گنوا بیٹھا تھا۔ دل رونے لگتا اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ سا جاتا مگر ماہ پارہ کی شکل دیکھے بنا گزارہ نہیں تھا۔ انہی دنوں میرے ابا نے اپنی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کی قسم دے کر میری شادی کرنے کی

کاش

کاش کہ تم نے اک بار کہا ہوتا مجھ سے
کہ کچھ دن اور میرے شہر میں ٹھہر جاؤ
ابھی فصلِ بہار کی آمد ہے
ابھی تو فضاؤں میں خوشبو پھیلے گی
ابھی موسم موتیے اور رات کی رانی سے مہکیں گے
تجدیدِ وفا کی کونپلیں پھر سے پھوٹیں گی
ابھی تو شبوں میں چاندنی
چاند کے پہلو میں مچلے گی
ابھی نگاہوں میں وفا کے دیپ جھلملائیں گے
لیکن میں جانتا ہوں کہ
یہ چند دن جو تم نے میرے ساتھ گزارے
رشتوں کی پاسداری تھی
یا پھر تمہاری مجبوری؟
کاش کہ تم نے اک بار کہا ہوتا مجھ سے
کہ کچھ دن اور میرے شہر میں ٹھہر جاؤ

جاوید عثمان زندانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے استدعا کی میں نے سر جھکا دیا۔

حجلہ عروسی کی سجاوٹ قابلِ دید تھی۔ نائلہ، میری شریک حیات سر نیہوڑے پھولوں کے گہنوں اور زیورات سے لدی پھندی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میری نظریں چاروں اور نہ جانے تلاش کر رہی تھیں۔ میں شدید کشمکش کا شکار تھا۔ حقیقتوں کے عیاں ہونے پر بھی دل وہ تقاضا کر رہا تھا جو میں اسے مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ نائلہ کا گھونگٹ الٹتے ہی میرے منہ سے نکلا تھا۔ ''تم خوشبو نہیں ہو کیوں چلی آئی ہو۔ میری دنیا میں کیا رکھا ہے۔ میرے پاس بولو کیا ملے گا تمہیں اس کرچی کرچی وجود سے'' اور پھر میں اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بچوں کی مانند ہچکیوں اور آنسوؤں سے رو دیا۔

اب میں بظاہر نارمل زندگی گزار رہا تھا۔ نائلہ نے مجھے اپنی ہمدرد ہستی میں مدغم کر لیا تھا۔ وہ بن ماں باپ کی بیٹی کہاں جاتی اس لیے میرے اجڑے وجود پر بہار لانے کی پوری سعی کرنے لگی۔ میں نے بھی اسے قبول کر لیا تھا مگر اس کی قربت مجھے انگاروں پر گھسیٹ لیتی۔ کاش نائلہ خوشبو ہوتی مگر اب میرے آس پاس خوشبو نہیں ہوتی تھی۔ میرے بچوں کی آمد نے بھی میرے دل سے اس بُت کی پوجا ختم نہ ہونے دی تھی۔ وقت کا پنچھی اڑتا رہا اب بچے تقریباً جوان ہو چکے تھے۔

اس دن طبیعت میں بہت زیادہ کسلمندی تھی۔ بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو'' میں نے بے زاری سے کہا تھا۔

''عامر زیدی سے بات کرنی ہے۔''

''جی بول رہا ہوں۔'' نہ جانے آواز میں کیسی کشش تھی۔ میرا سانس رکنے لگا۔

''میں خوشبو بول رہی ہوں۔''

''اوہ......!'' میں نے گہرا سانس لیا۔ ''پورے پچیس سال بعد تم نے مجھے آواز دی خوشبو۔ کیا قصور تھا۔ کیا جرم تھا میرا۔ میں نے محبت کی تھی تمہیں چاہا تھا۔'' میں جذباتی لہجے میں تم سے شکایت کرنے لگا۔

''سنو عامر! تم مجھے کل دوپہر ریحانہ سلیم کے گھر پر ملو گے مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔''

دوسری دن سرد دوپہر میں وہ میرے روبرو بیٹھی تھی۔ وہی چمک وہی تازگی وقت نے اس پر خاص مہربانی کی تھی۔ اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اس نے میرے سامنے ڈائری رکھ دی۔ وہی عادت...... ہم ایک دوسرے سے لکھ کر بات کیا کرتے تھے۔

''عامر زیدی! میری شادی کے تذکرے اور آتے جاتے رشتوں کی بھرمار سے میں عاجز آ چکی تھی۔ تمہارا پرپوزل آیا۔ میرے ابو نے غصے میں پورے گھر کو ہلا ڈالا۔''

''اس لڑکے کو بیٹی دینے سے بہتر ہے کنویں میں دھکیل دوں۔'' انہوں نے مجھے خودکشی کی دھمکی دے کر اصرار کیا کہ میں بدنام زمانہ رئیس خان سے شادی کر لوں، وہ نام نہاد خاندان اور دولت کے پر ریجھ گئے تھے رئیس کی پہلی بیوی میرے والد صاحب کے پاس آئی۔ روتی رہی اپنے بچے کے مستقبل کا واسطہ دیتی رہی مگر ابو نے مجھے، رئیس خان کی ڈولی میں بٹھا کر رخصت کر دیا مگر یہ ڈولی نہیں جنازہ تھا۔ رئیس خان نے مجھے چند ماہ تک کھلونا سمجھ کر مجھ سے خوب کھیلا۔ جی بھر گیا تو اپنی اصلیت پر اتر آیا۔ پہلی عورت کو اس نے چھوڑ دیا تھا کیونکہ عورت چھوڑنا، رکھنا اس کے نزدیک ایک کھیل تھا۔ عورت اس کی نظر میں جوتی کے برابر تھی۔ پچیس سال تک وہ اپنی باتوں سے مجھے قطرہ قطرہ زہر پلاتا رہا۔ طعنے، تشنے، مار کٹائی...... اس کا پُر غرور رویہ میری روح کو چھلنی کرتا گیا۔ میں بے موت مرتی گئی۔ جی جی کر مرنا مر مر کر جینا۔ اللہ کا شکر ہے۔ بچے سعادت مند ہیں۔ یہ انمول موتی میری تاریک راہوں میں مجھے جینے کا راستہ بتاتے ہیں۔ رئیس خان بظاہر دولت مند تھا لیکن وہ دل کا غریب تھا۔ چند روپے بھی گن گن کر رلا رلا کر خرچ کرتا۔ میں رشتہ داروں سے ادھار لیتی۔ زیور بیچتی تب بچوں پر خرچ کرتی۔ میرے بچے پیسے کی کمی سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ گئے۔ میں اکثر ایک خواب دیکھا کرتی۔ ایک جنگل بیاباں ہے۔ جہاں تم مجھے آواز دیتے ہو۔ میں آواز کا جواب دینا چاہتی مگر باوجود کوشش کے ایسا نہیں کر پاتی۔ پچھلے چند سالوں سے میری ذہنی حالت ابتر رہنے لگی۔ میں ماہر نفسیات کے پاس گئی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک اللہ والے سے رابطہ ہوا، وہ کہنے لگے۔''

''تم نے شاید کسی کا دل توڑا ہے۔ جاؤ اس سے معافی مانگ لو۔ اللہ تمہیں سکون دے گا۔''

''عامر زیدی! میرا باپ گھر میں تنہا روتے تڑپتے مر گیا۔ اس کے پاس کوئی بھی پانی پلانے والا موجود نہ تھا۔ رئیس خان اسے غریب شخص سمجھ کر اپنے گھر نہیں لاتا تھا۔ عامر زیدی! ہم باپ بیٹی کو معاف کر دو۔ میں ہاتھ جوڑ کر تم سے اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتی ہوں۔''

''تمہاری خوشبو، جو ہمیشہ خوشبو کے معطر پن سے محروم رہی۔''

مجھے یوں لگا کہ ایک ریلا میری طرف بڑھ رہا ہے۔ خوشبو سے اٹا ریلا میں مدہوش ہونے لگا۔

اس سے پہلے میں پوری طرح خود سے بے گانہ ہو جاتا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکا ہے۔ میں نے تمہیں معاف کیا تم بھی مجھے معاف کر دینا۔'' میں نے ڈائری کا آخری جملہ پڑھ کر اس کی جانب دیکھا تو وہ گویا ہوئی۔

''تو عاطقہ درانی اس نے مجھے معاف کر دیا۔ یقین کرو تب سے میرے شب و روز بدل گئے میرے دل میں ایک سکون اترتا چلا گیا میں دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد ہوتی گئی۔ اللہ سے لو لگا لی اللہ نے دامن بھر دیا۔ اب تو صرف آخرت کا سامان بنانے کی فکر ہے کہ اس دنیا میں سکون نہیں ملا۔ ابدی زندگی میں تو قرار کی دولت مل جائے پڑھنے والوں سے استدعا ہے خدارا کسی کا دل نہ توڑیں ورنہ زندگی مسلسل جبر بن جاتی ہے۔ جس طرح میری زندگی بن گئی تھی مگر شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سکون کی دولت سے نواز دیا۔ اب میری روح مطمئن ہے۔ رئیس خان سے میں نے خلع لے لی ہے۔ کیونکہ یہ میرا حق تھا۔ یقین کرو پچیس سال میں نے مجبوراً اس کی سیج سجائی۔ اپنی نسوانی شرم و حیا کو قتل کر کے پہلے اسے منائی تو وہ فاتح بن کر کہتا ''یہ تمہارا فرض ہے اچھا کرتی ہو مجھے منا لیتی ہو۔ کئی کئی ماہ وہ مجھ سے بے گانہ رہتا اور مجھے شرم حیا کا زیور اتار کر اس کی سیج سجانی پڑتی۔ میری روح فریاد کرتی، اللہ عورت اتنی ارزاں ہے کہ اس کا مرد دو لفظوں کی بھیگ بھی اسے نہیں دے پاتا'۔

پھر ایک دن میرے اندر سے اپنا حق لینے کی آواز اٹھی اور میں پرسکون ہو گئی۔ میں نے اپنے طور پر خلع حاصل کر لی اور ہمیشہ کے لیے اس کی کانٹوں بھری سیج سے نجات حاصل کر لی۔ اب میں دنیا سے ایک طرح سے کنارہ کش ہوں۔ دعا کرو میرا سکون برقرار رہے اور آخرت کے لیے میرے پاس سامان بن جائے۔''

وہ خاموش ہو گئی تھی اور میں جو پچھلے پچیس برسوں سے اس کے ساتھ تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے آج ہی اس سے ملی ہوں۔ اس کے اندر کی ایک نئی عورت میرے سامنے تھی وہ عورت جس نے اپنی زندگی کو آگ کے دریا کی مانند عبور کیا تھا۔

❄

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



جگ بیتی — اس دنیا میں سانس لیتے لوگوں کی زندگی کا حال اور مآل سناتی کہانیاں

اصفا فیصل

نظر آتے ہیں کچھ

قتیل شفائی کا خیال

جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

چہروں پر نقاب چڑھا کر دھوکہ دینے والے لوگوں کی روداد ستم



''اوئے' کیا عمر ہے تیری؟ بتا' چپ کیوں ہے؟'' انسپکٹر نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''کب سے چل رہا ہے یہ سب؟ اوئے' بتا' یہ سکھایا ہے تیرے ماں باپ نے؟''

''ہاں' یہی سکھایا ہے میرے ماں باپ نے۔'' اویس نے انسپکٹر کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوئے' زبان چلاتا ہے؟'' انسپکٹر نے ڈنڈا رسید کردیا۔ ''چل بھئی سکندر' ڈال اس کو لاک اپ میں' دیکھتے ہیں کتنے بڑے باپ کی اولاد ہے جو اکڑ رہا ہے۔''

•......•......•......•

''ارے قاسم' رکو' کہاں جارہے ہو؟'' ایک محلے دار نے قاسم کو روکتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا بھائی؟'' قاسم نے پلٹ کر پوچھا۔

''تمہارے بیٹے کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔''

''اویس کو...... کیوں؟''

''وہ موبائل چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔''

''نہیں' اویس ایسا نہیں کرسکتا۔''

''تم خود جاکر دیکھ لو' صدر والے تھانے لے کر گئے ہیں۔''

•......•......•......•

''صاحب' میرے بیٹے کو آپ لوگوں نے پکڑا ہوا ہے' اس نے کچھ نہیں کیا۔ مہربانی کریں صاحب' اسے چھوڑ دیں۔'' اویس کا باپ انسپکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''سکندر' ارے او سکندر' کہاں مرگیا؟''

''حاضر سر......'' سکندر جلدی سے اندر آیا۔

''دیکھو اس کو' کون ہے یہ؟ ہر ایک کو اندر بھیج دیتے ہو؟''

''کون ہو بھئی' کیا مسئلہ ہے؟'' سکندر نے پوچھا۔

''جناب' میرے بیٹے کو موبائل چوری کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔''

''اوئے ہوئے شاباشے بھئی' یہاں آؤ...... تو' تو کوئی ایویں ہی چیز ہے' میں سمجھا کوئی کمال چیز ہوگا جو اتنا اکڑ رہا تھا تیرا بیٹا۔ رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اسے...... جھوٹا الزام نہیں ہے۔''

''صاحب' بچہ ہے' غلطی ہوگئی ہوگی' آپ بڑے لوگ ہو' معاف کرو' اسے چھوڑ دو' آپ جو کہو گے' میں کروں گا' کوئی چائے پانی......'' قاسم کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ انسپکٹر نے اسے ڈنڈا جڑ دیا تھا۔

''بند کرو اس کو بھی لاک اپ میں' قانون کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔''

''ارے' ارے صاحب' آپ کیوں بلڈ پریشر بڑھاتے ہیں؟ چھوڑیں سر' میں دیکھتا ہوں۔'' سکندر' انسپکٹر کو آنکھ مارتے ہوئے بولا۔

''اے او' چل' باہر آ......''

''صاحب' رحم کرو۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔''

''چلو نکلو باہر......''

''صاحب' خدارا' میری بات تو سنیں۔'' سکندر' قاسم کو تھانے سے باہر لے آیا تھا۔

''شکر کرو کہ صاحب نے تم کو چھوڑ دیا ورنہ ایسی بات' وہ بھی تھانے میں' تمہارا دماغ تو خراب نہیں؟ چلو بھاگو یہاں سے......''

''صاحب' رحم کریں' میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں مرجاؤں گا۔ دوستوں کے بہکاوے میں آگیا ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں' آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔''

''اچھا دیکھو' تم شریف آدمی لگتے ہو' چلو ایسا کرو'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک لاکھ روپے لے آؤ اور بیٹے کو گھر لے جاؤ۔‘‘

’’ایک لاکھ تو بہت ہیں سر‘ کچھ رحم کریں۔‘‘

’’کیا بلی کا بچہ خرید رہے ہو جو ایک لاکھ بہت ہیں؟ دیکھو‘ رحم کر رہا ہوں اسی لیے ایک لاکھ کہہ رہا ہوں۔‘‘

’’صاحب‘ آپ کو اللہ اور رسولؐ کا واسطہ‘ کچھ تو رحم کریں۔‘‘

’’پھر ٹھیک ہے‘ تم ایسے نہیں مانو گے‘ دیکھو‘ بحث کرو گے تو رقم بڑھتی جائے گی۔ لانا ہے تو لاؤ‘ ابھی ایف آئی آر نہیں کاٹی۔ کٹ گئی تو عدالت کے چکر لگاتے رہنا‘ قتل‘ دہشت گردی‘ نجانے کون کون سے جرم کی دفعہ لگے گی۔ یہ تو تم بھلے آدمی لگتے ہو اسی لیے اتنے کم مانگ رہا ہوں بلکہ رہنے دو‘ تم جاؤ‘ میں ابھی ایف آئی آر کاٹتا ہوں‘ نمٹتے رہنا۔‘‘ سکندر اندر جانے لگا۔

’’ارے نہیں صاحب‘ میں کچھ کرتا ہوں‘ آپ ناراض نہ ہو‘ کچھ مہلت تو دیں نا۔‘‘

’’دو دن بس۔‘‘

•......•......•......•

’’کدھر رہ گئے تھے اویس کے ابو؟ میں کب سے پریشان ہوں‘ کچھ پتہ چلا اویس کا؟ دیکھیں نا‘ یہ سب لوگ جھوٹ کہہ رہے ہیں‘ ہمارا اویس ایسا نہیں کر سکتا۔‘‘

قاسم شکستہ قدموں سے مایوس سا چارپائی پر بیٹھ گیا۔

’’بتایئے نا‘ چپ کیوں ہیں؟‘‘

’’ایک لاکھ مانگے ہیں‘ کہاں سے دوں؟‘‘

’’ہائے...... ایک لاکھ......؟ اب کیا کریں؟‘‘ اویس کی ماں نے فکرمندی سے کہا۔

•......•......•......•

’’بہت چھوٹی عمر کا ہے تو۔ کیا‘ کیا ہے تو نے؟‘‘ لاک اپ میں بند ایک لڑکے نے اویس سے پوچھا۔

’’چوری کی ہے......‘‘

’’ابے...... پہلے کسی سے سیکھ تو لیتا پھر یہ کام کرتا‘ اب کیا فائدہ؟ اندر بیٹھا ہے۔‘‘

’’سیکھی تو ہے‘ میرے ماں باپ نے سکھایا ہے۔‘‘

’’پاگل ہے کیا‘ کسی کے ماں باپ اس کو چوری کرنا نہیں سکھاتے۔‘‘

’’سکھاتے نہیں تو روکتے بھی نہیں ہیں۔‘‘ اویس کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

•......•......•......•

قاسم پریشان سا سب لوگوں سے ادھار مانگتا پھر رہا تھا اور ساتھ تھانے کے چکر بھی لگا رہا تھا۔

’’صاحب‘ ایک دفعہ ملوا تو دیں مجھے اویس سے۔‘‘ قاسم نے سکندر کی منت کی۔

’’تمہیں ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی؟ ایسا غائب کرا دوں گا تیرے بیٹے کو کہ شکل دیکھنے کو ترسے گا۔‘‘ سکندر نے بھڑکتے ہوئے کہا۔

’’نہیں صاحب‘ ایسا ظلم نہیں کریں‘ میں پیسوں کا انتظام کر رہا ہوں۔ آپ بس کچھ دن دے دیں۔‘‘

’’چل نکل یہاں سے...... ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس اور ایک لاکھ ہی مانگا ہے‘ کوئی خزانہ تو نہیں مانگ لیا۔ وکیل بھی کرو گے تو اس سے زیادہ خرچہ ہوگا‘ بس کل تک پیسے مل جانے چاہئیں۔ میں خود تنگ آ گیا ہوں تیرے بیٹے سے‘ نفسیاتی مریض ہے تیرا بیٹا......‘‘

’’صاحب...... ایسا مت کہیں...... میں کرتا ہوں کچھ۔‘‘

•......•......•......•

قاسم بیوی کے زیور بیچ کر بھی پیسے پورے نہیں کر پایا تھا اور بہت پریشان تھا۔ ابھی بھی اپنے

لے کی دکان پر کھڑا اس کی منت کر رہا تھا کہ دکان ڑے ایک آدمی نے اس کے جانے کے بعد ن دار سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ پوری بات سن اس آدمی نے کہا۔

’’میں ایک رپورٹر ہوں‘ تم مجھے قاسم کے گھر ،چلو‘ شاید کوئی حل نکل آئے۔‘‘

قاسم کا سالا اس رپورٹر کو لے کر قاسم کے گھر لیا۔

’’یہ تمہاری کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ قاسم کے لے نے اس سے کہا۔

’’جی فرمایئے۔‘‘ قاسم نے رپورٹر کی جانب ہن آمیز نظروں سے دیکھا۔

’’میرا نام علی ہے۔ دیکھیے‘ میں آپ کی مدد کرنا ہتا ہوں‘ بس جیسا میں کہوں‘ آپ ویسا ہی کیجیے۔‘‘ رپورٹر نے کہا۔

’’نہیں صاحب‘ میں ان چکروں میں نہیں پڑنا ہتا‘ آپ لوگ برائے مہربانی یہاں سے چلے ئیں۔‘‘

’’دیکھو‘ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا‘ میں تو انسانی ردی میں آ گیا ہوں‘ میرا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم نے ان کی بات مان لی تو یہ ہمیشہ اسی طرح تنگ رتے رہیں گے۔‘‘

’’آپ لوگ جاؤ صاحب‘ اگر مدد ہی کرنی ہے کچھ ادھار دے دو‘ میں بعد میں چکا دوں گا‘ ہم یسے ہی بہت پریشان ہیں۔‘‘

’’تم پریشان نہ ہو‘ رشوت لینے کے الزام میں سپکٹر پر مقدمہ چل سکتا ہے۔ تمہارے بیٹے کو کچھ نہیں دگا‘ وہ چھوٹ جائے گا۔‘‘ علی نے قاسم کو سمجھاتے وئے کہا۔

’’مگر صاحب......‘‘

’’تم میڈیا کی طاقت کو نہیں جانتے‘ اگر واقعی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی تو تم دیکھنا کہ وہ کس بری طرح پھنستے ہیں‘ بس تم ہمارا ساتھ دو‘ ہم تمہارا بیٹا بھی چھڑوائیں گے‘ پیسے بھی دیں گے‘ اس کی پڑھائی اور جاب میں بھی مدد کریں گے۔‘‘

’’آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟‘‘

’’ہاں‘ بالکل سچ‘ آپ ٹی وی نہیں دیکھتیں؟ ہم جو دکھانا چاہیں‘ جو سمجھانا چاہیں‘ عوام وہی دیکھتی اور سمجھتی ہے۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔‘‘

’’صاحب‘ دیکھ لیں‘ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو؟‘‘ قاسم نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

•......•......•......•

’’بس اب اس لڑکے کا کوئی بندوبست کرو۔‘‘ انسپکٹر نے سکندر سے کہا۔

’’سر‘ آج رات رک جائیں‘ بس کل تک کچھ نہیں ہوا تو بڑا پکا بندوبست سوچ کر رکھا ہے۔‘‘

’’کل ول نہیں‘ جو کرنا ہے‘ آج کرو‘ مجھے اوپر بھی جواب دینا ہوتا ہے۔‘‘

’’سر‘ آپ فکر ہی نہ کرو‘ حلوہ تو سارا آپ کو ہی ملے گا‘ بس ہم تو ایک نوالہ لیں گے۔‘‘

’’تیرا نوالہ پتہ ہے مجھے‘ یہ چھوٹے موٹے چکر فوراً نمٹایا کرو‘ خواہ مخواہ گلے میں نہ اٹک جائے۔‘‘

’’بس آپ بھروسہ کرو‘ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔‘‘ سکندر نے چاپلوسی سے کہا۔

•......•......•......•

’’سکندر صاحب‘ پیسوں کا بندوبست ہو گیا ہے لے آؤں؟‘‘ قاسم نے سکندر سے فون پر بات کرتے ہوئے پوچھا۔

’’پگلا گیا ہے کیا‘ میری مس بیل کا انتظار کرنا‘ جیسے ہی مس بیل دوں‘ پیسے لے کر پہنچ جانا۔ میں راؤنڈ پر اسی پل پر ملوں گا‘ دیر بالکل نہ کرنا۔‘‘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور میرا بیٹا؟''

''وہ بھی موبائل میں ہوگا' اسی وقت چھوڑ دیں گے۔''

•......•......•......•

''قاسم' سب سمجھ گئے ہو نا؟'' علی نے قاسم کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سب سمجھ گیا' بس آپ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

''تم بالکل نہ گھبراؤ' تمہاری گھبراہٹ کام خراب کر سکتی ہے' یہ لوگ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔''

''نہیں صاحب' میں گھبرا نہیں رہا۔''

''چلو' اب تم یہ لفافہ پکڑو' جلدی کرو' ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

•......•......•......•

جوں ہی قاسم نے سکندر کو لفافہ تھمایا' لائٹس' کیمرہ سب آن ہوگیا۔

''میں علی' کراچی سے' جی ناظرین! آپ اس وقت ''ہمارا'' چینل سے لائیو دیکھ سکتے ہیں' موبائل میں موجود اس لڑکے کو پولیس نے پکڑا ہوا ہے اور سب انسپکٹر سکندر کو اس وقت رنگے ہاتھوں رشوت لیتے ہوئے دکھایا جا رہا ہے۔''

''جی' آپ دیکھ سکتے ہیں' ہاں بتائیے' کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ؟'' علی نے مائیک قاسم کے سامنے کیا۔

''کیا بکواس ہے' ہٹو یہاں سے' بند کرو یہ بکواس......'' سکندر' علی کو دھکیلتا ہوا موبائل میں جا کر بیٹھ گیا اور موبائل چلی گئی۔

''پولیس والے نے ایک صحافی پر ہاتھ اٹھایا' اسے کام کرنے سے روکا' جی ناظرین! آپ ''ہمارا'' چینل سے لائیو دیکھ سکتے ہیں۔''

''یہ ہے وہ مظلوم باپ جس کے بیٹے نے کچھ بھی نہیں کیا اور اسے پولیس نے صرف پیسوں کے لالچ میں پکڑ لیا۔ یہ ہمارے ملک کا قانون ہے۔ اگر یہ جرم کسی امیر باپ کے بیٹے نے کیا ہوتا تو ہمیں کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی' کسی اور کا گناہ اس مظلوم باپ کے بیٹے پر تھوپا جا رہا ہے۔ یہ دیکھیے' نوٹوں سے بھرا ہوا لفافہ' آپ دوبارہ وہ فوٹیج دیکھیں جس میں سب انسپکٹر سکندر اس مظلوم باپ سے خود لفافہ لے رہا تھا مگر میڈیا کو دیکھتے ہی بھاگ گیا مگر ہم سچ آپ تک پہنچاتے رہیں گے' رہیے سچ کے سفر میں ہمارے ساتھ' ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔''

•......•......•......•

ادھر انسپکٹر کو فون پر فون آنے شروع ہوگئے۔ وہ بہت پریشان تھا۔

''سکندر' تمہیں پتہ ہے' یہ کیا ہوگیا ہے؟ مجھے اوپر سے فون آ رہے ہیں۔ کیا مصیبت کھڑی کر دی؟ نوکری جا سکتی ہے میری تیری وجہ سے۔ ایف آئی آر کاٹو اس کی۔ کیا کہوں گا میں' کیوں موبائل میں لے کر گھوم رہے تھے اسے؟ میں تمہارا حشر کر دوں گا۔''

''سر' پلیز' کچھ سوچیں' کچھ کریں' بھوسا بھرا ہے میرے دماغ میں' پلیز سر' غلطی ہوگئی' میرے باپ کی توبہ۔''

''تم سے کہا بھی تھا یہ چھوٹے مسئلے کبھی کبھی گلے میں اٹک جاتے ہیں۔ خیر' میں نے بھی پکا کام کر دیا ہے' بس اب یہ اویس' چینل والوں کو ہینڈل کر لے اور تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

•......•......•......•

''جی ناظرین' ہم اس وقت تھانے میں موجود ہیں' آئیے اویس سے کچھ پوچھتے ہیں۔ جی اویس' بتائیے' آپ کو بے گناہ انہوں نے پکڑا ہے' آپ کو ٹارچر تو نہیں کیا؟''

اویس نے عجیب سی نظروں سے جم غفیر کو ...

''ہاں میں نے چوری کی ہے اور یہ سب میرے ...باپ کی تربیت کا نتیجہ ہے۔''

''جی ناظرین' آپ دیکھ سکتے ہیں' اس کو کتنا ...ٹارچر کیا گیا ہے کہ یہ بے چارہ خود ہی اقبال جرم کر رہا ...اس گناہ کا جو اس نے کیا ہی نہیں۔'' علی نے ...رے کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ہمارے ساتھ ہی رہیے گا' ملتے ہیں ...ب کے بعد......''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے اویس' ہم تمہیں چھڑوانا ...تے ہیں اور تم یہ کیا الٹا سیدھا بول رہے ہو؟''

''میں صحیح کہہ رہا ہوں' یہ میرے ماں باپ ہیں ...ب میں چھوٹا تھا اور اسکول سے چیزیں چرا کر لاتا تو انہوں نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ یہ چیزیں ...ں کہاں سے لا رہا ہوں؟ پوچھیں ان سے میرے ...ب نے کبھی یہ نہیں پوچھا یہ نئی گھڑی' کلر بکس' ...لکولیٹر' پین' کتابیں' کھلونے' یہ سب کہاں سے ...؟''

قاسم تڑپ کر بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے ...ہیں بڑے اسکول میں ڈالا تا کہ تم پڑھ لکھ کر بڑے ...می بنو۔''

''ہاں' ہاں' یہی غلطی تھی جب میں غریب تھا تو ...وں امیروں کے اسکول میں ڈالا؟ وہ ماحول ...ایا جس کو پانے کی خواہش میں حرام حلال بھول ...وں' کیوں نہیں روکا مجھے جب میں نے پہلی بار ...ئی چیز چرائی؟ بتائیے' کیا آپ نہیں جانتے تھے ...ہ یہ جو چیزیں میرے پاس ہیں' میں چرا کر لایا ...ں۔'' بیٹے کی بات پر قاسم نے شرمندگی سے سر ...کالیا۔

اسی وقت علی کا موبائل بجا۔ ''جی سر' مگر سر' سمجھ گیا سر' اوکے سر......''

باپ' بیٹا گرفتار' ماں بھی شامل تفتیش' یہ گروہ ملک ... چوریاں اور ڈکیتیاں کرتا تھا اور پھر انہوں نے ... لمبا ہاتھ مارا جائے لہٰذا کسی مخالف پارٹی سے پیسے لے کر سب انسپکٹر پر رشوت کا الزام لگایا مگر بچہ کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے سچ بول گیا۔

''یہ خبر سب سے پہلے ''ہمارا'' چینل نے نشر کی' پہلی خبر کے لیے معذرت کیونکہ وہ پری پلان تھا۔ دیکھیے' آپ وہ فوٹیج دوبارہ دیکھیے۔ جیسے ہی انسپکٹر نے اس لڑکے کو چوری کرتے ہوئے پکڑا' اس کے باپ نے ''ہمارا'' چینل کو جھوٹا فون کر دیا اور خود پیسے لے کر روڈ پر کھڑا ہوگیا۔ جیسے ہی موبائل پل پر پہنچی' اس کے سامنے آ گیا' سب انسپکٹر سکندر نے موبائل سے اتر کر چیک کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ اسی وقت ہماری ٹیم وہاں پہنچی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ''ہمارا'' چینل پوری انویسٹی گیشن کرتا ہے' تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آئی اور اس لڑکے کے اقبال جرم سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ الیکشن میں مخالف پارٹی کو کمزور کرنے کے لیے یہ سازش کی گئی تھی۔ اس کی مزید تحقیقات کرائی جا رہی ہیں۔ سچ کے سفر میں ہمارے ساتھ رہیے گا۔ علی کو اجازت دیجیے۔''

•......•......•......•

سیاسی پارٹی کا نمائندہ انسپکٹر کو ڈانٹ رہا تھا۔ ''بڑی مشکل سے یہ معاملہ دبایا ہے' آئندہ ایسا کچھ بھی ہوا تو نظر نہیں آؤ گے۔''

کچھ دن تک اس معاملے کو خوب اچھالا گیا پھر بات پرانی ہوگئی۔ چند دن بعد ایک خبر ایک چھوٹی سی سلائیڈ میں چلی۔

''ہمارا'' چینل کے رپورٹر علی کو سچ تو سچ ہے کا اینکر بنایا جا رہا ہے' ساتھ ہی دبئی میں لگژری فلیٹ بھی دیا جا رہا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY SUNDAY AT 8:00PM
ہوئے بیگانے کیوں
PRESENTS

سائرہ غفار

بازگشت کی گونج میں

صفیہ سلطانہ مغل کا خیال

عمر ساری میری وعدوں پہ بہلتے گزری
کوئی پیمانِ وفا اَب تو نبھایا جائے

میاں بیوی کے تعلق سے جڑا ایک سبق آموز قصہء خاص



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ارے کیا ہوا بھئی، تم ابھی تک یونہی بیٹھی ہو؟'' مما نے سدرہ کو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے یا تو فوراً ٹوکا۔

''تو کیا کروں مما، لڈی ڈالوں یا بھنگڑا ڈانس کروں؟''

''ہر وقت مذاق سوجھتا رہتا ہے تمہیں تو۔ میں حنا اور آمنہ کو اندر بھیجتی ہوں، وہی تمہیں تیار کریں گی۔'' مما بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں سدرہ نے اپنی ڈائری کھول لی۔ کچھ ہی دیر میں کی کزنز آمنہ اور حنا کمرے میں حاضر ہو گئیں۔

''غضب خدا کا، لڑکی، لڑکے والوں کے آنے میں محض دس، پندرہ منٹ ہی ہیں اور تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟'' حنا نے اس کی الماری کھولتے ہوئے کہا۔ سدرہ نے کاہلی سے انگڑائی لیتے ہوئے بالوں کا جوڑا بنایا تو آمنہ نے فوراً ٹوک دیا۔

''کیا کر رہی ہو؟ سارے بالوں کا ستیاناس ہو جائے گا۔ چھوڑو بالوں کو، میں اور حنا ابھی تمہارا حلیہ درست کرتے ہیں۔''

''خود تو مزے سے منگنیاں کر کے بیٹھ گئی ہو اور وہ بھی اپنے اپنے کزن سے اور میرے لیے کوئی بچا ہی نہیں؟ یہ بیکار کی مصیبت ضرور بیٹھے بٹھائے گلے پڑ گئی۔'' سدرہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''میری جان، یہ بیکار کی مصیبت نہیں، شادی تو بہرحال آپ نے کرنی ہی ہے تو خالصتاً مشرقی طریقے سے ہو رہی ہے تو قباحت ہی کیا ہے یار؟'' آمنہ نے مسکراتے ہوئے میک اپ باکس کھولتے ہوئے کہا۔

حنا نے گلا کھنکھار کر کہا۔ ''دیکھو، چلنا اس طرح ہے۔'' اس نے لنگڑانے کی ایکٹنگ کی۔

''اور دیکھنا اس طرح۔'' آمنہ نے آنکھیں ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جب بیٹھنے لگو تو گر جانا پھر کہنا آئی ایم سوری، مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آتا۔'' سدرہ بے اختیار ہنس پڑی۔ اس کے گال کے ڈمپل واضح ہو کر اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔

''ویسے سدرہ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی بھی اسے اس طرح سر جھاڑ منہ پہاڑ دیکھے گا تو بھاگ جائے گا۔'' آمنہ اور حنا ہنسنے لگیں۔

''کتنا جیلیس ہوتی ہو تم لوگ میرے حسنِ بے مثال سے۔'' سدرہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''لو اور سنو بھئی، بھوتنیاں بھی حسنِ بے مثال رکھتی ہیں؟'' حنا نے ہنستے ہوئے کہا تو سدرہ نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈائری حنا کو دے ماری۔ حنا کی کمر دوہری ہو گئی، وہ چیخنے لگی۔

''اوئی...... اللہ جی......!'' اسی وقت مما دوبارہ کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے حنا اور آمنہ کو دیکھا۔

''میں نے تم لوگوں کو جس کام سے بھیجا تھا، اسے چھوڑ کر تم لوگ گپیں ہانک رہی ہو؟''

''وہ...... آنٹی، ہم تو کب سے سدرہ کو تیار ہونے کا کہہ رہے ہیں مگر یہ ٹس سے مس ہی نہیں ہو رہی۔'' آمنہ فوراً بولی۔ سدرہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''یہ دیکھیں ناں آنٹی، ہم تو کپڑے وغیرہ لیے تیار کھڑے ہیں مگر رانی صاحبہ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' حنا نے ہاتھ میں پکڑے کپڑے دکھاتے ہوئے کہا تو مما نے فوراً اپنی توپوں کا رخ سدرہ کی طرف موڑ لیا۔

''سدرہ، کیا تماشہ لگا رکھا ہے تم نے آخر؟ میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی، میں دس منٹ بعد کمرے میں آؤں گی تو تم مجھے تیار ملو، سمجھیں؟'' مما کے لہجے میں کچھ ایسا رعب تھا کہ سدرہ سہم سی گئی۔ اس نے فوراً

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اثبات میں سر ہلایا۔ مما کے جاتے ہی وہ فوراً کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔ آمنہ اور حنا نے اسے میک اپ کروایا' بال سیٹ کیے اور اسے تیار کر کے اس کا ابھی تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں کہ مما دوبارہ آ گئیں۔

''ماشاءاللہ! چشمِ بددور' آج تو میری گڑیا بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔'' مما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سدرہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ باہر سے پپا کی آواز سنائی دی۔

''ارے بھئی عالیہ بیگم' کہاں رہ گئیں آپ؟ بھئی' لڑکے والے آ گئے ہیں' جلدی تشریف لے آیئے۔'' مما فوراً باہر کو دوڑیں۔ آمنہ اور حنا بھی ٹیرس کی طرف لپکیں تا کہ ہونے والے دلہے میاں کا دیدار کر سکیں۔ سدرہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی آ گئی تھی۔

آمنہ نے گاڑی سے اترتے لڑکے کو دیکھ کر منہ بنایا۔ ''ارے یہ کیا؟ یہ اس عمر میں شادی کرے گا کیا؟'' سدرہ نے اس کی نظروں کی تعاقب میں دیکھا تو ایک پچاس سالہ بوڑھے پر نگاہ ٹھہر گئی پھر یکدم ہی وہ بوڑھا ہٹا تو پیچھے کا منظر نظر آیا۔

وہ تقریباً اسی کا ہم عمر تھا' بہت ہی ہینڈسم جیسا کہ بالعموم ڈائجسٹ کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ آمنہ اور حنا ابھی تک اس بوڑھے کو ہی ڈسکس کر رہی تھیں۔ لڑکے کی نظر اوپر اٹھی اور ٹیرس میں ایستادہ سدرہ پر جم کر رہ گئیں پھر اس لڑکے نے سدرہ کو دیکھ کر نگاہیں جھکا لیں۔ سدرہ کو اس کی نگاہوں کا تاثر بہت ہی عجیب سا لگا۔ تھوڑی دیر بعد سدرہ لڑکے والوں کے درمیان بیٹھی لڑکے کی ماں اور بہن کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ نروس تھی کیونکہ یہ اس کی بیس سالہ زندگی میں پہلا تجربہ تھا جب وہ یوں پرکھی جا رہی تھی۔ اسے اندر ہی اندر جیسے خوف کا آکٹوپس جکڑے جا رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے یہ مرحلہ اختتام پذیر ہوا اور لڑکے والے اپنے گھر سدھارے اور سدرہ اپنے کمرے میں مگر اس لڑکے کی عجیب نگاہیں اس کی سوچ میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ سدرہ سے اس کا یوں نظر ڈالنا بھول نہیں پا رہا تھا۔ اگلے دن لڑکے والوں کا فون آیا تو مما اور پاپا کو جیسے چپ سی لگ گئی۔ انہوں نے سدرہ کو کچھ نہ کہا مگر ان کے رویئے میں فرق آ گیا تھا۔ سدرہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پریشان بھی تھی کیونکہ یکا یک اس کے مما پاپا اس سے بالکل بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ کچھ دنوں میں اس کے بی اے کے امتحانات تھے اور گھر میں تناؤ کی سی کیفیت تھی' وہ ٹھیک سے پڑھائی پر دھیان بھی نہیں دے پا رہی تھی۔

ایک دن اس کی خالہ جو کہ حنا کی والدہ تھیں' اُن کے گھر آئیں تو کچن میں اُن کے لیے چائے بناتے ہوئے سدرہ نے اُن کی باتیں سن لیں۔

مما' خالہ کو بتا رہی تھیں۔ ''بس آپا' مت پوچھیں' جب بھی اس بات کو یاد کرتی ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔''

''پھر بھی پتہ تو چلے کہ آخر بات کیا ہوئی؟ بھئی' ویسے تو تم نے بڑی تعریفیں کی تھیں کہ لڑکا خوبرو ہے' پڑھا لکھا ہے' خاندان شریف ہے' اے پھر کیوں منع کر دیا؟'' خالہ نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔ مما اور خالہ بالکل سہیلیوں کی طرح تھیں۔ مما ان کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگیں اور ان کی باتوں نے سدرہ کے اندر دھماکے سے کر ڈالے۔

''آپا' وہ اس دن جب خاور بھائی اپنے بیٹے عماد کے ساتھ سدرہ کو دیکھنے آئے تو سدرہ' آمنہ اور

ـے کے ساتھ ٹیرس پر کھڑی اُن لوگوں کو دیکھ رہی تھی' ـ کیا بتاؤں آپا' لڑکے کو سدرہ کی یہ حرکت اچھی ـں لگی ورنہ خاور بھائی کی بیگم رضیہ باجی تو سدرہ بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے سدرہ ـ لیے ایک دو بہت ہی اچھے گھروں کا بتایا ہے مگر ـے اور سدرہ کے پاپا کو بس اُن کے وہ لفظ نہیں ـ لتے۔''

''تمہیں کون سی بات نہیں بھولتی آخر؟'' خالہ ـے پوچھا۔

''جب رضیہ باجی نے مجھے فون کیا تھا' وہ سدرہ ـے بارے میں بات کر رہی تھیں' تب ان کے بیٹے ـ دنے پیچھے سے زور سے کہا تھا کہ امی......! ان کو ـھی بتا دیجیے گا کہ شریف گھرانوں کی بیٹیوں کو یوں ـرس سے غیر مردوں کو تاک جھانک کرنا زیب نہیں ـتا' ایسا تو خراب لڑکیاں کرتی ہیں' بس آپا' یہ خراب ـکیوں والے الفاظ نے میرا اور سدرہ کے پاپا کا جینا ـبے حرام کر دیا ہے' گلے میں مانو' کوئی پھانس سی اٹک ـئی ہو۔''

''اس کی ہمت کیسے ہوئی ہماری بچی پر انگلی ـھانے کی؟ اور تم نے اور ایاز بھائی نے...... کمال ـرتے ہو تم لوگ بھی۔ کوئی کچھ بھی کہے گا اور تم لوگ ـے حرف آخر مان لو گے؟'' خالہ جوش سے بولیں۔ ـما خاموش رہیں۔ خالہ ان سے لڑ رہی تھیں اور سدرہ ـچن میں چکرا کر گر پڑی تھی۔ ہوش و حواس سے ـیگانہ ہوتے ہوئے اس کے دل میں یہی دُعا تھی کہ ـے اللہ! اب مجھے حشر میں ہی اٹھانا مگر شاید وہ ـبولیت کی گھڑی نہیں تھی۔

سدرہ نے آنکھیں کھولیں تو اس کے گھر والے ـیسے دوبارہ سے جی اٹھے۔ مما پاپا کے چہرے پر خوشی ـکی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اسے خوب لاڈ پیار کیا جیسے ـپہلے کرتے تھے مگر سدرہ کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ



یہ جز وہ بے رخی اور اجتناب کیا دے گا
سلام تک نہیں کرتا جواب کیا دے گا

وہ رنگ خوشبو ہمیں بے حساب کیا دے گا
جو خار بن کے جیے وہ گلاب کیا دے گا

کسی کی چاہ میں کس طرح کوئی ڈوب گیا
جواب اس کا بھرتا چناب کیا دے گا

حیات اس کی عجب ایک کورا کاغذ ہے
گناہ کرتا نہیں جو حساب کیا دے گا

وہ جس کی فکر و نظر میں نہیں ہے شادابی
وہ نسلِ نو کو اچھا نصاب کیا دے گا

جو لکھ رہا ہے جمود و سکوت کی توصیف
وہ ذہن و دل کو کوئی انقلاب کیا دے گا

لپکتا شعلہ ہے آواز اس کی اے رازق
جواب لحن کا اس کے رباب کیا دے گا

رازق عزیز۔ بریڈفورڈ، یوکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاموشی سے امتحان کی تیاری کرنے لگی۔ امتحانوں کے بعد اس کی ایک دوست ارم نے اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا اور اسے بھی مشورہ دیا کہ گھر میں بیٹھ کر خود کو زنگ لگانے سے بہتر ہے کہ اپنی تعلیم کا استعمال کرو۔ سدرہ کو اپنی دوست کی باتیں اچھی لگیں تو اس نے بھی ایک قریبی اسکول میں ملازمت کر لی' یوں زندگی ایک لگی بندھی روٹین پر چلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ اب مما اور پاپا کو سدرہ کی فکر ستانے لگی تھی۔ پاپا کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی اور مما بھی سدرہ کے متعلق سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کیے رکھتی تھیں' ایسے میں سدرہ نے سوچا کہ ملازمت چھوڑ کر اپنے مما' پاپا پر توجہ دے اور انہیں سنبھالے۔ جب وہ اپنا استعفیٰ لے کر سر کامران کے آفس میں پہنچی تو انہوں نے وجہ پوچھی۔ سدرہ نے اپنے مما پاپا کے متعلق بتایا۔

سر کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے تو آپ فکر کیوں کرتی ہیں مس سدرہ' آپ اپنے مما پاپا کے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈ دیں' یہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور ویسے بھی سالانہ امتحان سر پر ہیں' آپ ایسے میں کیسے بچوں کو چھوڑ کر جا سکتی ہیں؟''

''سر' میں اور تو کچھ نہیں جانتی' ہاں مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میرے گھر میں میری بہت ضرورت ہے۔ آپ کو بہت سی ٹیچرز مل جائیں گی مگر مجھے میرے مما پاپا نہیں مل سکتے اس لیے سر' میں رک نہیں سکتی۔'' سر کامران' سدرہ کے جذبے سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے بے دھڑک پوچھ لیا۔

''مس سدرہ' کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' سدرہ نے حیرت سے سنجیدہ سے سر کامران کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں اور چہرے پر نرم مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی۔

''سر آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل' میں بالکل ٹھیک ہوں' چاہیں تو آپ کو میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی پیش کر سکتا ہوں۔'' سر کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن سر......!''

''دیکھیے مس سدرہ' آپ پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے اور نہ ہی میں آپ سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں واقعی سنجیدہ ہوں اور آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ تقریباً چھ ماہ سے۔''

''جی......!'' سدرہ نے حیرت سے چیخ ماری۔

''جی' جی' جی مس سدرہ' آپ کے کردار نے مجھے جیت لیا۔ یہ آپ کا کردار ہی تھا جس کی وجہ سے میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔'' سدرہ حیرت سے سر کامران کو دیکھنے لگی۔ اس کے آس پاس اس جملے کی بازگشت ہونے لگی۔

''ایسا تو خراب لڑکیاں کرتی ہیں......ایسا تو خراب لڑکیاں کرتی ہیں......''

''کہاں کھو گئیں آپ؟''

''کک......کچھ نہیں سر......!'' سدرہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے مس سدرہ' میں باتوں میں وقت برباد کرنے کا بالکل بھی قائل نہیں ہوں اس لیے سیدھی طرح سے اپنی والدہ کو آپ کے گھر بھیجنے کا خواہش مند ہوں' چاہتا تھا کہ پہلے آپ کی رضامندی حاصل کر لوں' آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ناں؟'' سر کامران اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ سدرہ عجیب سے احساس میں گھری ہوئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے؟ چنانچہ

اس نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

''سر' میری شادی کا فیصلہ مکمل طور پر میرے مما' پاپا کے اختیار میں ہے اور میں ان کی مرضی کے بغیر کسی کو کوئی رضامندی نہیں دے سکتی۔''

''مجھے آپ سے یہی امید تھی مس سدرہ......! مجھے اپنی پسند پر رشک آ رہا ہے۔'' سدرہ نے کامران کی طرف حیرت سے دیکھا۔ سر کامران نے اپنی خوشی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے سدرہ کا استعفیٰ اسی کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ''سوری مس سدرہ' مجھے خود پر پورا یقین ہے کہ آپ اس اسکول کی مالکن کے طور پر جلد ہی اسکول کا انتظام سنبھالنے واپس آئیں گی اس لیے یہ استعفیٰ اپنے پاس رکھیں۔'' سدرہ نے استعفیٰ اٹھا کر پرس میں رکھا اور بوجھل قدموں سے واپس لوٹ آئی۔ وہ سارا دن سر کامران کے متعلق ہی سوچتی رہی۔ سر کامران پورے اسکول میں سخت گیر مشہور تھے' وہ اپنے اسٹاف کی کوئی بات نہیں سنتے تھے اور ان کا یہ رویہ تو سدرہ کی سمجھ سے بالکل ہی باہر تھا۔

اگلے دن جب وہ کچن کی صفائی کر رہی تھی' تب پاپا' مما کو بتا رہے تھے۔ ''اپنی سدرہ کے اسکول کا پرنسپل اور مالک کامران ملک' سدرہ کے لیے اپنی ماں کے ساتھ آنا چاہتا ہے۔ میں نے آج شام بلوا لیا ہے۔''

مما نے تعجب سے پاپا کو دیکھا۔ ''کمال کرتے ہیں آپ بھی' اسکول کا پرنسپل؟ ضرور چالیس' پینتالیس سال ہو گی اس کی عمر؟''

''ارے' تم خود مل لینا' ویسے اسکول اس کے باپ نے کھولا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد سے وہ خود سنبھال رہا ہے۔ ماشاء اللہ سے خوب چل رہا ہے' تین کیمپس ہیں اس کے اسکول کے۔'' پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی وہ اسکول کا پرنسپل ہے' آپ کو یقیناً مغالطہ ہوا ہے' پینتیس' چالیس کا تو وہ لازمی ہوگا ہی۔''

پاپا ہنس پڑے۔ ''ارے' آپ خود ہی پینتالیس' چالیس سے پینتیس' چالیس تک آ گئی ہیں۔ شام تک انتظار کر لیں پھر پتہ چل جائے گا۔''

سدرہ کے دل سے دُعا نکلی۔ ''اے اللہ! میرے مما پاپا کو یونہی ہنستا مسکراتا رکھنا۔''

شام کو سر کامران اپنی والدہ جہاں آراء بیگم کے ساتھ موجود تھے۔ مما نے سر کامران کو دیکھتے ہی دل ہی دل میں بلائیں لے ڈالیں کیونکہ ایک تو سر کامران خاصے وجیہہ تھے' دوسرے وہ ویسے ہرگز نہیں تھے جیسے مما نے سوچا تھا۔ وہ لوگ کچھ دیر بیٹھے۔ اس دوران سدرہ اپنے کمرے میں ہی رہی۔ جہاں آراء بیگم اس کے کمرے میں آ کر اس سے ملیں اور بہت ہی پیار کیا اور اس کے نرم و نازک ہاتھ میں سونے کی ایک نفیس سی انگوٹھی بھی پہنا دی۔ اس لمحے سدرہ کو اپنے اردگرد بازگشت سی سنائی دے رہی تھی۔

''ایسا تو خراب لڑکیاں کرتی ہیں......'' اچانک ہی آواز بدلی' نئی بازگشت سنائی دی۔

''مجھے آپ کے کردار نے جیت لیا' جیت لیا' جیت لیا۔'' پہلی والی بازگشت' دوسری بازگشت میں دب گئی۔ سدرہ نے مما کو دیکھا' اُن کے چہرے پر اطمینان تھا' خوشی تھی' آسودگی تھی اور اسے اس کے علاوہ کچھ اور چاہیے بھی نہیں تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں اور سدرہ دلہن بن کر سر کامران کے آنگن کو مہکانے لگی۔

وقت سبک رفتاری سے گزرنے لگا۔ کامران نے سدرہ کو مشورہ دیا کہ وہ کم از کم ماسٹرز ضرور کر لے۔ چنانچہ سدرہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی میں اس کی دوستی اپنی ہم جماعت نورین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY THURSDAY AT 8:00PM Ik Yaad Hai

سے ہوگئی۔ نورین تمام وقت کافی سہمی سہمی رہتی تھی۔

ایک دن سدرہ نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''نوری' یہ تم اس قدر سہمی ہوئی' ڈری ڈری سی کیوں رہتی ہو؟ آخر کیا وجہ ہے؟''

''وہ..... دراصل میرے شوہر ہیں ناں' وہ مجھ پر ہر وقت کڑی نگاہ رکھے رہتے ہیں' سمجھ نہیں آتا کہ ان کی نظروں سے بچ کر کیسے نکلوں؟'' نورین نے سہمے سہمے انداز میں اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ تم پر شک کرتے ہیں؟'' سدرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یار' بہت زیادہ' جینا دوبھر کر دیا ہے اس شخص نے میرا۔ پتہ نہیں' اس کے دماغ میں کیسا فتور بھر پڑا ہے جو اسے کسی طور بھی چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتا؟'' سدرہ نے تاسف سے اس بے چاری کی طرف دیکھا۔ اسے اچانک سے اپنی زندگی پر رشک محسوس ہوا اور اس نے دل ہی دل میں شکر الحمدللہ کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

اگلے چند دن یونیورسٹی میں اسے نورین نظر نہیں آئی پھر جب نظر آئی تو سدرہ اس کی طرف لپکی مگر حیران بھی ہوئی۔

''نوری' یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم اس قدر کمزور کیوں نظر آ رہی ہو؟'' نورین اس کے گلے لگ کر رو دی۔

''مجھے میرے شوہر نے بہت مارا کیونکہ اس نے یونیورسٹی میں مجھے ایک لڑکے سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔''

''مگر جب تمہیں اپنے شوہر کی طبیعت اور مزاج کا پتہ ہے تو تم کسی لڑکے سے بات ہی کیوں کر رہی تھیں؟'' سدرہ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکا میرا کزن ہے اور مجھ سے پچھلے سمسٹر کی کتابوں کی بابت معلوم کر رہا تھا مگر میرا شکی مزاج شوہر..... اب اسے کوئی کیسے سمجھائے؟''

''میں سمجھاؤں گی تمہارے شوہر کو۔'' نورین نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا تو سدرہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ڈرو نہیں' کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

یونیورسٹی سے واپس گھر کی طرف جاتے ہوئے نورین نے ایک گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''وہ میرے شوہر کی گاڑی ہے۔'' گاڑی سے نکلتے عماد کو دیکھ کر سدرہ کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

''کیا ہوا؟ آؤ ناں.....'' نورین نے حیرت سے کہا۔

''نہیں' تم جاؤ' تم ٹھیک کہتی ہو کہ تمہارا شوہر خردماغ ہے' اسے سمجھانا بہت مشکل ہے' پر تم فکر مت کرو' میں اپنے شوہر سے بات کروں گی کہ وہ تمہارا مسئلہ حل کر دیں۔'' نورین اسے تشکر اور الجھن آمیز نظروں سے دیکھتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

عماد اسے ڈانٹ رہا تھا۔ سدرہ کے اردگرد بازگشت گونج رہی تھی۔

''ایسا تو خراب لڑکیاں کرتی ہیں.....'' پھر دوسری بازگشت' پہلی بازگشت پر حاوی ہوئی۔

''مجھے آپ کے کردار نے جیت لیا..... جیت لیا..... جیت لیا۔'' اس کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے قدم گھر کی طرف بڑھنے لگے کیونکہ اسے نورین کی زندگی سنوارنے کے لیے کامران کی ضرورت تھی۔

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM جی سہیلی

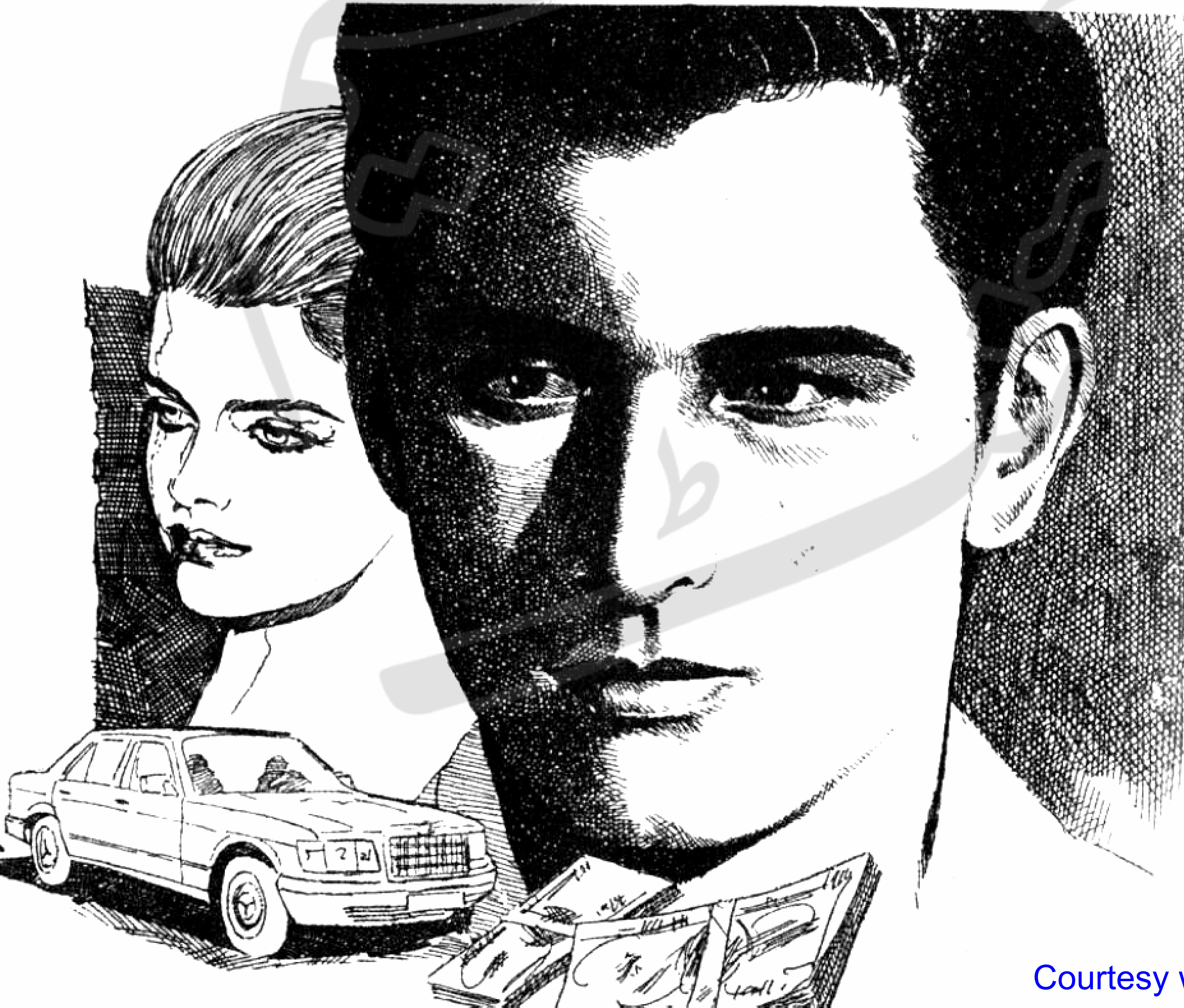
عمران مظہر

ایسا بھی ہوتا ہے

حمایت علی شاعر کا خیال

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے، کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

رشتوں کے نام پر دھوکہ دینے اور دھوکہ کھانے والوں کا قصہ عبرت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حالات کبھی کبھی عورت کو اس قدر مجبور کر دیتے ہیں کہ اُس کی ممتا والے جذبات بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، شاید اسی لیے برسوں بعد اپنے لختِ جگر احسن کو اُس تقریب میں دیکھ کر عائشہ کی ممتا نے کوئی جوش نہیں مارا تھا اور نہ ہی اُس نے اپنے کسی رویے سے کسی بھی قسم کی تڑپ یا محبت کا احساس ظاہر ہونے دیا تھا اور جب عائشہ کے شوہر علی نے اُس سے پوچھا تھا۔ آیا وہ احسن سے ملنا چاہتی ہے؟ تو اُس نے دل پر پتھر رکھ کر احسن سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

اُس شام اپنے بیڈ روم میں بیٹھی عائشہ اپنے بیٹے احسن کے حوالے سے کیے اپنے فیصلے پر سوچتے سوچتے اپنے ماضی میں کھو گئی تھی۔

•......•......•......•

''عائشہ میری جان! آج میں ''روز میرج بیورو'' گئی تھی اور مسز صدیقی کو تمہاری تصویر اور تمہارے کوائف، دونوں چیزیں دے کے آئی ہوں۔ مسز صدیقی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بہت جلد ہمیں خوشخبری سنائیں گی۔''...... فاطمہ نے اپنی سہیلی عائشہ کو گلے لگاتے ہوئے خوشی سے چہک کر بتایا تھا۔

''کیا......؟'' عائشہ اپنی سہیلی کے اس انکشاف پر حیران ہوگئی تھی۔ ''یار، کیا ضرورت تھی یہ چکر چلانے کی؟''

''بھئی، ضرورت کیوں نہیں تھی؟ اور پھر میں نے باقاعدہ تمہاری امی اور بھائیوں سے مشورہ اور اجازت لے کر بقول تمہارے، یہ چکر چلایا ہے، ویسے بھی آخر اس میں برائی کیا ہے؟'' فاطمہ اپنے کاندھے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے بولی تھی۔

''تم سمجھ کیوں نہیں رہیں فاطمہ؟ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی اور پھر یہ میرج بیورو؟ میری شادی کے لیے کیا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے؟'' عائشہ کرب سے بولی تھی۔

''کچھ فرق نہیں پڑتا، یہ ماڈرن زمانہ ہے، آج کل یہی سب چل رہا ہے، اس میں بھلا برائی ہی کیا ہے؟ اور پھر تمہارے گھر والے بھی تو اس بات سے خوش ہیں۔'' فاطمہ نے عائشہ کو اپنے تئیں سمجھایا تو وہ چپ ہو کر رہ گئی تھی۔

•......•......•......•

''فوزی ڈیئر، ذرا یہ تصویر تو دیکھنا، شکل و صورت سے اچھی لگ رہی ہے اور کافی مالدار پارٹی بھی ہے، کیسی رہے گی اپنے کامی کے لیے؟'' مسز صدیقی نے عائشہ کی تصویر اپنی سب سے چھوٹی بیٹی فوزیہ کو دکھائی۔

فوزیہ نے ایک نظر تصویر کو دیکھا پھر وہ تصویر پھینک کر لاپرواہی سے بولی۔

''ٹھیک ہی ہے...... اور آپ کہہ رہی ہیں کہ مالدار بھی ہے لیکن اگر یہ اتنی پرفیکٹ ہے تو اس کے گھر والے اس کی شادی کے لیے میرج بیورو کا سہارا کیوں لے رہے ہیں؟''

''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے ڈیئر، پر ہمیں کیا، پارٹی میں دم ہے، ویسے بھی یہ کسی رشتے کے لیے آئے تھے تو بجائے کسی اور کے، اپنے کامی سے ہی اسے باندھ دیتے ہیں۔'' مسز صدیقی اپنی لپ اسٹک درست کرتے ہوئے بولیں۔

''ایک بار کامی بھائی سے پوچھ لیں مما، بلکہ ردا، سعدیہ آپی، سب کی رائے لے لیں۔'' فوزیہ نے مشورہ دیا۔

''چھوڑو کامی کو، اسے کسی چیز کی سمجھ نہیں اور مجھے کسی کی رائے کی ضرورت نہیں، مجھے تو پارٹی کے دم دار ہونے سے مطلب ہے لڑکی......!'' مسز صدیقی چڑ کر بولیں اور فوزیہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

•......•......•......•

''دیکھیے مسز ملک، مجھے عائشہ بہت پیاری بچی لگی ہے اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ

عائشہ کو اپنے اکلوتے بیٹے کامران کے لیے آپ سے مانگ لوں۔'' مسز صدیقی، عائشہ کے گھر رشتہ مانگنے آئی تھیں اور عائشہ کی والدہ مسز ملک سے مخاطب تھی۔ عائشہ کے بھائی جواد اور فواد بھی وہاں موجود تھے۔

''جی، وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ جانتی ہیں کہ عائشہ کے والد حیات نہیں تو عائشہ کے یہ دونوں بھائی ہی اس کے لیے فیصلہ کریں گے۔'' مسز ملک نے مسز صدیقی سے بات کرتے ہوئے اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا۔

''مسز صدیقی، آپ عائشہ کا ہاتھ اپنے ہی بیٹے کے لیے مانگنے آئی ہیں، یہ ایک مثبت بات ہے پھر بھی لڑکی دیتے وقت خاندان دیکھا جاتا ہے لیکن آپ کے نام سے بھلا شہر میں کون واقف نہیں، ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' جواد نے مثبت بات کی تھی تو فواد نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا اور پھر دونوں طرف سے مبارک باد شروع ہوگئی تھی۔

•......•......•......•

''امی......! مجھے بہت ڈراؤنا خواب آیا ہے، پتہ نہیں کیوں بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے، بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' عائشہ جو اپنی والدہ کے ساتھ ہی سوتی تھی، اُسی رات چیخ مار کر نیند سے جاگ اٹھی تھی اور مسز ملک پریشانی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''امی! کہیں کچھ ہو نہ جائے، پتہ نہیں کیوں بہت بے چینی ہو رہی ہے۔'' عائشہ بدستور ڈری ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا میری بچی، تمہارا وہم ہے۔ برا خواب دیکھا ہے ناں، اسی لیے، چلو سو جاؤ شاباش۔'' مسز ملک نے تسلیاں دیتے ہوئے عائشہ کو سلانے کی کوشش کی تھی۔

•......•......•......•

''فاطمہ، جب سے یہ رشتہ طے ہوا ہے، میرا جی بہت گھبرا رہا ہے، عجیب سا احساس ہوتا ہے، برے برے خیالات آتے ہیں، وسوسے اور وہم ہونے لگتے ہیں، کہیں کچھ ہو نہ جائے، رات بھی میں نے بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔'' اگلی صبح عائشہ اپنی دوست فاطمہ کو اپنی کیفیت سے آگاہ کر رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا میری جان، ایسا ہوتا ہے، ہر لڑکی کو اس مرحلے پر گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تمہارے کیس میں بس یہ سب تھوڑا زیادہ ہو رہا ہے۔'' فاطمہ نے اسے پیار سے سمجھایا تھا، تبھی وہاں مسز ملک آئی تھیں اور ان کی باتیں سن کر عائشہ کو پیار سے چمکارتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

''میری بچی، ایسا ہوتا ہے، اگر پھر بھی تمہارا دل نہیں مانتا تو میں تمہیں کسی اچھے عالم کے پاس لے جاؤں گی، لگتا ہے، کسی کی بری نظر لگ گئی ہے۔''

''نہیں امی! رہنے دیں۔ اللہ پاک بہتر کرے گا۔'' عائشہ نے فوراً ہی بات ختم کی تھی...... اور پھر کچھ عرصے بعد بڑی دھوم دھام سے اُس کی شادی کامران کے ساتھ کر دی گئی اور یوں عائشہ ملک ہاؤس سے صدیقی ولا میں آ گئی جہاں اس کا استقبال چھ نندوں نے کیا جن میں سے چار بیاہی ہوئی تھیں جبکہ دو فوزیہ اور ندا کنواری تھیں۔ ردا ایک اسکول میں جاب کرتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دو ماہ زبردست طریقے سے گزرے تھے۔ کامران بھی عائشہ کا خیال رکھتا تھا۔ عائشہ اب پرانے وسوسے بالکل بھول چکی تھی اور خوش تھی۔

•......•......•......•

ایک دن عائشہ گھر کی صفائی کر رہی تھی کہ اسے کامران کی ذاتی الماری سے کچھ کاغذات ملے۔ اُس روز کامران دفتر جاتے وقت الماری بند کرنا بھول گیا تھا۔ اُن کاغذات کو دیکھ کر عائشہ کے تو ہوش اڑ گئے جن سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو رہی تھی کہ کامران کی پہلے بھی شادی ہو چکی تھی لیکن کامران

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور اس بیوی سے اس کا ایک بچہ بھی تھا۔

عائشہ کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے' وہ شدید غم اور غصے کے عالم میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی اور کافی دیر روتی رہی تھی...... اور پھر جب کامران گھر آیا تھا تو عائشہ نے بہت دھیمے لہجے میں کامران سے اُن کاغذات کے متعلق پوچھا تھا۔ کامران' بیوی کے اِس سوال پر پہلے تو سٹپٹایا تھا پھر خاصے نرم لہجے میں عائشہ کو قائل کرنے لگا تھا۔

''ہاں جان' یہ بات سچ ہے لیکن یہ اتنا بڑا ایشو نہیں ہے اور تم لوگوں سے یہ بات اس لیے چھپائی گئی کہ بات بہت شرمندگی والی تھی' بات دراصل یہ ہے کہ میری پہلی بیوی کا کردار اچھا نہیں تھا' اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ بچہ بھی معلوم نہیں کس کا تھا؟ اس بات سے ہٹ کر سچ بتاؤ' آج تک میں نے تم سے کوئی جھوٹ بولا؟ یا میرے رویئے میں کبھی کوئی کھوٹ نظر آیا؟ نہیں ناں' کیونکہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں' بہت پیار کرتا ہوں اور ہاں پلیز' تم یہ بات اپنے تک ہی رکھنا' اپنے گھر والوں کو مت بتانا کیونکہ اب اسے اچھالنے سے ہم دونوں کو کچھ نہیں ملے گا۔'' کامران نے عائشہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا...... عائشہ نے ان پیار بھری باتوں پر اعتبار کرتے ہوئے کامران سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس بارے میں اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں بتائے گی۔

•......•......•......•

''جان...... میں بہت پریشان ہوں اور تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔'' اُس روز کامران بہت بوکھلایا ہوا عائشہ کے پاس آیا تھا۔

''بات کیا ہے؟ اور آپ کو میری کسی مدد کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟'' عائشہ بھی گھبرا گئی تھی۔

''جان' مجھے بزنس میں بہت نقصان ہو گیا ہے' اگر کہیں سے فوراً دو لاکھ کا بندوبست نہیں ہوا تو کچھ نہیں بچے گا۔ اب تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔'' کامران نے بیوی کو التجائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں آپ کی مدد کیسے' کس طرح کر سکتی ہوں؟ اور پھر آج تک تو آپ نے مجھے یہ تک نہیں بتایا کہ آپ کا بزنس کیا ہے؟''

''بس یار' میرا ایک بہت بڑا بزنس ہے' یوں سمجھو' ایکسپورٹ کا ہے لیکن اگر تم نے مدد نہ کی تو سب کچھ ختم ہو جائے گا......'' کامران نے بیوی کے ساتھ تھام کر کہا تھا۔

''ہاں' بتایئے' میں کیسے آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟'' عائشہ جیسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''یار' اگر تم اپنے بھائیوں سے میرے لیے پیسے مانگ لو تو؟'' کامران اب مطلب کی بات پر آیا تھا...... اس کی بات سن کر عائشہ چونکی تھی۔ اسے یہ بات بہت ناگوار گزری تھی لیکن پھر وہ خود پر قابو پاتے ہوئے شوہر سے بولی تھی۔

''میں اپنے بھائیوں سے تو نہیں کہہ سکتی' ہاں ایک طریقے سے آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔'' یہ کہہ کر عائشہ الماری کی طرف مڑی تھی اور اپنا سارا زیور نکال کر میاں کے سامنے رکھتے ہوئے بولی تھی۔ ''یہ لیں' ان سے آپ کا کام چل جائے گا۔''

''شکریہ جان۔'' کامران نے یہ کہہ کر زیور اٹھایا تھا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ عائشہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی اور سوچتی رہ گئی تھی۔

•......•......•......•

''بیٹی' دو ہفتوں بعد سٹی پارک میں کراچی festival ہو رہا ہے اور میں چاہ رہی تھی کہ میں بھی کوئی چھوٹا موٹا اسٹال لگا لیتی' اگر کہیں سے پیسوں کا بندوبست ہو جاتا۔ تم اپنی امی سے کیوں نہیں کہتیں' وہ ضرور ہماری مدد کریں گی۔'' اُس شام مسز صدیقی' عائشہ کے پاس آئی تھیں اور اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ عائشہ اُن کی بات سن کر حیران رہ گئی تھی لیکن وہ اُن کے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی' سو چاروناچار اُس نے اپنی امی سے اس معاملے پہ بات کی تھی اور پھر مسز ملک نے جواد اور فواد سے کہا تھا...... یوں انہوں نے مسز صدیقی کی ڈیمانڈ کے مطابق تیس ہزار روپے عائشہ کو دے دیئے تھے اور جب یہ رقم مسز صدیقی کو ملی تھی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی تھیں' انہوں نے بے ساختہ عائشہ کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹی......! میں کبھی تمہارے آگے ہاتھ نہ پھیلاتی لیکن مجبوری تھی' تمہارا بہت بہت شکریہ......''

جواب میں عائشہ نے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ سجائی تھی...... اور یہ سوچا تھا کہ جان چھٹی...... لیکن اُس دن کے بعد مسز صدیقی اور کامران کے تقاضے بڑھتے ہی گئے تھے' کتنی ہی دفعہ عائشہ نے ناچاہتے ہوئے بھی اپنی امی سے پیسے مانگے تھے اور اَب تو جواد اور فواد بھی اس بات کی مخالفت کرنے لگے تھے مگر مسز ملک انہیں سمجھا دیتی تھیں کہ کسی طرح بیٹی کا گھر بسا رہے...... لیکن آخر کب تک؟ اب عائشہ نے میاں اور ساس کو ان کی ڈیمانڈ پر خود انکار کرنا شروع کر دیا تھا...... ویسے بھی اب تک وہ ماں بیٹا مختلف بہانوں سے کافی رقم بٹور چکے تھے' سو وہ دونوں بھی ذرا ڈھیلے تو پڑ گئے تھے لیکن مسز صدیقی کے دل میں عائشہ کے انکار والی بات پھانس کی طرح اٹک گئی تھی جس کا اظہار اب انہوں نے عائشہ کو بات بے بات ٹوک کر' جھڑک کر کرنا شروع کر دیا تھا...... ایسے ہی ایک دن جب وہ سب اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے تو مسز صدیقی نے شاطرانہ انداز میں عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''بیٹی......! اولاد والی خوشخبری کب سنا رہی ہو؟

اے خدا! معاف کر دے

☆☆

اے خدا! تو کیوں ہم سے ناراض ہوا ہے
پہلے زلزلہ پھر طوفانِ سونامی
اور اب یہ برسات وسیلاب کی قیامت
اے خدا! معاف کر دے
کرب وبلا یہ کراچی میں مچا دیا کس نے
جو قاتل ہیں، لٹیرے ہیں، وہ بے لگام پھرتے ہیں
پردیسیوں، محنت کشوں کو مارا کس نے
اے خدا! معاف کر دے
ہم تجھے بھول گئے ہیں افسوس!
مسلماں ہو کر بھی مسلماں نہیں ہیں
بھائی بن کر بھائی کا گلا کاٹ رہے ہیں
نفرتیں ہی نفرتیں بانٹ رہے ہیں
اے خدا! معاف کر دے
کہیں گولیاں چلا رہے ہیں اپنے ہی ہم وطنوں پر
تو کہیں بم برسا رہے ہیں اپنے ہی بھائیوں پر
خود بھی مر رہے ہیں اوروں کو بھی مار رہے ہیں
ہر طرف موت بن کر ناچ رہے ہیں ہم
اے خدا! معاف کر دے

☆☆

جیجل میتلو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی عرصہ ہوگیا ہے۔ مجھے تو کوئی امید بھی نظر نہیں آ رہی۔" ساس کی یہ بات سن کر عائشہ بوکھلا گئی پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگی۔

"امی......!ابھی تو شادی کو صرف چھ سات ماہ ہی ہوئے ہیں۔اللہ پاک خیر کرے گا۔"

"بے شک' وہ تو ٹھیک ہے لیکن......"اس سے پہلے کہ مسز صدیقی اور کچھ کہتیں' کامران نے انہیں ٹوکا۔

"بس کریں امی! آپ بھی کیا بات لے کر بیٹھ گئیں۔" بیٹے کی یہ بات سن کر تو مسز صدیقی جل بھن کر رہ گئی تھیں۔

.......•.......•.......•

"فوزی' تمہارا کوئی دوست تم سے ملنے آیا ہے' میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔خالد نام بتایا ہے اس نے۔" عائشہ نے اپنی نند فوزیہ کو اس کے دوست کی آمد کا بتایا تھا۔

فوزیہ اپنی بھابی کی زبانی یہ بات سن کر گویا خوشی سے جھوم کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی تو عائشہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔

فوزیہ جاتے ہی اس نوجوان سے بے ساختہ لپٹ کر دلبرانہ انداز میں گلے شکوے کرنے لگی تھی۔عائشہ کو یہ سب ناگوار گزر رہا تھا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی تھی۔

فوزیہ اور خالد کی اس ملاقات کو ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ......پھر اس کی آمد ہوئی تھی اور اس کے بعد تو ہر دوسرے' تیسرے دن خالد آجاتا اور وہ دونوں دیر تک اپنے آپ میں مگن رہتے......کامران اور مسز صدیقی سارا دن باہر ہوتے اور رات گئے آتے تھے جبکہ ردا اسکول سے شام کو لیٹ آتی تھی' یوں گھر میں عائشہ کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا تھا' سو فوزیہ ان مواقعوں سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی لیکن اب عائشہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا' سو اُس نے ایک دو بار فوزیہ کو سمجھایا بھی لیکن فوزیہ نے الٹا اسے جھڑک دیا۔آخر کار عائشہ نے کامران سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اُس رات کامران گھر آیا تو عائشہ نے یہ ساری بات کامران کے آگے رکھ دی۔تمام قصہ سن کر تو کامران کا پارہ چڑھ گیا' وہ شدید غصے کے عالم میں فوزیہ کے کمرے کی طرف گیا اور اسے دھنک کر رکھ دیا جو کہ عائشہ نہیں چاہتی تھی لیکن اس سب کا بھی الٹا ہی اثر ہوا۔فوزیہ روتی پیٹتی' چیختی چلاتی' ماں کے پاس گئی اور انہیں مرچ مصالحہ لگا کر نہ جانے ایسا کون سا جھوٹ گھڑ دیا کہ مسز صدیقی اپنی بیٹی کی بجائے عائشہ کو قصوروار سمجھنے لگیں اور دل میں انہوں نے عائشہ کے لیے بیر پال لیا۔

.......•.......•.......•

"بیٹا......!اب بات برداشت سے باہر ہے۔عائشہ کی گود اب تک خالی ہے۔" ایک رات جب سب کھانے پر موجود تھے' مسز صدیقی نے یہ بات چھیڑ دی تھی۔

"امی......!آپ پھر وہی بات لے کر بیٹھ گئیں؟ پلیز' ایسی بات نہ کیا کریں۔" کامران چڑ گیا تھا جبکہ عائشہ کی حالت دیکھنے لائق تھی' وہ گھبرا گئی تھی اور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مسز صدیقی کو بار بار یہ بات کیوں یاد آتی ہے۔

"امی......!ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے؟" عائشہ بمشکل اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

"ایسا تم سمجھتی ہو اور تمہارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے' مجھے اس گھر میں جلد از جلد بچہ دیکھنا ہے۔" مسز صدیقی غصے سے کہتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔

"ممی از رائٹ۔" فوزیہ اور ردا نے بھی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور اُس دن کے بعد ہر روز عائشہ سے اسی معاملے پر بات کی جاتی' دوسرے لفظوں میں بچے والے مسئلے پر مسز صدیقی اور فوزیہ

نے عائشہ کا جینا حرام کر دیا تھا' بات بے بات طعنے دیتیں اور ہر روز کامران کے کان بھرتیں......آخر کار ایک روز کامران' عائشہ سے مخاطب ہوا تھا۔

"عائشہ......!امی ٹھیک ہی سوچتی ہیں' اب تک ہمارا بچہ ہونا چاہیے تھا۔تم ایک بار ڈاکٹر سے ٹیسٹ کروالو تو کیا حرج ہے؟"

عائشہ' شوہر کی یہ بات سن کر چپ رہی تھی' اُس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا' سو اولاد نہ ہونے کے حوالے سے اُس کے کئی طرح کے ٹیسٹ کروائے گئے اور بالآخر ڈاکٹرز نے عائشہ کے حق میں فیصلہ دیا کہ عائشہ بالکل نارمل ہے۔جب وقت آئے گا' بچہ بھی ہو جائے گا لیکن الٹراساؤنڈ سے ایک بات سامنے آئی تھی کہ عائشہ کا ایک گردہ پیدائشی طور پر چھوٹا ہے' یہ بظاہر کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی لیکن مسز صدیقی اور فوزیہ نے اس بات کو پکڑ لیا اور ہر روز موقع' بے موقع عائشہ کو طعنے دینے لگیں۔

"ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے۔تمہیں ہم کبھی معاف نہیں کریں گے۔تم میڈیکلی طور پر فٹ نہیں ہو' اسی لیے تو بچہ نہیں ہو رہا۔"

ایسی جاہلانہ باتیں کر کے وہ ماں بیٹی روز عائشہ کو تنگ کرتیں اور اب مسز صدیقی' کامران سے دوسری شادی کے لیے بھی کہنے لگی تھیں حالانکہ ابھی شادی کو بمشکل ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا۔عائشہ کو اس حال اور ماحول میں جینا حرام ہوگیا تھا۔وہ بوکھلائی بوکھلائی رہنے لگی۔اُس کے گھر والوں تک بھی یہ سب معاملات پہنچ گئے تھے' اُس کی والدہ مسز ملک اور خود عائشہ اب ہر پل اولاد ہونے کی دُعائیں مانگنے لگی تھیں اور پھر خدا نے اُن کی دُعا سن لی تھی۔

عائشہ نے جب یہ خوش خبری سنائی تھی تو کامران کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا مگر......مسز صدیقی اور فوزیہ تو یہ خبر سن کر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھیں کہ ان کے ہاتھ سے عائشہ کو پریشان کرنے کا موقع نکل گیا تھا لیکن اَب عائشہ کے لیے زندگی کو اور تنگ کر دیا گیا' مسز صدیقی اور فوزیہ' عائشہ کو بات بے بات ٹوکتے' جھڑکتے اور سب سے بڑھ کر' گھر کے اب سارے چھوٹے بڑے کام عائشہ کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔مختصراً یہ کہ عائشہ کا حال پاگلوں کی طرح ہوگیا تھا۔

آخر ایک دن عائشہ سے رہا نہ گیا تھا' اُس نے بہت نحیف سی آواز میں مسز صدیقی سے ان کے اس برتاؤ کی وجہ پوچھی تھی' تب مسز صدیقی نے بہت غصے اور نفرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"لڑکی......!تو جو بھی کر لے' جتنے بچے پیدا کر لے' میں نے قسم کھائی ہے' تیرا گھر بسنے نہیں دوں گی کیونکہ تو نے میری بیٹی کی بے عزتی کی ہے۔"

عائشہ یہ بات سن کر تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

اُسی رات جب کامران گھر آیا تو مسز صدیقی اور فوزیہ' ان ماں بیٹی نے کامران کے کان کچھ اس طرح بھرے اور نجانے ایسا کیا کچھ کہا کہ......وہ غصے سے بپھر گیا اور عائشہ کو خوب سنائیں' بس اس دن کے بعد سے عائشہ کے لیے اس گھر کا ہر فرد ظالم بن گیا تھا۔

عائشہ بے چاری ان کا ہر ظلم برداشت کرتی رہی لیکن ان سب سے عائشہ کی یہ برداشت بھی برداشت نہ ہوئی اور ساتویں مہینے میں ساس مسز صدیقی نے اُسے اس الزام کے ساتھ گھر سے نکال دیا گیا کہ عائشہ کے بطن میں کسی اور کا گناہ پل رہا ہے۔

عائشہ کے لیے یہ الزام کسی قیامت سے کم نہیں تھا' لیکن اُس وقت وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی' سو چار و ناچار میکے کی دہلیز پر آ گئی۔اُس کے گھر والوں اور فاطمہ نے جب عائشہ کی حالت دیکھی اور اس سے سب کچھ سنا تو دہل کر رہ گئے اور یہ سن کر کہ مسز صدیقی نے ان سے بہت کچھ چھپایا تھا جیسے کہ کامران طلاق یافتہ تھا' وہ سب غصے میں کھول کر رہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے اور جب عائشہ نے انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ اپنا سارا زیور بھی کامران کو دے چکی ہے تو اس کے گھر والے سر پکڑ کر رہ گئے۔

یہ تمام حالات جان کر جواد اور فواد جوش میں آ گئے تھے اور وہ کامران کا برا حشر کرنا چاہ رہے تھے لیکن عائشہ نے انہیں روک دیا تھا کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

عائشہ اب اپنے میکے میں ہی رہنے لگی تھی اور کچھ عرصے بعد اُس نے بہت پیارے بچے کو جنم دیا تھا جس کا نام احسن رکھا گیا تھا۔ عائشہ کی والدہ اب اُس کے لیے بہت فکرمند تھیں۔ اس کے بھائی بھی اُس کی خوشیوں کے لیے سوچنے لگے تھے پھر بھائیوں نے ماں کی رضا سے عائشہ کو حج کرا دیا تھا۔ اِس سعادت نے عائشہ کو بہت سکون بخشا تھا۔ اِس کے فوراً بعد جواد نے ایک بڑی رہائشی اسکیم میں بنگلہ خرید کے عائشہ کے نام لکھ دیا تھا۔

عائشہ اب کچھ کچھ سنبھل رہی تھی اور پھر عائشہ کی مرضی سے ہی جواد نے کامران کے خلاف خلع کا کیس دائر کر دیا تھا...... لیکن کامران کسی صورت بھی عائشہ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر کار مسز ملک اور جواد، مسز صدیقی کے پاس گئے اور بہت منتوں سے مسز صدیقی اس بات پر راضی ہوئیں کہ اگر کامران کو اس کا بچہ دے دیا جائے، تبھی وہ عائشہ کو طلاق دے گا۔

مسز ملک، جواد اور فواد نے بہت سوچا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ عائشہ کی بھلائی کے لیے مسز صدیقی کی یہ شرط مان لی جائے...... عائشہ یہ سب سن کر بہت روئی، چیخی تھی لیکن مسز ملک نے بہت مجبور ہو کر عائشہ کا بچہ اس سے چھین کر مسز صدیقی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد کامران نے عائشہ کو طلاق دے دی تھی۔

......•......•......•

عائشہ اپنے بچے کی جدائی میں گھل رہی تھی لیکن پھر خدا نے بہت جلد اس کے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ علی، عائشہ کا کالج کے زمانے کا فرینڈ تھا، وہ اُسے چاہتا بھی تھا لیکن کبھی اُسے بتانے کی ہمت نہ کر سکا...... اب وہ آگے بڑھا تھا اور عائشہ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اُس نے عائشہ کا ہاتھ مانگا تھا...... اور پھر عائشہ نے ایک بار پھر ماں کے حکم کے آگے سر خم کرتے ہوئے علی کا ساتھ قبول کر لیا تھا۔

یہ ماں کی دُعا کے ساتھ، اللہ کا کرم ہی تھا کہ عائشہ کو علی کا ساتھ ایسا ملا کہ وہ اپنے پچھلے سارے غم بھول گئی تھی حتیٰ کہ احسن بھی کہیں ماضی میں کھو گیا تھا اور آج اُس نے جب احسن کو ایک تقریب میں دور سے دیکھا تو ماضی یکدم سامنے آ گیا۔

......•......•......•

"کہاں کھو گئی ہو یار؟" علی نے عائشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا تھا اور وہ حال میں لوٹ آئی تھی۔

"کہیں نہیں، بس آپ کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔" عائشہ نے مسکرا کر کہا تھا اور علی نے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے عائشہ کا کاندھا تھپتھپایا تھا۔

......•......•......•

مسز صدیقی آج بھی ایک معزز اور معتبر شخصیت کے روپ میں رشتہ کرانے والا دفتر چلا رہی ہیں۔ کامران چوتھی شادی کے بعد بیوی کے مال پر مزے کر رہا ہے۔ فوزیہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے جبکہ ردا نے اپنی پسند سے شادی کر کے گھر بسا لیا ہے اور احسن بنا ماں باپ کے پیار، تحفظ کے ایک آیا کے ہاتھوں میں پرورش پا رہا ہے۔

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM
جی سہیلی
PRESENTS

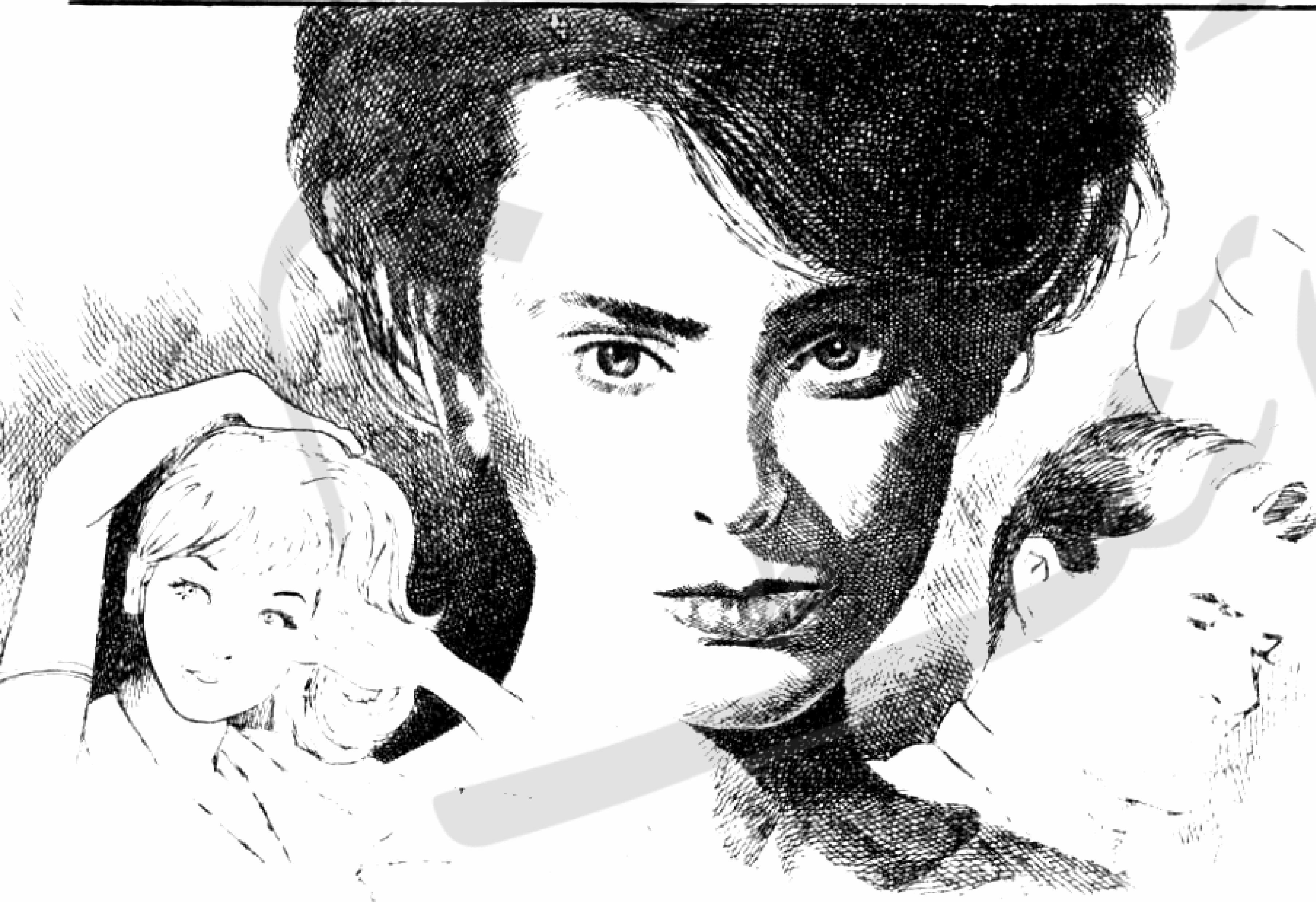
کرن محمد فاروق

ایک زندگی تین رُخ

سعدیہ حریم کا خیال

کس قدر مجبور ہے تقدیر سے انساں حریم
اور یہی بے چارگی بے چین کرتی ہے

تین سہیلیوں کی کہانی، جن کی زندگی ایک منزل جدا جدا تھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسان جب اس جہاں میں آتا ہے تو اس کی زندگی کورے کاغذ کی طرح ہوتی ہے پھر جوں جوں اس کا سفر آگے بڑھتا ہے' اس کورے کاغذ پر ایک خاص تحریر خود بخود نقش ہوتی جاتی ہے اور پھر یہی تحریر اس کا کل اثاثہ ہوتی ہے۔ یہ کہانی ہے تین ایسی سہیلیوں کی جن کی قرطاسِ زندگی پر نقش ہونے والی تحریریں عجیب تھیں۔

انگبین' اسفارہ اور رومائیلا تینوں کی دوستی انوکھی تھی نہ تو وہ ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتی تھیں نہ ہی رشتے دار تھیں اور نہ ہی اسکول کے زمانے سے ایک ساتھ پڑھتی آئی تھیں۔ تینوں کا تعلق مختلف طبقات سے تھا۔ ان کی دوستی چند سالوں پر محیط تھی لیکن یہ چند سال تینوں کی زندگیوں کے خوشگوار ترین لمحات میں سے تھے جو ان کی زندگی میں بہار کی طرح آئے اور ہوا کے جھونکے کی طرح چلے گئے۔

انگبین آج کئی برس بعد رومائیلا کے بلانے پر اس سے ملنے ہسپتال آئی تھی۔ رومائیلا ان دنوں اپنے ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر کی تیاری میں مصروف تھی۔ دونوں دوستیں کئی سالوں بعد مل رہی تھیں اس لیے خوش بھی تھیں اور غمگین بھی۔ ان کی تیسری دوست اسفارہ کچھ سال پہلے اچانک غائب ہوگئی تھی۔ اپنی عزیز از جان دوست کے اس طرح غائب ہوجانے پر دونوں کی رائے یہی تھی کہ اسفارہ کسی سے شادی کر کے باہر چلی گئی ہے اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔ ان دونوں کا خیال بظاہر کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کیونکہ رومائیلا امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی جہاں کسی لڑکی کا اچانک کسی سے رشتہ جوڑ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آج رومائیلا نے انگبین کو ہسپتال صرف ملنے کے لیے نہیں بلکہ کسی سے ملوانے کے لیے بلایا تھا۔ رومائیلا کا فون آیا تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''انگبین' جلدی ہاسپٹل آؤ۔''

''کیا ہوا' خیریت تو ہے رومائیلا؟''

''نہیں' خیریت نہیں ہے' تم فوراً چلی آؤ۔''

لیاقت میڈیکل کالج' جامشورو کے physical disorder کے ڈیپارٹمنٹ کے بیڈ نمبر 9 پر لیٹی نحیف سے وجود' زرد رنگت اور بے حد ویران آنکھوں والی عورت پر اس کی نظر پڑی تو اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ عورت کوئی اور نہیں' ان کی عزیز دوست اسفارہ شہاب تھی۔ رومائیلا اس کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ انگبین نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی دوست کو اس حالت میں دیکھے گی۔ زندگی میں بعض حقیقتیں یا سچ اتنے اذیت ناک ہوتے ہیں کہ اگر انسان تاعمر ان سے لاعلم رہے تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ یہی کچھ ان دونوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ان کے ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ کاش وہ اپنی پیاری دوست کے حوالے سے اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتیں کہ وہ زندگی سے خوشیاں ہی خوشیاں کشید کر رہی ہے۔

•.......•.......•.......•

اسفارہ شہاب' رومائیلا ارسل اور انگبین وجدان کی ملاقات کالج کے پہلے دن گراؤنڈ میں ہوئی تھی اور ان کی دوستی کا آغاز ہوگیا تھا۔ تینوں فرسٹ ایئر سائنس کی اسٹوڈنٹس تھیں' تینوں کے خیالات و احساسات مختلف تھے۔ یہی نہیں بلکہ تینوں کی سماجی حیثیتوں میں بھی فرق تھا لیکن اس کے باوجود تینوں گہری دوست بن گئی تھیں البتہ بہت سی متضاد چیزوں کے علاوہ تینوں میں ایک چیز قدرے مشترک تھی کہ تینوں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹیاں تھیں۔

انگبین وجدان کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ گھر میں تین بھائیوں کے بعد آنے والی انگبین لاڈلی اور اکلوتی تھی لیکن جب بھی اسے کوئی کہتا کہ تمہارے کتنے لاڈ اٹھائے جاتے ہوں گے تو وہ صرف اتنا کہتی

کہ دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں۔

رومائیلا انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اپنے گھر میں سب سے بڑی تھی۔ اس سے چھوٹے اس کے پانچ بھائی تھے۔ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق نہیں' جنون تھا۔ وہ اپنی دونوں دوستوں سے زیادہ ذہین بھی تھی۔ جس طرح وہ کالج میں پڑھنے آئی تھی' یہ وہ ہی جانتی تھی لیکن کبھی اس نے اپنی کم مائیگی کا رونا نہیں رویا تھا۔ وہ کم گو تھی اس لیے سنانے سے زیادہ سننے کی عادت تھی۔

اس مثلث کی تیسری رکن اسفارہ تھی جو کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ اس کی شخصیت سے ہی امارت ٹپکتی تھی' کروڑ پتی ماں باپ کی اکلوتی بیٹی' تاہم ہاسٹل میں رہتی تھی۔ رومی اور انگی کی نظر میں ان دوستوں میں سب سے زیادہ پرفیکٹ زندگی اسی کی تھی لیکن اسفارہ ہمیشہ اپنی دوستی کے اس جملے پر اتنا ہنستی کہ آنکھوں کے کنارے بھیگ جاتے۔

وقت گزرتا گیا اور تینوں کی دوستی پروان چڑھنے لگی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ کالج میں ان کا گروپ three princes کے نام سے مشہور ہوگیا۔ ہر کوئی ان تینوں کی دوستی کی مثال دیتا تھا۔ انہیں تھری پرنس کا خطاب ان کی کلاس کی پروفیسر مس سائرہ نے دیا تھا' ویسے یہ خطاب ان پر خوب جچتا تھا۔ تینوں ہی شہزادیوں سے کم نہیں تھیں' حسن و دلکشی کے حوالے سے تینوں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ اکثر فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا کہ ان میں زیادہ حسین کون ہے؟

گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے چلتی رہیں اور انہیں کالج میں دو سال کا عرصہ ہوگیا۔ وہ ایک دوسرے کی گہری دوست تھیں' تاہم تینوں ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ تھا جو ابھی بھی وہ ایک دوسرے سے چھپاتی تھیں۔ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ جیسے چوری بنی ہوئی تھیں۔ ان کی دوستی کو کم و بیش دو سال ہوگئے تھے لیکن اس عرصے میں واحد ملنا ملانا ان کا کالج ہی تھا نہ کبھی اسفارہ' انگبین اور رومائیلا کے گھر گئی تھی نہ ہی ان دونوں نے کبھی اسفارہ سے ملنے ہاسٹل آنے کی کوشش کی تھی۔ تینوں کالج میں ہی سارے ارمان نکالا کرتی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' تینوں دوست ایک دوسرے کے قریب ہوتی چلی گئیں اور جو محرومیاں تینوں ایک دوسرے سے چھپاتی تھیں' وہ ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگیں پھر ایک دوسرے کو مکمل جاننے کے بعد تو یہ دوستی اور بھی مضبوط ہوتی چلی گئی۔

وقت کا پرندہ پر لگا کر اڑتا گیا' گزرتے وقت میں بہت سی تبدیلیاں آئیں' رومائیلا کے نا چاہنے کے باوجود اس کی ماں نے اپنے کسی دور کے رشتے دار کے ساتھ رومی کا نکاح کر دیا۔ رخصتی دو ماہ بعد کی رکھی گئی تھی۔ اسفارہ پیپر سے پہلے ہی اپنی ماں کے پاس انگلینڈ چلی گئی۔ انگبین کی بھی شادی ہوگئی۔ پیپر اس نے شادی کے بعد ہی دیئے' یوں اسفارہ' رومائیلا' انگبین پر مشتمل تھری پرنس کا یہ گروپ اچانک بکھر کر رہ گیا۔ انگبین اور رومائیلا آخر پیپر والے دن ملیں تو اسفا کو یاد کر کے خوب روئی تھیں۔ دونوں دوست حیران تھیں کہ ان کی تیسری ساتھی یوں انہیں بتائے بغیر اچانک انگلینڈ کیوں چلی گئی؟

وقت اپنی تیزی سے نکلتا ہی چلا گیا اور سات سال بیت گئے اور اس گزرتے وقت میں بہت کچھ بہہ گیا۔ آج جب اسفارہ ان دونوں دوستوں کو ملی تو اس حالت میں کہ وہ اپنی عزیز از جان کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

اسفارہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہوگئی تھیں۔ دونوں نے بے ہوش لیٹی اسفارہ کو تاسف سے دیکھا۔ ان کی پیاری دوست بے سدھ سی پڑی تھی پھر اگلے کئی روز تک دونوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسفارہ کا بے حد خیال رکھا' ہمہ وقت اس کی تیمارداری میں جتی رہیں' نتیجتاً اسفارہ تیزی سے صحت یاب ہونے لگی۔ اس دوران اسفارہ نے خود پر گزری بھی بتا دی' اس کی کہانی سن کر رومی اور انگا کو یقین ہوگیا تھا کہ بعض اوقات انسان کے کام نہ دولت آتی ہے نہ حسن' نہ آزادی' نہ ذہانت اور اکثر اپنے بھی......

رومائیلا ارسل جو غربت کی ماری ہوئی لڑکی تھی' باپ معمولی مزدور اور ماں گھریلو اور سادہ عورت تھی۔ بچپن سے سننے والی اس لڑکی کی ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اس کے گھر کی غربت دور ہوجائے۔ اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھا۔ اس کے ماں باپ نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا لیکن ایک وقت آیا جب مہنگائی سے ہار کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ رومی نے کالج میں داخلہ ماں کے پاس موجود واحد سونے کی بالیاں بیچ کر لیا تھا' ساتھ ہی اپنی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اس نے شام میں کسی کلینک میں نوکری بھی کرلی تھی۔ اس طرح گھر کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی حل ہوتے رہے۔ ملازمت کے دوران ہی کلینک کے ڈاکٹر مفصل نے اسے شادی کی پیشکش کی تو فرمانبردار اولاد کی طرح اس نے اپنے والدین سے بات کرنے کو کہا لیکن والدین کو رشتہ منظور نہیں تھا۔ رومی کو بھی ڈاکٹر مفصل کچھ پسند تو نہ تھے لیکن اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ اپنی منزل یعنی ڈاکٹر بننے کا مقصد باآسانی حاصل کرلے گی اور خوب پیسہ کمائے گی۔ رومی کے ماں باپ غریب سہی' پر اپنی بیٹی کے خیر خواہ تھے' وہ جانتے تھے' ایسی شادی کا کامیاب ہونا ناممکن ہوتا ہے جس میں لڑکے کے والدین کی رضامندی نہ ہو مگر رومی' ڈاکٹر مفصل سے شادی کی خواہش مند تھی اسی لیے زبردستی رومی کا نکاح کردیا گیا۔ دو ماہ بعد اس کی رخصتی تھی پر رومی نے اس سے پہلے ہی وہ قدم اٹھالیا جس کے بعد وہ کہیں کی نہ رہی۔

رومائیلا اپنے اس نکاح سے خوش نہیں تھی کیونکہ اس شادی کے بعد نہ ہی اس کی محرومی دوری ہوتی اور نہ ہی اس کے خواب پورے ہوتے کیونکہ وسیم احمد بھی ایک معمولی نوکری کرنے والا شخص ہی تھا اس لیے اپنی رخصتی سے ایک دن پہلے ہی وہ گھر چھوڑ کر ڈاکٹر مفصل کے پاس ہی چلی گئی۔ ڈاکٹر مفصل کو جب معلوم ہوا کہ رومی کا نکاح ہوچکا ہے تو انہوں نے شادی سے صاف انکار کردیا۔ اپنے یقین کی کرچیاں ہوتے دیکھ کر وہ دوبارہ گھر لوٹی تو وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس کی ماں تو اسی وقت دل کے دورے سے اپنی جان گنوا بیٹھی جب اس نے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ وسیم احمد نے بھی رومائیلا کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور اپنی بے عزتی کا بدلہ اس نے یوں لیا کہ رومائیلا کو نہ تو چھوڑا نہ ہی اپنایا اور دوسری شادی کرلی۔ اب اس کے پاس سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں بچا تھا۔ ابا جو اس سے بے حد محبت کرتے تھے' وہ بھی اس سے بالکل بے گانہ ہوگئے۔ رومی کی نظر میں اسفارہ دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تھی جسے دنیا کی ہر آسائش حاصل تھی۔ محض ماں باپ یا بہن بھائی کی محبت ہی تو نہیں تھی تو پھر کیا ہوا' سچ ہے جو چیز انسان کے پاس ہو' اس کی قدر نہیں کرتا' جو دسترس سے دور ہو' اس کی خواہش اس کے دل میں مچلتی رہتی ہے مگر آج رومی کو یقین ہوگیا تھا' دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی' دولت سے چیزیں تو خریدی جاسکتی ہیں لیکن چاہت نہیں خریدی جاسکتی۔

انگبین جو اسفارہ کی نظر میں سب سے زیادہ خوش قسمت تھی' اس کے اپنے دکھ تھے۔ انگبین گھر میں سب سے چھوٹی تھی' اس کے بابا وجدان احمد کا ہر لاڈ اٹھاتے اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھتے تھے لیکن اس کی ماما کا رویہ اس کے ساتھ بچپن سے ہی سخت تھا۔ ان کا فلسفہ تھا کہ اکلوتی بیٹی ہے' اگر سب اتنا لاڈ کریں گے تو بگڑ جائے گی۔ میں اس کی بہترین تربیت کے لیے اس طرح پیش آتی ہوں پر انگبین ہمیشہ اپنی ماما سے نالاں ہی رہتی' آہستہ آہستہ وہ ماں سے اتنی متنفر ہوگئی کہ وہ انگبین کی طرف سے بالکل ہی بے نیاز ہوگئیں۔ ان ہی دنوں جب انگبین تھرڈ ایئر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ والدین نے اس کی شادی اپنے ہی جیسے متوسط گھرانے میں کردی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس کے بابا کا انتقال ہوگیا۔ اس دن انگبین نے اپنی ماما سے بہت بدتمیزی کی تھی اور اس کی ماما اس کی تمام تر بدتمیزی اور زبان درازی برداشت نہ کرسکیں اور آخر ایک راز جو انہوں نے بہت حفاظت سے اپنے سینے میں دبا کر رکھا تھا' اسے افشا کر ہی دیا کہ انگبین کو وہ اپنی اور اپنے شوہر کی خواہش پر یتیم خانے سے لائی تھیں' اس بات کو سن کر وہ آگ بگولہ سی ہوگئی اور بجائے ان عظیم انسانوں کا شکریہ ادا کرنے کے جنہوں نے اسے اپنی شناخت دی' چاہت دی تھی' انہیں ہی برا بھلا کہنا شروع کردیا اور اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود اس نے سب کو بتا دیا کہ وہ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی ہے جسے اس کے منہ بولے ماں باپ کسی یتیم خانے سے لائے تھے۔ جب انگبین کے شوہر کو اس کی اصلیت پتا چلی تو اس نے اسے یہ کہہ کر طلاق دے دی کہ وہ کسی ایسی لڑکی کے ساتھ نہیں رہ سکتا جس کے والدین کا پتا نہ ہو۔ اس کا ایک سال کا بیٹا بھی اس سے چھین لیا گیا۔ یہ دکھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا جو اسے اپنی نادانی کی وجہ سے ملا تھا اور اب اسے اس دکھ کے سہارے اپنی زندگی کاٹنی تھی۔

اسفارہ شہاب مشہور بزنس مین کی اکلوتی بیٹی تھی' اس کے پاس نہ صرف زندگی کی تمام آسائشیں تھیں بلکہ آزادی بھی لیکن اس نے کبھی اس چیز کا غلط استعمال نہیں کیا تھا۔ اسفارہ صرف ایک برس کی ہی تھی جب اس کے مما اور ڈیڈی میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ اسفا کی مما واپس اپنے والدین کے پاس انگلینڈ چلی گئیں اور اسفا کے ڈیڈی نے دوسری شادی کرلی اور یوں اسفارہ ماں سے تو محروم ہوئی' اپنے ڈیڈی کی توجہ سے بھی محروم ہوگئی۔ اس عرصے میں اس کی مما نے بھی دوسری شادی کرلی اور دونوں اپنی اپنی دنیا میں مگن ہوگئے اور اسفارہ...... وہ تو نہ اِدھر کی تھی نہ اُدھر کی۔ ماں تو دور تھی اور مجبور بھی لیکن ڈیڈی...... وہ تو بالکل ہی اسے فراموش کیے ہوئے تھے۔ ان کی توجہ صرف اسفارہ کے لیے اتنی تھی کہ وہ ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرا دیتے تھے۔ اپنی سوتیلی مما کی بدسلوکی اور ہر وقت کی چیخ چیخ سے تنگ آکر اسفارہ نے ہاسٹل میں رہنے کو ترجیح دی جس پر اس کے ڈیڈی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اسفارہ کے نہ تو کوئی سوتیلی بہن تھی اور نہ ہی بھائی اور اپنی اصلی مما سے ملے ہوئے تو مدت بیت چکی تھی۔

وقت گزرتا گیا اور اسفارہ کے ڈیڈی اس سے بے نیاز ہوتے چلے گئے' چنانچہ ایک روز بغیر کسی کو بتائے وہ اپنی مما کے پاس انگلینڈ چلی گئی حتیٰ کہ اس نے رومائیلا اور انگبین کو بھی نہیں بتایا۔ اسفارہ انگلینڈ گئی تو پتا چلا' ڈیڈی کی جتنی بھی پراپرٹی ہے' وہ ساری اس کی ماما کی تھی۔ اس دوران اس پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ اس کے سوتیلے بھائی اور ڈیڈی نے اس کی ماما کو اذیت میں رکھا ہوا تھا جس سے اس کی مما کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اسفارہ کے سوتیلے ڈیڈی کی اس کی ماں سے دوسری شادی تھی اور اسفارہ کا سوتیلا بھائی بھی اس کے ڈیڈی کی پہلی وائف کا بیٹا تھا۔ اسفارہ کی ماما نے اسفارہ کو اتنے سالوں بعد اسے اپنی پراپرٹی دینے کے لیے بلایا تھا۔ اسفارہ کے سوتیلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیطان

اس دنیا کا پورا نظام شیطان کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اگر شیطان نہ رہے تو کوئی انسان نہ رہے۔ سب فرشتے ہو جائیں۔ ہمیں انسان رہنے کے لیے شیطان چاہیے۔ وہ نہ ہوتا تو دو مولویوں اور واعظوں کے بچے بھوکے مر جاتے کہ یہی تو ان کا ذریعہ روزگار ہے۔ شیطان نہ ہو تو وہ کس کے خلاف تقریریں کریں۔ یہ سارے حسن کے بازار، رقص وموسیقی کی محفلیں اسی کے دم قدم سے تو ہیں۔ یہی نہیں عبادت گاہیں بھی اسی سے پناہ مانگنے کے لیے ہیں۔ وہ نہ ہوتا تو کوئی سیاست داں اور شاعر نہ ہوتا۔ عورت کا تو کوئی کام ہی نہ رہ جاتا۔ شیطان سب سے اچھا فرشتہ تھا مگر برا تب بنا جب وہ بول پڑا اسی لیے پیدا ہونے والے بچے فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بولنا نہیں آتا اور جونہی وہ بولنے لگتے ہیں، ماں باپ کہتے ہیں یہ شیطان ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر یونس بٹ کے مضمون ''شیطان'' سے اقتباس

انتخاب: علی حسن، چوک اعظم

بھائی کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے اسفارہ کا پاسپورٹ، ویزہ، چیک بک سمیت تمام اہم دستاویزات چرالیں اور اسفارہ کو پولیس کے حوالے کر دیا کہ وہ دہشت گرد گروپ سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری طرف دونوں باپ بیٹا نے اسفارہ کی ماں پر دباؤ ڈالا وہ اپنی پراپرٹی اپنے سوتیلے بیٹے کے نام کر دے ورنہ ان کی بیٹی بھی پاکستان نہ جا پائے گی۔ ماں تو پہلے ہی مریضہ بن چکی تھی، چنانچہ بیٹی کی خاطر اس نے اپنی تمام جائیداد اپنے سوتیلے بیٹے کے نام کر دی اور خودکشی کر لی۔ اسفارہ کو اس کے سوتیلے بھائی اور ڈیڈ نے پاکستان واپس بھیج دیا، واپس آ کر اسے ڈیڈی کے قتل کی خبر سننے کو ملی پھر ایک دن اس نے اپنے گھر میں اپنے سوتیلے بھائی اور ڈیڈ کو دیکھا تو پتا چلا اس کی سوتیلی ماں اور باپ نے آپس میں شادی کر لی ہے اور اس کا سوتیلا بھائی ان دونوں کا بیٹا ہے۔ اسے اس بات کا بھی پتہ چلا کہ اس کی ماں اور باپ دونوں کو الگ کرنے اور قتل کرنے میں انہی کا ہاتھ تھا تا کہ وہ تمام دولت پر قبضہ کر سکیں پھر آخری کانٹا اسفارہ کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اسفارہ کا ایکسیڈنٹ کرایا گیا جس میں وہ بچ تو گئی لیکن اس کی ٹانگیں بے کار ہو گئیں۔

آج انکبین اپنی ناشکری کی سزا بھگت رہی ہے اور رومائیلا نافرمانی کی اور اسفارہ اپنی قسمت کا لکھا پا رہی ہے۔ رومائیلا آج ایک اچھی ڈاکٹر ہے، پر وہ اب اپنے والد اور بھائی سے ملنے کے لیے بے چین ہے جنہوں نے اسے اسی طرح چھوڑ دیا ہے جیسے اس نے چھوڑا تھا۔ وہ خلع حاصل کرنے کے لیے بھی کیس لڑ رہی ہے۔ انکبین نے کفرانِ نعمت کی، اس کے محسن تو اس دنیا میں نہیں رہے اور اس کے سوتیلے بھائی حقیقت جاننے کے بعد اس سے پہلی والی محبت نہیں کرتے۔ انکبین یونیورسٹی میں لیکچرار ہے اور اپنے بیٹے معیب سے ملنے کے لیے بے چین بھی اور سب سے زیادہ بے چین اسفارہ اپنے حق کے حصول اور اپنے مما ڈیڈی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے سوتیلے ماں باپ اور بھائی سے کیس لڑ رہی ہے۔

یہ کہانی تین سہیلیوں کی نہیں بلکہ تین ایسی عورتوں کی ہے، جن میں سے ایک نے اپنی نادانی کا مزہ چکھا تو دوسری نے نافرمانی کی سزا بھگتی اور تیسری نے اپنی بدنصیبی کا پھل پایا۔

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM
جی سہیلی
PRESENTS

جاوید حسین

رشتوں کا بٹوارہ

صفیہ سلطانہ مغل کا خیال

غیروں سے کیا شکوہ کیا ہم سے کنارا
اپنے بھی کڑے وقت میں ہوتے ہیں پرائے

اس جدید اور مصروف دور میں رشتوں سے محروم ایک انسان کا نوحہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ کہانی اس جدید ترقی یافتہ زمانے کی ہے جب دلوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں اور رشتے کھوکھلے، ناپائیدار ہو گئے ہیں۔

مظلومیت اور فاقہ کشی کا دور معصومیت اور بچپن کی یادیں اپنے اپنے رشتوں سے بے خبر اچھلتے کودتے، ہنستے بولتے ہم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اور پھر زمانے کی گردشوں میں کچھ اس طرح کھوئے کہ اپنے آپ کو ہی پہچاننے سے قاصر رہے کہ...... شاید یہ سب نصیب کہ کھیل تھے اور پھر رشتوں کے حوالے سے مفلسی...... ماموں ممانی کے رشتے میسر تو ہوئے لیکن ان رشتوں میں بھی وہ شفقت اور محبت نا ملی کہ احساس محرومی سے نظر نہیں چرا سکتے۔ اہلِ خانہ جب کبھی اچھے موڈ میں ایک جگہ جمع ہوئے اور بات جب خاندانی رشتوں کی نکلی تو کبھی خود پر اور کبھی حالات پر رونا آیا۔ میرے لیے رشتوں کے حوالے سے ہمیشہ مقام افسوس تو یہ رہا کہ...... خود اپنے خاندان کے علاوہ میرے اپنے سسرال کے رشتے ناطوں میں بھی دوریوں کی خلیج حائل رہی۔ اس کی ایک افسوس اور دکھ بھری مثال یہ رہی کہ...... جب میری بیگم کے سگے تایا زاد بھائی کے انتقال کی خبر مجھے کسی ذریعے سے ملی تو میں ان کے گھر کا پتہ تک نہیں جانتا تھا...... کیونکہ وہ اپنی زندگی میں مجھ سے کبھی کسی بھی قسم کے رابطے میں نہ رہے تھے لیکن اب بھلا بیوی کے تایا زاد بھائی مرحوم کا کیا رونا، یہاں تو اپنے خونی رشتے یعنی سگے بہن بھائی کبھی خیریت پوچھنا گوارہ نہیں کرتے۔

رشتوں کا یہ بٹوارہ کیونکر ہوا؟...... کس نے کیا؟...... رشتوں کی زمین میں دوری کا یہ بیج کس نے بویا؟...... یہ احساس ہمیں بہت شدت سے کیوں ہوتا ہے؟ اور اب جبکہ زندگی گزر ہی گئی تو نہ جانے کیوں یہ سوال ابھرا۔ بہر حال کسی محفل میں کہیں نہ کہیں سے یہ سوال ضرور اٹھتا ہے۔ اب کیا جواب دیں؟ کیا جھوٹ سچ بول کر اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دیں؟ چلو دے بھی لیں مگر ضمیر کو کس طرح مطمئن کریں اس معاشرے میں رہتے ہیں۔ طرح طرح کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں مگر ان کی اکثریت اپنے عزیز و اقارب کے بارے میں بہ خوبی جانتی ہے اور اسی انداز سے یا یوں کہہ لیں اسی رشتے سے ان کی عزت کرتی ہے جبکہ میرا یہ عالم ہے کہ...... میں ذاتی طور پر ایک دو جگہ رشتے داروں میں گیا بھی لیکن مایوس لوٹا۔ وہی غیروں جیسا سلوک، رسمی سی سلام و دعا اور خدا حافظ! اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا کہ ہمارے قریبی کزن قریب سے بالکل اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے دو اجنبی، میں خدا سے دعا گو ہوں کہ ''ہمیں ایسے رشتے داروں کی پرچھائیوں سے بھی دور رکھے۔'' اب تو اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ خالہ، ماموں، ممانی، چچا وغیرہ مختصر یہ کہ ایسے جتنے بھی رشتے ہیں' ان سے ملنا وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔ یہ نفسا نفسی اور خود غرضی کا ایسا دور ہے کہ بھائی بھائی کا نہیں، ہر گھر میں دو چولہے جل رہے ہیں' لوگ اپنے بیماروں کو بے یار و مددگار چھوڑ جاتے ہیں۔ تسلی کے دو بول اور پھر غائب۔ اس کی ایک بڑی وجہ ایسے لوگوں کی زندگی میں دولت کی فراوانی ہے۔

آج کے دور میں لوگ پرانے سے پرانے خونی رشتے پر پیسے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نئے رشتوں مثلاً شادی بیاہ کے سلسلے میں بھی لڑکی کو دولت کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ لڑکے کے تمام عیب دولت کے دامن میں سمٹ جاتے ہیں۔ قصہ مختصر بے جوڑ شادی...... زندگی کے ہر معاملے میں دولت ہی کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن ہم شاید یہ بھول چکے ہیں کہ...... دولت سے سکون قلب حاصل نہیں ہوتا۔ سکونِ قلب صرف اللہ کو یاد کرنے سے ملتا ہے۔ جو انسان اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اس کے حضور سرنگوں ہوتا ہے' میرا ایمان ہے اس کی زندگی میں سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو کہ دولت کی چاہ اور طلب میں گمراہ نہیں ہوتے، وہ ایماندار قناعت پسند محبت کرنے والے، دوسرے کے درد کو محسوس کرنے والے لوگ خدا ترس ہوتے ہیں۔ جن لوگوں میں ایمان کی پختگی ہوتی ہے' وہ آج اس دور میں، ان حالات میں بھی جبکہ نفسا نفسی کا دور اپنے عروج پر ہے۔ بہت سکون سے زندگی گزار رہے ہیں...... اور اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ میرا اور میری فیملی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ بہت سے مسائل اور تکلیفیں تو ہیں لیکن اس کے باوجود ہم عزت سے زندگی گزار رہے ہیں۔

میں آج بھی اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوں تو میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ حقیقی خونی رشتوں سے آنکھیں نہ چرائیں، دولت کے پیچھے نہ بھاگیں رشتوں سے دوری اور محرومی کے دورد کو محسوس وہی کر سکتا ہے جس نے چوٹ کھائی ہو، جس نے اپنوں کے دیئے ہوئے دکھ جھیلے ہوں۔ میری زندگی تو یہ درد یہ عذاب سہتے گزر ہی چکی ہے اور جو ہے وہ بھی گزر ہی جائے گی لیکن میرے بچے......؟ حقیقی رشتوں کی بے رخی بے توقیری مجھے بہت رلاتی ہے، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیا پیسہ ہی انسان کے لیے سب کچھ ہے؟ اس کے مقابل رشتے، انسانیت، محبت اور خلوص یہ سب بے معنی ہیں؟

میری زندگی کے بہت سے بڑے دکھوں میں ایک بڑا نا بھولنے والا دکھ یہ ہے کہ میری ماں کے

آدھی تصویر کا انتظار

یہ چھوٹی سی دنیا لاکھوں رنگ لیے ہوئے ہے

میری جیت سب مختلف ہے

میری مٹی نے بچپن ہی میں اڑنا سیکھ لیا تھا

میں سفر پر نکلتے ہوئے

اپنے باطن کی آنکھ کا چراغ لے کر چلتی ہوں

میری آنکھ معمول سے دور

ماوراء کی دھند میں چھپے چہرے تلاش کرتی ہے

ہے کوئی جو میرے لہو کی زبان پڑھے؟

میری شریانوں میں چھپے ہوئے خواب دیکھے

میرے ہاتھوں کی لکیروں کو اِس انداز سے پڑھے

کہ اُس پر میری اَن دیکھی منزلیں واضح ہو جائیں

مجھے ہمیشہ سے اس اجنبی کا انتظار ہے

جو میری خاموشی سے مکالمہ کرے

اور میری آنکھوں کی سرگوشیوں کا مطلب جان سکے

میں ہمیشہ سے تنہا

کسی ایسے تنہا کے انتظار میں ہوں

جس سے مل کر میری تنہائی کی تصویر مکمل ہو سکے

روشانے سبعین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرنے پر بھی بہت سے خونی رشتے نہ آ سکے۔ میرا دل خون کے آنسو روتا رہا۔ میں خود غیروں کے کاندھوں پر سر رکھ کر روتا رہا۔ اپنا کوئی کاندھا نظر نہ آیا اگر اسی کا نام زندگی ہے تو پھر شکوہ و شکایت کیا اور کس سے؟...... لیکن پھر بھی میں صاحب ایمان ہونے کے ناطے معاشرے کے تمام انسانوں سے پرخلوص پر زور التجا کروں گا کہ خدارا اپنے حقیقی رشتوں کو پہچانیں۔ ان سے آنکھیں نہ چرائیں۔ انسان کی عظمت اور رشتوں کی توقیر کو دولت کے ترازو میں نہ تولیں، خدارا! قدرت کے بنائے ہوئے رشتوں کی قدر کریں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا مذہب محبت کا درس دیتا ہے۔ میری یہ آپ بیتی شاید معاشرے میں بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے وہ آئینہ بن جائے، جس میں لوگ اپنے آپ کو پہچان سکیں اور رشتوں کے بٹوارے نہ ہوں۔

اپنی ذات سے جڑی یہ باتیں، یہ روداد تحریر کرنے کا مقصد کسی کی دل زاری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا اظہار کیا ہے۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ کیا کروں مجھے رشتوں کی اس محرومی سے ہمکنار کیا گیا ہے۔ آج میں صاحبِ اولاد ہوں، بعض اوقات میرے بچے جو کہ اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں مجھ سے سوال کرتے ہیں۔

''فلاں آپ کے کون ہیں؟ ہمارا ان سے کیا رشتہ ہے؟ وہ ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے؟ ہم ان کے ہاں کیوں نہیں جاتے؟......'' یہ وہ چبھتے ہوئے سوال ہیں جن کا جواب دینا بذات خود میرے لیے باعث شرمندگی ہے۔ میں کبھی ہنس کر اور کبھی ڈانٹ کر انہیں چپ کرانے کی کوشش کرتا ہوں مگر تنہائی میں بیٹھ کر جب میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اس میں میرے بچوں کا کیا قصور ہے۔ یہ سوال کرنا ان کا حق ہے مگر میں بھی تو مجبور ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس اینگل سے ان کو رشتوں کی شناخت کراؤں جس کی سگی بہن (British National) ہو جو کہ ماں کی خبر سن کر بھی تعزیت کے دو بول نہ بول سکے، اس سے بڑی میری بدنصیبی اور کیا ہو گی؟

میرا خدا گواہ ہے، میں نے اپنی ضرورتوں کا گلا گھونٹا۔ اپنی بے بسی و محرومیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور صرف خدا سے مدد مانگی مگر کبھی اپنے خونی رشتوں کو تکلیف نہیں دی، نہ کبھی ان کے آگے ہاتھ پھیلایا، میرے سگے ماموں ممانی...... ان کی زندگی میں تو کسی حد تک رسائی رہی مگر اب جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے، ان کی اولادیں جو کہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم سے آراستہ صاحب حیثیت ہیں ہمارے قریب سے گزر کے چلے جاتے ہیں اور حال تک نہیں پوچھتے کہ کس حال میں ہو؟

میں انسانیت کے ناطے آپ قارئین سچی کہانیاں سے سوال کرتا ہوں آپ میری کہانی پڑھ کر جواب دیں...... یہ سب کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا دنیا میں صرف پیسا ہی سب کچھ ہے؟ رشتے ناطے کوئی معنی نہیں رکھتے؟ اگر آپ کی نظر میں بھی یہ درست ہے تو میں اپنے تمام گلے شکوے ختم کر کے بس اپنے خدا سے فریاد کروں گا کہ

''اے مالکِ دو جہاں! مجھے بس اس قابل کر دے کہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت رہیں تاکہ میں اپنی کمائی رزقِ حلال سے اپنی بیٹی کو اپنی دعاؤں میں عزت کے ساتھ رخصت کروں اور وہ اپنے گھر کی ہو جائے اور مجھے ہمیشہ اپنا ہی محتاج رکھنا کسی اور کا نہیں۔''

WATCH EVERY Fri-Sun AT 9:05PM Love Life

شاہجہاں مغل

دنیا گول ہے

سید معین اختر نقوی کا خیال

مجھ کو رستوں کے حصاروں نے نکلنے نہ دیا
میں لکیروں پہ چلا حاشیہ برداروں کی

دنیا کے بازار میں بھٹکے ایک شخص کا قصہ جسے وقت نے بتایا دنیا گول ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''دیکھ عظمیٰ! میں ہمیشہ کی طرح تجھے آج بھی سمجھا رہی ہوں کہ اپنے شوہر پر نظر رکھا کر۔'' آنٹی بختے نے عظمیٰ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اور دیکھ' شوہر پر اتنا اعتماد بھی نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ راہ سے بھی بھٹک جاتے ہیں۔'' عظمیٰ پیاز کاٹتے ہوئے سعادت مند بچوں کی طرح سر جھکائے آنٹی بختے کی باتیں سنتی رہی۔ آنٹی بختے اس کی رشتہ دار نہیں تھیں' وہ تو اس کی پڑوسن تھیں اور پورے محلے کی سب سے طویل العمر عورت تھیں۔ چنانچہ ان کا تجربہ بھی وسیع تھا۔ ان کی عمر ماشاء اللہ' ۸۰ سال کے لگ بھگ تھی مگر آج بھی ان کی نظر تیز تھی اور کمر بھی سیدھی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ گزشتہ چار پانچ سالوں سے انہیں لاٹھی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ دور دور تک پیدل چل کر رشتوں' شادیوں کے پیغامات وغیرہ کے سلسلے میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ عظمیٰ اور قیصر کی شادی بھی آنٹی بختے کی ہی مرہونِ منت تھی۔

''آنٹی...... ! ایسی بات نہیں ہے' قیصر مجھ سے پہلے کی طرح ہی نہایت محبت کرتے ہیں اور...... اور مجھے یقین ہے کہ بچوں کا پیار انہیں زنجیروں کی طرح جکڑے ہوئے ہے بلکہ بچوں کے پیار میں تو کبھی کبھی مجھے بھی بھول جاتے ہیں۔''

''عظمیٰ! یہ بات بھی مت بھول کہ مردوں کو بچے اپنے اور بیوی دوسرے کی ہی اچھی لگتی ہے۔''

عظمیٰ بحث کے موڈ میں نہیں تھی تبھی اس نے بات دوسری طرف موڑتے ہوئے آنٹی سے کہا۔ ''آنٹی! میں نے کل آپ کو ایک کام کہا تھا' اس کا کیا بنا؟''

''اے لو' وہ تو میں بھول ہی گئی۔'' آنٹی نے اپنے پلو سے گرہ کھولتے ہوئے پرچی نکال کر عظمیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''برکتے کہہ رہی تھی کہ ابھی ڈیڑھ سال کی کمیٹیاں باقی ہیں اور حساب کتاب اس پرچی پر لکھا ہے۔''

''آنٹی...... ! دُعا کیا کرو کہ ہماری کمیٹی نکل آئے تاکہ ہم ایک چھوٹا ہی سہی' اپنا مکان لے لیں۔ کم از کم ان کرایوں سے تو جان چھوٹے گی۔

•......•......•......•

قیصر اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ وہ درمیانے درجے کے لوگ تھے۔ اس کا باپ مشہور سنار کی دکان میں سیلز مین تھا' تھا تو وہ بالکل اَن پڑھ مگر حساب کتاب میں اتنا ماہر تا کہ لوگ کیلکولیٹر پر حساب کرنے بیٹھ جاتے تھے تو وہ جھٹ سے انگلیوں پر پورا حساب کر دیتا تھا۔ اس کی اسی خوبی کی وجہ سے اسے اچھی تنخواہ ملتی تھی جس سے وہ اپنے گھر کی کفالت اور قیصر کی پڑھائی کے اخراجات پورے کرتا تھا۔

میٹرک کرتے ہی قیصر نے نوکری شروع کر دی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مڈل اور میٹرک کی بہت ویلیو ہوتی تھی اور نوکریاں بھی جھٹ سے مل جاتی تھیں نہ ہی مہنگائی کا دور تھا اور نہ رشوت و سفارش کا بھوت کھلے عام پھرتا تھا۔ قیصر کی نوکری کو ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے والدین یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے اور وہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا تبھی آنٹی بختے نے قیصر کی شادی عظمیٰ سے کروا دی تھی۔ عظمیٰ بھی بے سہارا تھی اور میٹرک پاس تھی۔

ان کی شادی کو دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا' اس عرصے میں قیصر محنت کرنے والا' بیوی بچوں کا خیال رکھنے والا مثالی شوہر ثابت ہوا تھا۔ اس کی رفاقت میں عظمیٰ کی زندگی نہایت آرام وسکون سے گزر رہی تھی۔ اللہ نے اِس جوڑے کو تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ ان کا یہ چھوٹا سا گھرانہ نہایت خوش وخرم

تھا۔ دونوں میاں بیوی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے۔ عظمیٰ اپنے بچوں اور شوہر سے نہایت محبت کرتی تھی اور قیصر بھی ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی' بس گزارہ ہی تھا مگر عظمیٰ نہایت کفایت شعاری سے گھر کا نظام چلا رہی تھی' یوں ان کے چہار سو خوشیاں ہی خوشیاں تھیں' سکھ ہی سکھ تھا مگر......

زندگی صرف ایک ہی جیسے حالات کا نام نہیں' جس طرح ہر رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے' ٹھیک اسی طرح ہی ہر خوشی کے بعد غم اور ہر غم کے بعد خوشی زندگی میں لکھی ہوتی ہے۔ یہی تو قانونِ فطرت ہے۔ ایسا ہی کچھ عظمیٰ کے ساتھ بھی ہوا۔ نجانے اس کی چھوٹی سی جنت کو کس کی نظر لگ گئی کہ ہر وقت' ہر پل اس پر پیار اور محبت لٹانے والا شوہر قیصر یکسر بدل گیا تھا۔ عظمیٰ نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا' اب قیصر ہر وقت بچوں اور عظمیٰ پر کڑھنے لگا' بات بات پر انہیں ڈانٹنے لگا اور اب تو اس نے ہاتھ اٹھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ عظمیٰ اس تبدیلی پر حیرت میں ضرور تھی مگر اس نے اپنے دل میں کسی وہم یا شک کو جگہ نہ دی۔ وہ پہلے سے بڑھ کر قیصر کا خیال رکھنے لگی اور اسے مزید خوش رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ کام کی زیادتی یا کسی پریشانی کی وجہ سے قیصر کچھ چڑچڑا سا ہوگیا ہے۔ آنٹی بختے نے بھی قیصر میں آنے والی اس تبدیلی کا نوٹس لیا تھا' وہ بار بار عظمیٰ کو باخبر کرتی رہتیں مگر عظمیٰ نے کسی بھی خدشے اور بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دی۔

اُدھر قیصر کو عظمیٰ کے ہر کام میں عیب نظر آنے لگے بلکہ اب تو عظمیٰ میں بھی اسے سو سو نقص دکھائی دینے لگے۔ بچوں کی معصوم حرکتیں' ان کی شرارتیں بھی اب اسے بری لگنے لگی تھیں اور پھر یوں ہوا کہ وہ گھر دیر سے آنے لگا اور کئی کئی دن گھر سے غائب رہنے لگا۔ عظمیٰ سخت پریشان تھی۔ آنٹی بختے بھی روز ہی عظمیٰ کو سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ اپنے میاں کے معمولات پر نظر رکھا کرو' اسے زیادہ ڈھیل مت دو ورنہ ایک دن پچھتاؤ گی مگر عظمیٰ ہمیشہ کی طرح آنٹی کی بات سنی' اَن سنی کر دیتی۔ وہ آنٹی بختے کی اس قسم کی نصیحتوں سے چڑ جاتی تھی کیونکہ اسے اپنے شوہر پر بھرپور بھروسہ اور اس کی وفا پر پختہ یقین تھا۔ آخر کو اس نے دس سال اس کی محبت کی چھاؤں میں گزارے تھے اور سب سے بڑا اعتماد اسے اپنے بچوں کا تھا کہ عورت جب صاحبِ اولاد ہو جاتی ہے تو پھر اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب اس کے گھر کی بنیادیں مضبوط ہو چکی ہیں اور شوہر کے پاؤں میں بیڑیاں ڈل چکی ہیں۔

وقت گزرتا چلا گیا مگر قیصر کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اکثر گھر سے باہر رہنے لگا' کبھی دو دو دن تو کبھی ہفتہ ہفتہ بھر بعد اس کی شکل نظر آتی۔ ایک بار تو پورا ایک ماہ گزر گیا اور قیصر گھر نہ آیا۔ بلاشبہ یہ ایک پریشان کن بات تھی۔ عظمیٰ کا پریشانی اور فکر کے مارے برا حال تھا۔ اب تو رہ رہ کر اس کے دل میں وسوسے اور اندیشے سر ابھارنے لگے تھے جن سے وہ لرز اٹھتی تھی اور گھنٹوں سجدہ میں گر کر اپنے خالق سے اپنی چھوٹی سی جنت کے قائم رکھنے کی دُعائیں کرنے لگتی تھی۔ اس کے معصوم بچے اپنی ماں کو یوں روتے اور پریشان دیکھ کر سہمے سہمے رہتے تھے۔

حالات دن بدن ابتر ہوتے جا رہے تھے۔ اب تو مکان کا کرایہ بھی ادا نہ ہو پا رہا تھا' اوپر سے کمر توڑ مہنگائی میں بچوں کی اسکول کی فیسیں اور گھر کے بل اور دوسرا کھانے پینے میں جمع شدہ رقم جو عظمیٰ اپنے برے وقت کے لیے بچا کر رکھتی تھی' ختم ہوتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا رہی تھی پھر ایک روز سب راشن ختم ہوگیا۔ بچت کے تھوڑے سے پیسے بھی آخر کب تلک ساتھ دیتے؟ بچے بھوک سے بلکنے لگے تو وہ محلے والوں اور دکاندار سے ادھار راشن لینے لگی۔ وہ ہر پل اللہ سے اپنے شوہر قیصر کی صحیح سلامت واپسی کی دُعائیں کرتی رہتی اور آخر دو ماہ کے طویل انتظار کے بعد اسے اس کے شوہر کا خط اور منی آرڈر موصول ہوا۔ خط میں اس نے لکھا تھا کہ میں کام سے سلسلے میں بیرونِ شہر میں ہوں اور چند دن مزید گھر نہ آسکوں گا اور کچھ پیسے بھیج رہا ہوں، مکان کا کرایہ ادا کردینا وغیرہ وغیرہ مگر اس نے یہ نہ لکھا کہ کب واپس آئے گا؟ اس کے کام کی نوعیت کیا ہے؟ عظمیٰ بے چاری بار بار خط پڑھتی کہ شاید تاریخ، دن وغیرہ لکھا ہو کہ کب واپسی ہے؟ بچے اور عظمیٰ، قیصر کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس گئے تھے۔

روز ہی آنٹی بخت آتیں اور اس کا دل بہلاتیں، ساتھ ساتھ تشویش کا اظہار بھی کرتیں۔

''میں نہ کہتی تھی عظمیٰ، کہ اپنے شوہر پر نظر رکھا کر؟''

''آنٹی......! اس میں نظر رکھنے والی کون سی بات ہے، یہ دیکھ لو خط میں انہوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ چند دنوں تک آؤں گا۔'' عظمیٰ تنک کر کہتی۔

''یہ خط تو کئی دنوں بلکہ دو ہفتوں سے دکھا رہی ہے، آخر چند دن کب تمام ہوں گے؟'' آنٹی کی اس بات پر عظمیٰ حوصلہ ہار بیٹھتی اور آنٹی بخت کے کندھوں پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگتی۔

قیصر کے بغیر گھر ویران سا ہوگیا تھا۔ عظمیٰ کا دل کہیں نہیں لگتا تھا۔ تینوں بیٹے اسکول چلے جاتے تو وہ خالی گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ دروازے پر جا کر قیصر کی راہ تکتی رہتی۔ وہ باؤلی سی ہوگئی تھی، اکثر خود سے باتیں کرنے لگتی۔

''بچے تو آپ کے بغیر بہت اداس ہوگئے ہیں میرے سرتاج، مگر آپ تو ہمیں بھول ہی گئے ہیں۔ ایک بار بھی مڑ کر خبر نہ لی۔ جب آپ گھر آئیں گے نا تو میں خوب خبر لوں گی آپ کی، خوب لڑوں گی، یوں بھی کوئی اپنے پیاروں کو چھوڑ کر جاتا ہے بھلا؟ یوں بھی کوئی بے آسرا کرتا ہے کوئی؟'' یونہی خود کلامی کرتے کرتے وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کردیتی۔

.......•.......•.......•

''ٹھک......ٹھک......'' دروازے پر ہونے والی دستک پر عظمیٰ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ لشتم پشتم بھاگتی، اپنے دل کو سنبھالتی ہوئی دروازے پر پہنچی مگر سامنے قیصر نہیں، ڈاکیا کھڑا تھا جو ایک بڑے سائز کا لفافہ عظمیٰ کو تھما کر چلا گیا۔ وہ حیران، پریشان سی کھڑی لفافے کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی پھر جوں جوں وہ خط میں لکھی تحریر پڑھنے لگی، اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کے ہوش اڑ گئے اور اچانک چکرا کر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔ بچے گھبرا گئے اور ماں کو گرتے دیکھ کر رونے لگے۔ ناصر ذرا بڑا تھا اور کچھ سمجھ دار بھی، وہ فوراً کچن سے باؤل میں پانی بھر کر لایا اور ماں کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ چند لمحوں بعد عظمیٰ کو ہوش آیا تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بے اختیار رونے لگی۔

''امی جان......! پاپا نے کیا لکھا ہے خط میں؟ بتائیے نا امی جان......! آپ رو کیوں رہی ہیں؟ پاپا نے کیا لکھا ہے خط میں؟''

اس نے زمین پر پڑے طلاق نامے کے لفافے کو اٹھایا، لفافے میں ایک خط بھی تھا جس میں لکھا تھا۔

''عظمیٰ......! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بے
بت کرتی ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم میرا کتنا
رکھتی ہو اور کبھی میری خواہش ٹھکرا نہیں سکتی۔
ل تمہیں دکھ تو ضرور ہوگا مگر مجھے تمہاری محبت
ہی یہ حوصلہ دیا ہے کہ میں تم سے اپنی خوشیوں کی
مانگوں۔ بات یہ ہے کہ میں علیشاہ سے شادی
چکا ہوں، وہ میری خوشی ہے، وہ میرے بغیر اور میں
کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم شادی کرچکے ہیں۔ میں
یں طلاق نہیں دینا چاہتا تھا مگر میں علیشاہ کی ضد
آگے مجبور ہوں اور ہاں، اب میں کبھی تم سے نہ مل
ں گا اور بچوں کو بھی تم سے جدا نہیں کروں گا۔ اب
ی ان کی وارث ہو۔

قیصر''

.......•.......•.......•

زخم بے شک کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، وقت کا
م دھیرے دھیرے اسے بھر ہی دیتا ہے اور انسان
اذیت کو کم کردیتا ہے۔ زندگی اپنی ڈگر پر واپس آ
ی ہے۔ عظمیٰ کی زندگی بھی آہستہ آہستہ اپنی روٹین
نے لگی۔ ویسے بھی کوئی بھی ماں اپنے بچوں کو بھوکا
اور بے گھر ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ اس نے بھی
نے بچوں کی خاطر خود کو جلد ہی سنبھال لیا اور نزدیک
ایک فیکٹری میں نوکری کرلی۔ وہ تمام دن فیکٹری
کام کرتی۔ ناصر ذرا سمجھ دار تھا، وہ دس سال کا تھا۔
ول سے آتے ہی دونوں بھائیوں کو سنبھالتا، ان
کھانے اور دودھ کا خیال رکھتا، ان ضروری کاموں
فارغ ہوکر ماں کے پاس فیکٹری چلا جاتا اور
قدر کپڑوں کا وزن اٹھا سکتا تھا، اٹھا کر لے آتا
ہیں وہ گھر میں ہی بیٹھ کر کلیننگ کرتا۔ عظمیٰ شام کو
کے بعد آ کر گھر کے ضروری کام نپٹاتی اور پھر
والوں کے کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ رات گئے
ٹ سے چور ہوکر بستر پر لیٹتی تو فوراً نیند کی

مہربان دیوی اسے اپنی آغوش میں بھر لیتی۔

اس نے گھر اور گھر سے باہر کی تمام تر ذمہ داریاں اپنے کمزور اور ناتواں شانوں پر اٹھالی تھیں۔ اب اس کی زندگی کا واحد مقصد یہی تھا کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر انہیں روشن مستقبل دے۔ وہ ماں باپ دونوں بن کر بچوں کی دیکھ بھال کرتی، ان کی کڑی نگرانی کرتی اور بچوں کی ہر جائز ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتی۔

وقت پر لگا کر اڑتا جارہا تھا۔ ناصر نے میٹرک کرلیا تھا۔ اب وہ دن کو کالج جاتا اور شام کو پارٹ ٹائم جاب کرتا، یوں ماں کا ہاتھ بٹانے میں وہ اپنا حصہ ڈال رہا تھا۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ماں کے ساتھ کپڑوں کی کلیننگ کرتے تھے۔ اسی اثناء میں عظمیٰ کی کمیٹی نکل آئی اور اس نے اپنا سارا زیور وغیرہ بیچ کر اور کمیٹی کی رقم سے چھوٹا سا ذاتی گھر خرید لیا۔ اس طرح اس کی کرائے سے جان چھوٹ گئی اور زندگی کچھ اور آسان ہوگئی، تاہم اس سب کے باوجود آج بھی عظمیٰ، قیصر کو بھول نہ پائی تھی۔ اسے یاد کرکر کے وہ گھنٹوں روتی رہتی تھی۔

زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ آخر عظمیٰ کی محنت اور قربانیاں رنگ لائیں۔ ناصر کو بی اے کے بعد بہت اچھی جاب مل گئی اور ایک سال کی سروس کے بعد ہی وہ جنرل منیجر کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ یہ سب اس کی ماں کی قربانیوں اور دُعاؤں کا ہی نتیجہ تھا ورنہ ایسی کامیابیاں پلک جھپکتے میں کہاں ملتی ہیں۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ناصر منیجر کیا بنا، اس کے لیے رشتوں کی لائنیں لگ گئیں۔ عظمیٰ کو تو ہر لڑکی ہی پسند آجاتی مگر ناصر مسلسل انکار کرتا رہا، ہر بار عظمیٰ اس کے انکار کی وجہ پوچھتی تو وہ ٹال جاتا۔ دراصل وہ اپنی کمپنی کی ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکی پر دل ہار بیٹھا تھا جو اس کی اسسٹنٹ تھی۔ علیشبہ بھی اسے چاہتی تھی اور آئے دن اس سے شادی کا اصرار کرتی تھی۔

''ناصر......! تم آخر اپنی والدہ کو کب بھیجو گے؟ میرے والدین انتظار کر رہے ہیں ورنہ میرے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔''

''میں کیا کروں علیشبہ؟ میری ہمت نہیں ہوتی امی سے بات کرنے کی حالانکہ وہ مجھ سے بیسیوں دفعہ پوچھ چکی ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی' بس آج میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ ممی پاپا یقیناً تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''

ہوا بھی یونہی' علیشبہ کے امی اور ابو ناصر سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اس کی نوکری اور گھر کے متعلق سوال جواب ہوئے۔ جب علیشبہ کے ابو نے ناصر کے والد کے متعلق پوچھا تو اس نے غصے میں کہہ دیا۔

''وہ وفات پا چکے ہیں میرے بچپن میں ہی اور آج جو ہم اس مقام پر ہیں' یہ میری امی کی قربانیوں اور محنت کا نتیجہ ہے۔''

''سوسیڈ ناصر میں' تمہارے والد کی جگہ ہوں' بس رواج کے مطابق تم اپنی والدہ کو ہمارے گھر بھیجو۔''

علیشبہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور ان کی کل کائنات تھی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ بچپن سے ہی نہایت لاڈلی اور بے حد ضدی بھی تھی۔ وہ ہر بات منوا کر ہی دم لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے والدین ناصر سے اس کی شادی کے لیے رضامند ہو گئے تھے پھر ناصر نے بھی اپنی والدہ کو قائل کر لیا' سو رشتہ لے جانے کے لیے جمعہ کا مبارک دن طے ہوا۔ علیشبہ اور ناصر خوش تھے کہ اب ان کا ملن ہو جائے گا۔ خدا

خدا کر کے' جمعہ کا دن آیا' اس دن علیشبہ نے آفس سے چھٹی کر لی تھی مگر ناصر دفتر گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مثبت ہی جواب ہوگا اور یہ بھی یقین تھا کہ امی کو علیشبہ اور اس کے گھر والے پسند آ جائیں گے اور اس کا بھی امکان تھا کہ امی شادی کا دن فکس کر کے ہی لوٹیں گی۔ جوں ہی گھڑی نے پانچ بجائے' وہ فوراً دفتر سے نکلا اور گھر پہنچا مگر جب ماں کا پریشان چہرہ دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا امی؟'' عظمیٰ شاید خود کو اس قسم کے سوالات کے لیے تیار کر چکی تھی۔

''کچھ نہیں بیٹا......! بس مجھے لڑکی کے والدین ٹھیک نہیں لگے سو...... میں انہیں انکار کر چکی ہوں۔'' ماں کا کورا جواب سن کر ناصر کے تو پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔

''مم......مم......مگر کیوں امی......؟ میری شادی تو علیشبہ کے ساتھ ہونا ہے نا کہ اس کے والدین کے ساتھ؟''

''بس میں نے کہہ دیا نا کہ تمہاری شادی علیشبہ کے ساتھ نہیں ہو سکتی' سو نہیں ہوگی اور یہ میرا اٹل فیصلہ ہے اور بس۔'' امی نے سخت لہجے میں کہا۔ ناصر کو اپنی ماں سے اس قسم کے رویئے کی قطعی توقع نہیں تھی۔ وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر آ گیا اور غصے میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

اگلے دن ناصر آفس بھی نہیں گیا بلکہ کئی دن تک وہ گھر پر پڑا رہا۔ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا اور ماں سے بھی بات چیت بند کر دی تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ دفتر گیا۔ آخر کام بھی کرنا تھا۔ آفس گیا تو پتہ چلا کہ علیشبہ بھی ایک ہفتے سے آفس نہیں آ رہی۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ ہفتہ گزر گیا' علیشبہ یا اس کی فیملی میں سے کسی نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے علیشبہ کے گھر

...ن علیشبہ کی امی نے ریسیو کیا اور نہایت غصے ...ں نے کہا تھا۔ ''آئندہ کبھی فون نہیں کرنا اور ...ی ادھر کا رخ کرنا' ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں ...ھے تم؟'' علیشبہ کی امی نے اسے کھری کھری ...یں جبکہ ناصر حیران سا ریسیور دیکھتا رہ ...۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر بات کیا ہوئی ...ناصر نے اپنی امی سے بھی اصل بات معلوم ...ے کی کوشش کی مگر انہوں نے صرف اتنا ہی کہا

''مجھے اس کے والدین ٹھیک نہیں لگے' سو میں ...جواب دے چکی ہوں اور اب مزید اس ٹاپک ...نہیں کرنا چاہتی۔ تمہارے لیے بھی بہتر یہی ...ہ علیشبہ کو بھول جاؤ۔''

...چند دن بعد ناصر کو دفتر کے پتے پر ایک خط ملا جو ...نے اسے بھیجا تھا جس میں لکھا تھا۔

''ڈیئر ناصر......! اپنی محبت کی طرف سے ...ں سلام قبول کیجیے۔ میں نے زندگی میں پہلی ...بت کی مگر افسوس' میری محبت کامیاب نہیں ہو ...۔ میں آج بھی آپ سے پہلے کی طرح ہی محبت ...ں ہوں ناصر......! مگر مجھ پر بہت کڑے پہرے ...یں ہزار کوشش کے باوجود یہ پہرے نہیں توڑ ...۔ ہمارا ملن شاید ممکن نہیں۔ بس اسے تقدیر کا لکھا ...ر قبول کر چکی ہوں اور بہتر یہی ہے کہ آپ بھی ...بھول جاؤ۔

ہمیشہ آپ کا بھلا چاہنے والی علیشبہ!''

خط پڑھ کر تو جیسے اسے سکتہ سا ہو گیا۔ علیشبہ ...خط نے اسے پوری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ...خاموش خاموش رہنے لگا اور ہر وقت سوچوں ...ں گم رہتا۔ اس کی ماں سے بیٹے کی یہ حالت ...ی نہیں جاتی تھی چنانچہ ایک دن وہ پھٹ پڑیں۔

''ناصر......! یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟ آخر کیوں تم خود سے یوں لاپرواہ ہو؟ مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ خدا کے لیے' بس کرو' ختم کر دو یہ تماشہ۔''

''میری شادی علیشبہ سے کر دو۔'' اس نے نڈھال سے لہجے میں کہا۔

''نہیں' یہ نہیں ہو سکتا' یہ ناممکن ہے۔''

''مگر کیوں' آخر کیا وجہ ہے؟ آپ کیوں نہیں بتاتیں سب کچھ تو ٹھیک ہی تھا' اس کے گھر والوں کو بھی میں پسند تھا مگر اچانک...... اچانک یہ انکار کیوں؟ کیوں نہیں ہو سکتی میری شادی؟'' اس نے چلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ علیشبہ تمہاری بہن ہے۔'' یہ الفاظ تھے یا بم کے گولے جو ناصر پر گرے تھے۔

''کیا......؟''

''ہاں' علیشبہ تمہاری بہن ہے اور اس کے والد...... اس کے والد' تمہارے والد قیصر ہیں۔'' اتنا بتا کر وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

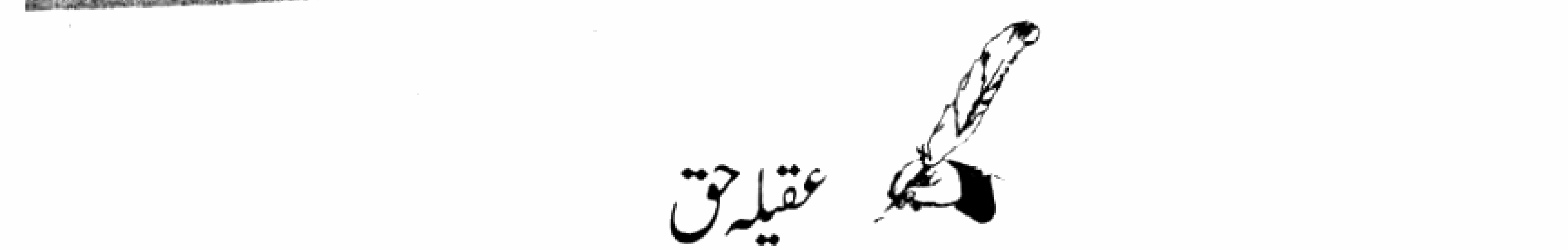
•......•......•......•

ایک دن پتہ چلا کہ علیشبہ نے خودکشی کر لی ہے مگر ناصر...... اسے تو جیسے قرار سا آ گیا تھا' شاید یہی ہونا تھا اور پھر اس کے بعد قیصر نے کئی بار عظمیٰ اور اپنے بچوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر نہ صرف عظمیٰ نے صاف انکار کر دیا بلکہ تینوں بیٹے بھی اس سے ملنے پر راضی نہیں تھے کہ آج اچانک ہمارے باپ کو ہماری یاد کیوں آ گئی؟ تب ہمارا باپ کہاں تھا جب ہمیں اس کی ضرورت تھی؟

سچ ہے کہ دنیا گول ہے' انسان جہاں سے چلتا ہے' گھوم کر وہیں واپس آ جاتا ہے مگر افسوس...... تب تلک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM
جی سہیلی



عقیلہ حق

بس دُعا چاہیے

رسا چغتائی کا خیال

زندگی صرف ایک پل ہے مگر
خوں رُلاتا ہے ایک پل برسوں

وقتی طور پر زندگی کی لذت اٹھانے والے کے خوف، عبرت اور توبہ کا قصہ

میں پنج وقتہ نمازی تو نہیں ہوں لیکن میں جب بھی مسجد جاتا‘ ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ کو مسجد کے دروازے کے پاس نمازیوں کی جوتیاں سنبھالتے اور سیدھی کرتے دیکھتا اور پھر جیسے ہی نمازی‘ نماز پڑھ کر باہر نکلتے‘ وہ بزرگ نمازیوں کے پیروں کی طرف جوتی بڑھاتے ہوئے التجائیہ لہجے میں کہتے۔ ’’میری مغفرت کی دُعا کرو۔‘‘ یہاں تک کہ رونے کے ساتھ اُن کی ہچکیاں بندھ جاتیں‘ آنسو اُن کی داڑھی کو بھگوتے رہتے۔

نجانے کیوں مجھے اُن بزرگ سے ایک عقیدت سی ہوگئی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر پوچھوں۔ ’’حضرت......! آپ سے ایسی کیا خطا ہوگئی ہے کہ مغفرت کی دُعا ختم ہی نہیں ہوتی؟‘‘ اور پھر ایک روز میں نے اُن سے یہ سوال پوچھ بھی لیا تھا جس کے جواب میں وہ بولے تھے۔ ’’مجھ گناہ گار‘ سیاہ کار کی کہانی سن کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا ہاں‘ یہ ضرور ہوگا کہ تم مجھ سے نفرت ضرور کرنے لگو گے۔‘‘ اور اس کے بعد انہوں نے پھر زاروقطار رونا شروع کردیا تھا اور پھر شاید یہ اتفاق ہی تھا کہ جس روز میں نے بزرگ سے سوال کیا تھا‘ اُس کے دوسرے دن سے وہ غائب ہوگئے تھے۔

کچھ روز بعد مجھے مسجد میں آنے والے ایک صاحب کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ وہ بزرگ بہت شدید بیمار ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اندھا کیا چاہے‘ دو آنکھیں‘ میں اُن کا ایڈریس معلوم ہوتے ہی سارے کام پس پشت ڈال کر اُن سے ملنے جا پہنچا تھا۔ وہ ایک کچی بستی کا بوسیدہ سا تقریباً ۴۰ گز کے پلاٹ پر بنا ایک کمرے کا ٹین کی چھتوں والا گرمی سے جھلستا ہوا مکان تھا جہاں بان کی چارپائی پر ایک معمولی سی چادر بغیر گدے کے بچھی تھی جس پر وہ بزرگ بخار کی شدت سے جھلستے ہوئے بدن کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔

WATCH EVERY THURSDAY AT 8:00PM
Ik Yaad Hai
اک یاد ہے



میرے سلام کے جواب میں انہوں نے کپکپاتا سا ہاتھ بڑھا کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر نجانے کیوں میرا دل چاہا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ یااللہ! بے بسی سی بے بسی تھی‘ یہ ایسی بے بسی تھی جو صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔

’’حضرت! آپ نے کچھ کھایا پیا بھی؟ دوائی لی؟ کسی ڈاکٹر کو بلاؤں؟‘‘ میں ایک ہی سانس میں سوالات کیے چلا گیا تھا۔

وہ مسکرائے تھے اور نقاہت زدہ آواز میں کہا تھا۔ ’’بہت کھایا‘ بہت پیا‘ اب حساب کا وقت آیا چلا جاتا ہے‘ کسی ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں کہ اب کوئی ڈاکٹر کچھ نہیں کرسکتا لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ میں مرنے سے پہلے تمہارے سامنے بھی اعترافِ گناہ کرلوں۔‘‘

یہ سب کہہ کر انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے لپک کر ان کو سہارا دیا تھا اور پھر ان کی کمر کے پیچھے دو تکیے سہارے کے لیے لگا دیئے تھے۔ ذرا دیر بعد وہ بزرگ آہستہ سے بولنا شروع ہوئے تھے اور میں ہمہ تن گوش ہوگیا تھا۔

’’میرا نام شبیر علی ہے۔ میرے ابا کا انتقال میرے بچپن میں ہوگیا تھا۔ میری اماں محلے کی بچیوں کو قرآن پڑھاتی تھیں‘ یوں ہمارے گھر میں ہر وقت چھوٹی بڑی بچیوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ اماں قرآن پڑھانے کے ساتھ ساتھ ہمارے محلے کی بہت سی لڑکیوں کو کشیدہ کاری اور سلائی بھی سکھاتی تھیں۔ ہمارے گھر کو محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مجھے اپنے گھر میں لہراتے رنگین آنچل بہت اچھے لگتے تھے۔ اس زمانے میں‘ میں کالج کی لائف بھی انجوائے کررہا تھا۔ میری اماں دن رات محنت کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے مجھے پڑھا رہی تھیں۔ میں پڑھائی میں بہت اچھا تھا لیکن پڑھائی سے ہٹ کر میرا دل اپنے گھر آنے والی اُن ڈری ڈری، سہمی سہمی بچیوں میں اٹکا رہتا۔

اکثر جب میں گھر پر ہوتا اور جب اماں اُن بچیوں کو سبق دیکر گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتیں تو میں کسی نہ کسی بچی کو سبق سننے کے بہانے اپنی گود میں بٹھا لیتا اور پھر میرا ہاتھ اُس بچی کے جسم پر رینگنا شروع ہو جاتا۔ بچی بے چاری شرم اور خوف کے مارے بول نہ پاتی۔ میری ان حرکات سے بچی جتنا سہمتی، مجھے اتنا ہی لطف آتا۔ یہ چھ سے آٹھ سال کی عمر کی بچیاں جو بڑی ہو رہی ہوتی ہیں، میری حرکات سے بہت جلد خوفزدہ ہو جاتی تھیں اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے محسوسات اور خوف کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔ میں جب اُن بچیوں کو اپنی گود میں بٹھاتا تو اماں دور دور سے دیکھ کر مسکراتی رہتیں۔ وہ شاید دل میں یہ سوچتیں کہ کیونکہ میری کوئی بہن نہیں ہے اس لیے میں بچیوں میں ایک خاص بہنوں والی دلچسپی رکھتا ہوں۔ ہائے میری بھولی بھالی جنتی ماں!

شام میں جب ذرا بڑی لڑکیاں کشیدہ کاری سیکھنے آتیں تو میں خیالوں ہی خیالوں میں ان کے جسم کے نشیب و فراز میں الجھ جاتا تھا۔ اُن لڑکیوں میں ایک ریشم بھی تھی، وہ صرف نام کی ریشم نہ تھی، ریشم کا لچھا تھی، سرخ و سفید رنگ، ہری آنکھیں، دراز قد، گھٹنوں کو چھوتے سیاہ بال، گلابی ہونٹ اور ہونٹوں کے پاس بیٹھا حسن کا نگہبان سیاہ تل۔ وہ ایک غریب مزدور کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو دن میں اجرت لے کر لوگوں کے کپڑے سیتی اور شام کو اماں سے کشیدہ کاری سیکھنے آتی۔ میں جب بھی اس کو دیکھتا، میرے سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ قصہ مختصر، دن میں تو اُن ڈری سہمی، چھوٹی معصوم بچیوں کے ساتھ شغل جاری رہتا اور رات ریشم کے خیال سے بہت بے چین گزرتی تھی۔

میں جتنا ریشم کے لیے تڑپ رہا تھا، وہ اتنی ہی میرے جذبوں سے بے خبر اور لاپرواہ تھی اور حد تو یہ تھی کہ وہ مجھے بھائی کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ دراصل اماں کی وجہ سے محلے والے مجھ پر بہت بھروسہ کرتے تھے، ویسے بھی بظاہر میں ایک سیدھا سادہ، شریف اور پڑھاکو قسم کا نوجوان سمجھا جاتا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا، اماں میری خالہ کے گھر قرآن خوانی میں گئی ہوئی تھیں۔ بچیوں کی چھٹی تھی، میں اس چھٹی اور اماں کی غیر موجودگی سے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک واہیات فلم دیکھ رہا تھا، اُس لمحے جب فلم کی گندگی میں ذہنی طور پر میں خود بھی شامل ہو گیا تھا کہ ریشم چلی آئی تھی۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے ٹی وی بند کیا تھا۔

''بھائی شبیر......! استانی جی کہاں ہیں؟'' اس نے سادگی سے پوچھا تھا۔ اس لمحے مجھے تصور میں ایسا لگا تھا جیسے ریشم میرے سامنے بے لباس موجود ہو۔

''اماں اندر اسٹور میں بیٹھی کپڑے درست کر کے رکھ رہی ہیں، خیریت؟'' میں نے اس پر اپنی ہوس بھری نگاہیں جما کر پوچھا تھا۔

''اماں نے کمیٹی کے پیسے منگوائے ہیں۔'' وہ اسٹور کی طرف بڑھتے ہوئے بولی تھی اور پھر اسٹور کے اندر چلی گئی تھی جہاں نہ اماں تھی نہ کوئی اور دل میں شیطان فوراً ہی یہ خیال لایا تھا کہ ایسے موقع زندگی میں کبھی کبھی ملتے ہیں، میں وہ لمحہ، وہ وقت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسٹور خالی دیکھ کر باہر آتی، میں نے تیزی سے اسٹور میں داخل ہو کر کنڈی لگا لی تھی۔

میری درندگی کے جواب میں ریشم تو جیسے بے جان ربڑ کی گڑیا بن گئی تھی، شاید وہ یہ سوچ کر سکتے

میں آ گئی تھی کہ استانی جی کے بیٹے شبیر بھائی نے یہ کیا کیا؟ استانی جی کے گھر میں اس کی عزت تار تار ہو گئی۔

وہ جانے سے پہلے سرد آواز میں بولی تھی۔

''شبیر......! میں تم کو اب بھائی نہیں کہہ سکتی، تم نے میرے ساتھ جو کیا ہے، اس پر میں اور میرا غریب باپ تمہارا کیا بگاڑ لیں گے؟ مجھے تو بددعا بھی دینی نہیں آتی، میں بھلا اپنی استانی جی کے بیٹے کو یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ اللہ تم کو مار دے، تم مر جاؤ، تمہارے ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں، تم برباد ہو جاؤ، میں کیا؟ میری اوقات کیا؟ استانی جی کہتی ہیں، اللہ بہت بڑا منصف ہے۔ میں نے اپنا معاملہ اور تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے کیا۔ اللہ جو بہتر سمجھے، تم سے کرلے۔'' یہ سب کچھ کہنے کے بعد وہ روتی ہوئی گھر سے نکل گئی تھی اور میں سر جھٹک کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

.......•.......•.......

''ہفتہ ہونے کو آیا، ریشم نہیں آئی۔ سوچ رہی ہوں، کل اس کے گھر جاؤں۔'' اماں نے رات کے کھانے پر مجھ سے کہا تھا۔

''چھوڑیں اماں......! اب آپ اس لڑکی کے لیے بھی پریشان ہو رہی ہیں۔ ہماری زندگی میں پریشانیاں کیا کم ہیں، اسے آنا ہوگا تو آ جائے گی۔'' میں اپنے اندر کا ڈر چھپاتے ہوئے بولا تھا۔ اگر اس نے اماں کو سب کچھ بتا دیا، میں یہ سوچ کر ہی لرز گیا تھا، سو میں نے اماں کو ریشم کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔

دوسری صبح ابھی ہم ماں بیٹا بیدار ہی ہوئے تھے کہ ہمارے گھر اطلاع آئی تھی، گزری رات کے کسی پہر سونے کے دوران میں ریشم کی دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ مرگئی۔ اماں، ریشم کی موت پر زار و قطار رو رہی تھیں کہ وہ ان کی دل چڑھی شاگرد تھی جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ناچنے لگوں کہ میں اپنے جرم کے افشا والے خوف سے بالکل آزاد ہو گیا تھا لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ اللہ میرے جرم سے واقف ہے اور وہ خطا کاروں اور ظالموں سے نبٹنا اچھی طرح جانتا ہے۔

.......•.......•.......

وقت کا کام گزرنا ہے اور وہ گزرتا چلا گیا۔ میری تعلیم ختم ہو گئی۔ میں نے شاندار نمبروں کے ساتھ انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ جاب بمع گھر اور گاڑی کی سہولت کے ساتھ مل گئی۔ میں اماں کو لے کر اس پرانے محلے سے نکل آیا۔ نئے ماحول اور گھر میں آنے کے بعد اماں نے میری شادی میری خالہ زاد نجمہ سے کر دی۔ اب اماں بہت مطمئن تھیں اور میں......

اللہ نے مجھے اوپر تلے دو بہت ہی پیاری پیاری بیٹیوں سے نوازا تھا۔ اماں اکثر میری بچیوں کو دیکھ کر کہتیں۔ ''شبیر بیٹا! نہ تو، تو اتنا خوبصورت ہے اور نہ ہی نجمہ، تیری بچیاں تو بالکل ریشم پر چلی گئیں۔ لگتا ہے ریشم نے نیا جنم لے لیا۔'' اماں کی ایسی باتیں سن کر میں اب کانپ جاتا تھا جبکہ دوسری طرف نجمہ، اماں

آگہی

اُسے چھو کر دیکھنا چاہا
اپنے من میں سمونا چاہا
حیراں تھا میں
بہت ناداں تھا میں
پر دھیرے دھیرے یہ اسرار کھلے
محبت تو اک خواب ہوتی ہے
خالص دلوں کا عذاب ہوتی ہے!!

شازلی۔ کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ریشم کی بابت پوچھنے بیٹھ جاتی تھی۔
وقت کا سفر جاری تھا کہ ایک روز اماں کا انتقال ہوگیا۔ اماں کے جاتے ہی میں اچانک عجیب وہمی اور شکی سا مرد بن گیا۔ میں نجمہ پر شک کرتا' اس کو کہیں آنے جانے نہ دیتا' جیسے جیسے میری بچیاں بڑی ہورہی تھیں' مجھے وہ تمام معصوم بچیاں یاد آنے لگی تھیں جن کی معصومیت کو میں داغدار کرچکا تھا' میں اپنی بچیوں کو سامنے بٹھا کر انہیں غور سے دیکھتا' ان سے سوالات کرتا کہ کوئی تمہیں گود میں تو نہیں بٹھاتا' کوئی تم کو ہاتھ تو نہیں لگاتا؟"

•......•......•......•

"نجمہ......! تم بچیوں کا بہت زیادہ خیال رکھا کرو' کسی کو ان کے قریب نہ آنے دیا کرو' کوشش کرو کہ کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ وہ......وہ......" اس روز میں نے ناشتے کی ٹیبل پر نجمہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کون ہاتھ لگائے گا نمرہ اور ثمرہ کو؟ یہ بھلا جاتی کہاں ہیں جبکہ انہیں اسکول میں داخل آپ نہیں کروانا چاہتے جبکہ ایک کی عمر آٹھ اور دوسری کی نو برس ہورہی ہے۔ لو خدا بھلا کرے' دنیا کیا ہے گی' باپ پوزیشن ہولڈر انجینئر' ماں گولڈ میڈلسٹ ایم ایس سی اور بیٹیوں نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی۔ قرآن بھی میں انہیں گھر پر خود پڑھا رہی ہوں۔ آفس جاتے ہوئے آپ گھر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا کر جاتے ہیں اور شام کو واپسی میں خود کھولتے ہیں' کسی رشتے دار کے گھر ہم نہیں جاتے' کوئی رشتے دار' محلہ پڑوس سے ہمارے گھر نہیں آتا' اب میں اور کیا کروں؟ دنیا سے انوکھی بیٹیاں ہیں آپ کی کیا؟"
نجمہ یہ کہتے کہتے رو پڑی تھی اور میں بوجھل دل کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ اب میں بھلا اس کو کیا بتاتا کہ اب میں جب بھی تنہا ہوتا ہوں' میرے کانوں میں ریشم کی آواز آتی رہتی ہے۔ "میں نے اپنا معاملہ اور تمہارا ہاتھ اللہ کے حوالے کیا۔" اور وہ تمام معصوم بچیاں جن کے ساتھ میں نے ماضی میں شرمناک حرکات کیں' اب اکثر میرے خیالوں میں آتی رہتی ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری اپنی دونوں بیٹیاں بھی ان کے درمیان موجود ہوں۔ میں نجمہ کو کیسے' کس دل اور منہ سے بتاتا کہ میرے ماضی کے گناہ مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ میں اپنی بچیوں کو' اپنی پھول جیسی معصوم بیٹیوں کو بچانا چاہتا ہوں' میں ڈرتا ہوں' میں راتوں کو سو نہیں پاتا' میری تو اب بس ہر دم یہی سوچ اور خواہش ہے کہ یہ دونوں جلد از جلد بڑی ہوں اور میں ان کی شادیاں کردوں' میں ان کو ریشم کے صبر سے بچانا چاہتا ہوں' میں ریشم کا مجرم ضرور ہوں لیکن میرے جرم کی سزا میری بیٹیوں کو کیوں ملے؟" میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل اپنے آپ سے باتیں کررہا تھا۔

•......•......•......•

کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے ریشم ہمارے گھر کے کونے میں بال کھولے بیٹھی ہے اور سسکیوں سے رو رہی ہے' اس کی سسکیاں مجھے سونے نہیں دیتیں اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ میں اپنی بچیوں کے کمرے میں جا کر وہیں ان کے پیروں میں تکیہ رکھ کر لیٹ جاتا اور پھر پوری رات میری آنکھوں میں کٹ جاتی تاکہ اگر کوئی ان کے پاس جائے تو پہلے مجھ سے ٹکرائے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ جب میرا وقتِ سزا آئے گا تو میں بس منہ تکتا ہی رہ جاؤں گا۔ اللہ گناہ گاروں کی رسی ضرور دراز کرتا ہے' ان کو ڈھیل بھی دیتا ہے لیکن وہ جب چاہتا ہے' رسی گھسیٹ بھی لیتا ہے اور میری رسی بھی کھینچ لی گئی تھی۔

•......•......•......•

میری بڑی بیٹی ثمرہ کا چودہ سال کی عمر میں میرے دوست کے جاننے والوں کے ہاں سے رشتہ آگیا۔ لڑکے کے ماں باپ نہیں تھے' وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ دبئی میں رہتا تھا۔ ان کی ڈیمانڈ صرف نیک اور خوبصورت لڑکی کی تھی اور میری بیٹی نا صرف یہ کہ انتہائی حسین تھی بلکہ پنج وقتہ نمازی اور پرہیزگار تھی۔ میں نے اپنی بچیوں کو پروں میں چھپا کر پالا تھا۔ میری بیوی نے اتنی چھوٹی سی عمر میں بیٹی کی شادی کرنے پر بہت اعتراض کیا تھا خصوصاً وہ بیٹی کو انجان لوگوں کے ساتھ دبئی بھیجنے پر بالکل تیار نہ تھی لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور ثمرہ کو گھر سے رخصت کردیا۔ وہ چند دن پاکستان میں رہنے کے بعد دبئی چلی گئی تھی۔

•......•......•......•

"ابو......! میرے دانت میں سخت درد ہے' مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلیے۔" میں اس رات گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ میری پھولوں سے زیادہ نازک بیٹی نمرہ گال پر ہاتھ رکھے میرے قریب چلی آئی تھی۔
"اس وقت' گیارہ بجے رات کو کہاں لے جاؤں؟" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔
"ابو......! پلیز' مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے' دن میں تو گیٹ پر تالا لگا ہوتا ہے اور پھر امی کی بھی طبیعت خراب ہے' میں کبھی آپ کے بغیر کہیں گئی ہوں؟ پلیز' چلیے۔" آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔
میں نے ایک نظر بخار میں جلتی اپنی بیوی نجمہ پر ڈالی تھی' دوسری نظر اپنی معصوم بیٹی پر۔ میں کبھی رات میں اپنی بچیوں کو لے کر کہیں نہیں جاتا تھا لیکن اس کی تکلیف مجھ سے نہیں دیکھی جارہی تھی اور پھر میں نجمہ کو بتا کر نمرہ کا ہاتھ پکڑ کے گھر سے نکل پڑا تھا۔
ابھی میں اپنی گلی سے نکلا ہی تھا کہ تین موٹر سائیکلوں پر سوار چھ لڑکوں نے میری گاڑی کو گھیر لیا تھا' لامحالہ مجھے بریک لگانے پڑے تھے۔
"کہاں جارہے ہو انکل' اس خوبصورت چیز کو لے کر؟" ایک لڑکے نے خباثت سے گاڑی میں منہ ڈال کر پوچھا تھا۔
"بکواس بند کرو......تم کو شریفوں سے بات کرنی نہیں آتی بے غیرتو......؟" میں غصے سے لرز رہا تھا اور نمرہ......وہ تو خوف کے مارے جیسے بے ہوش ہونے والی تھی۔

"ارے انکل......! کیا شرافت ورافت کا گانا گا رہے ہو' تمہاری بڑی بیٹی تو دبئی کی ڈانس پارٹیوں میں لوگوں کو جلوے دکھا رہی ہے' عیش کرا رہی ہے......" یہ کہنے کے بعد وہ لڑکا خباثت بھری ہنسی کے ساتھ میری گاڑی کا دروازہ کھول کر نمرہ کو باہر گھسیٹنے لگا تھا۔
میں نے اپنی بچی کو بچانے کی کوشش کی تھی...... لیکن ایک لڑکے نے اپنے پستول کا دستہ میری کنپٹی پر مارتے ہوئے کہا تھا۔ "اب تم آرام کرو اور ہمیں اپنا

بے بسی

بے بس ہواؤں کی طرح
تم بھی بے بس ہو
اور میں بھی
آخر کب تک......
یہ بے بسی ہم پر راج کرے گی
یا تو یہ دم توڑ دے گی
یا پھر......ہم......!

قربان علی ایری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM

کام کرنے دو۔''

ہاں......!میں بدنصیب ان درندوں کے درمیان اپنی بچی کو تنہا چھوڑ کر بے ہوش ہوگیا تھا...... اور پھر جب میری بیوی نجمہ کو نمرہ کے اغوا ہونے کی خبر ملی تو اس کا دل فوراً ہی دھڑکنا بھول گیا تھا۔

......•......•......•

پولیس دو دن تک میری بیٹی کو ڈھونڈتی رہی تھی۔ تیسرے دن صبح سہراب گوٹھ کی جھاڑیوں سے اُس کی برہنہ لاش ملی تھی۔ سگریٹوں سے اُس کا تمام جسم داغا گیا تھا' اُس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی تھی۔ میری وہ بیٹی جس کی انگلی بھی کسی نے نہ دیکھی تھی' وہ برہنہ پڑی رہی تھی۔

مجھ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور پھر مجھ پر ایک اور عذاب اس وقت آیا تھا جب مجھے اپنی دوبئی میں بیاہی بیٹی ثمرہ کے بارے میں یہ پتہ چلا تھا کہ جو لوگ اُس کو شادی کر کے لے گئے تھے' وہ تو پیشہ ور لوگ تھے' وہاں جا کر انہوں نے اس کو بھاری قیمت پر دلالوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور اب میری بیٹی وہاں کی ایک جدید اور ماڈرن طوائف بن گئی تھی۔

''اللہ مجھے معاف کر دے' میری سزا کو ختم کر دے' اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے جو میرے مرنے کے بعد میری قبر پر دُعاؤں کے پھول بھیجے۔

کیا تم میرے مرنے کے بعد میری مغفرت کے لیے دُعا کرو گے؟'' وہ اچانک ہی میرا ہاتھ تھام کر بہت لجاجت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے تھے اور میں جو سحر زدہ سی کیفیت میں بیٹھا ان کی کہانی سن رہا تھا' ایک دم حال میں واپس آ گیا تھا۔

''ہاں' ضرور کروں گا۔'' میں نے اس مرتے ہوئے بوڑھے شرمندہ آدمی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا۔ میرا یہ جواب سنتے ہی انہوں نے مطمئن ہو کر کلمہ کا وِرد شروع کر دیا تھا اور ساتھ ساتھ مجھے بھی کلمہ پڑھنے کی تلقین کی تھی اور پھر کلمہ پڑھتے پڑھتے ان کی روح پرواز کر گئی تھی اور میں ان کے ساکت بے جان وجود پر نظریں جمائے سوچتا رہا تھا کہ واقعی اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔

میری امی کہا کرتی تھیں کہ گناہ کی لذت چند لمحوں کی ہوتی ہے اور جواب دہی زندگی بھر کی' ہم گناہ کرتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ مالکِ دوجہاں ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔ ہم اس کے جس بندے کو تکلیف دے رہے ہیں' وہ اس کا سوال بھی کر سکتا ہے۔ بعض اوقات سزا ہمارے پیاروں کو بھی مل سکتی ہے۔ ہم چند لمحوں کی گناہ بھری لذت کے لیے زندگی بھر کا عذاب کیوں سمیٹ لیتے ہیں کہ جس سے نجات کی' بخشش کی کوئی صورت نہیں ہوتی؟

عین اسی وقت میرے دل سے آواز آئی تھی۔

''اللہ بہت رحمٰن ہے' رحیم ہے۔ اگر وہ قہار ہے تو وہ غفار بھی ہے۔ وہ توبہ کی توفیق بھی اُن کو دیتا ہے جن کی توبہ قبول کرتا ہے۔ وہ اپنے بندوں پر اُن کی ہمت سے زیادہ مصیبت نہیں ڈالتا۔ اس کو ندامت سے روتی آنکھ پسند ہے' سو مجھے امید ہے کہ اللہ ان گناہ گار بزرگ کو بھی معاف کر دے گا۔ میں تو ان کی بخشش کے لیے دُعا گو ہوں اور آپ سے بھی دُعا کی درخواست ہے۔

عمران ہارون چھوٹانی

فیصلہ آپ کریں

حزیں صدیقی کا خیال

عقل کچھ اور ہی سمجھاتی ہے
دل کے کچھ اور ہی تقاضے ہیں

ایسے نوجوان کا قصہ، جس کی قوتِ فیصلہ بہت تیز مشہور تھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے دوستوں کا خیال ہے کہ میری قوتِ فیصلہ بہت تیز ہے اور یہ صرف ان کا خیال ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک حقیقت بھی ہے۔ میں نے زندگی کا بڑے سے بڑا فیصلہ ایک سگریٹ ختم ہونے سے پہلے کرلیا مگر آج...... آج یہ خیال ختم ہوگیا ہے۔ کمرے میں دھواں پھیلا ہوا ہے۔ ایش ٹرے راکھ اور سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ہے اور اب تو سگریٹ کے ٹکڑے میں نے قالین پر پھینکنے شروع کردیئے ہیں۔ بیوی کئی دفعہ دروازہ کھٹکھٹا چکی ہے مگر میری سخت باتیں سن کر شاید روٹھ گئی ہے لیکن مجھے آج اس کے روٹھنے کی بھی پروا نہیں ہے۔ میرے سامنے آصف کی تصویر میز پر رکھی ہوئی ہے اور میں سوچ کی بھول بھلیوں میں گم ہوں۔ آصف جس کی باتیں مجھے آج بھی یاد آتی ہیں تو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ وہ ہنس مکھ اور شریر ابھی اس دنیا سے آشنا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنا ٹھکانہ دوسری دنیا میں بنالیا۔ آصف کی یادوں کے ساتھ میرے ذہن میں دوسری جو تصویر ابھرتی ہے' وہ شبانہ کی ہے' میرے دوست کی قاتل جسے دنیا کی کوئی عدالت سزا نہیں دے سکتی مگر اب میں اسے سزا دے سکتا ہوں۔ کیا میں برسوں کے چھپائے ہوئے اس غم کا انتقام لے لوں یا اس کی مدد کروں؟ بس یہی فیصلہ کرنا میرے لیے مشکل ہورہا ہے لیکن فیصلہ مجھے بہرحال کرنا ہے۔

•......•......•......•

آصف میرا کلاس فیلو اور روم میٹ ہی نہیں' بہت گہرا دوست بھی تھا۔ ہر وقت ہنسنا اور زندگی کے صرف روشن پہلوؤں کو دیکھنا اس کی عادت تھی۔ مجھے آصف پہلے ہی دن بہت پسند آیا تھا لیکن وہ اپنے متعلق کچھ نہیں بتاتا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنے تعلیمی اخراجات خود پورے کرتا ہے اسی لیے وہ اکثر کالج سے غائب رہتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے نمبر ہم سے زیادہ ہی ہوتے تھے اور میں اس عجیب و غریب انسان کے متعلق سوچتا۔ کئی دفعہ میں نے مختلف بہانوں سے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی مگر اس نے میرے اس عمل کا اتنا برا مانا کہ دوبارہ مجھے اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور آج مجھے برسوں پہلے کے واقعات ایسے محسوس ہورہے ہیں جیسے کل کی بات ہو۔

مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب وہ شور مچاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''حضرت افلاطون' کسی وقت تو کتابوں کی جان چھوڑ دیا کرو۔ سنو' تمہارے لیے خوشخبری لایا ہوں۔''

''اوہ' کیا بات ہے' کوئی نئی لڑکی؟''

''اوہ نہیں یار' تمہارے ذہن پر تو ہر وقت لڑکی سوار رہتی ہے۔ میں جنرل سیکریٹری کے لیے جناب کے کاغذات جمع کرآیا ہوں۔''

''کیا......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ اردو سمجھ سکتے ہیں۔ انگریزی میں بھی سمجھا سکتا ہوں کیونکہ ابھی ابھی انگلش ڈپارٹمنٹ کی دیسی انگریزی لڑکی سے ایک گھنٹہ انگلش بول کر آرہا ہوں اور تم جانتے ہو کہ یہ زبان بولنے سے میرے جبڑوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ اب چائے منگاؤ اپنے باپ کی رشوت کی کمائی سے......''

''کیا بکواس کررہے ہو؟''

''بکواس آج تک کرنے کی توفیق نہیں ہوئی' ہم نے ہمیشہ ارشاد فرمایا ہے اور ابھی ابھی ہم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم جنرل سیکریٹری کے انتخاب کے لیے آپ کے کاغذات جمع کرا آئے ہیں۔''

''مگر یار' تم کیوں بے عزتی کروا رہے ہو؟''

''زیادہ ٹرٹر نہ کرو' چائے کے ساتھ سموسے بھی منگواؤ۔ یقین کرو' جبڑوں میں شدید درد ہورہا ہے۔'' آصف نے جبڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم نے میرے دستخط بھی خود ہی کردیئے ہوں گے' مجھ سے پوچھا تو ہوتا؟''

''یار' بڑے کم ظرف ہو۔ اگر تمہیں اس پر اعتراض ہے تو جاؤ' ابھی جا کے خود نکاح پڑھاؤ اور میرے لیے دلہن لے آؤ۔ اگر انکار کروں تو جو سزا۔''

''بکواس بند کرو' کیوں بے عزت کروا رہے ہو؟''

''شرط لگالو اور جیتنے کی مٹھائی ابھی کھلا دو۔ تم جانتے ہو کہ ہر ڈپارٹمنٹ کی آدھی درجن لڑکیاں مابدولت کی مٹھی میں ہیں سوائے سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ کی نک چڑھی لڑکیوں کے جن کا بندوبست بھی کراوں گا۔ لڑکیوں کے ۸۰ فیصد ووٹ اپنے سمجھو لڑکوں کا بندوبست خود کرلینا۔ اب انسانوں کی طرح مان جاؤ ورنہ......'' آصف نے مکا دکھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا' مان جاتا ہوں مگر ایک شرط ہے۔''

''کیا......؟''

''یہ بتاؤ' آخر اتنی زیادہ لڑکیوں سے تم دوستی کس طرح کرلیتے ہو؟''

''وہ جانتی ہیں کہ میں بے ضرر انسان ہوں' تمہاری طرح اتنے بڑے بڑے دیدے پھاڑ کر انہیں نہیں دیکھتا' ان کا پیچھا نہیں کرتا' آوازے نہیں کستا۔ سیدھا جا کر کہتا ہوں کہ......''

''کیا کہتے ہو؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''کیوں؟ تمہاری نیت کس پر خراب ہے؟''

''لعنت ہے' میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔''

''مسٹر نقلی افلاطون' تم شاید نہیں جانتے کہ اصلی افلاطون نے گو کتابیں لکھ لکھ کر ڈھیر تو لگادیئے تھے مگر کسی حسینہ کا دل نہیں جیت سکا تھا۔ لاؤ کوئی تاریخی حوالہ اس سلسلے میں۔''

''تو تم بیک وقت بارہ درجن لڑکیوں پر عاشق ہو یا وہ تم پر عاشق ہیں۔''

''نہیں یار' تم سمجھتے نہیں ہو' اب محبت کا معیار بدل گیا ہے۔ میری تو وہ بس دوست ہیں' اس سے زیادہ میں نے کبھی نہیں سوچا' ویسے بھی میں اپنی اوقات جانتا ہوں' اس دور میں محبت انسان سے نہیں' اس کے سوشل اسٹیٹس اور اس کی دولت سے کی جاتی ہے اور مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔'' آصف نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

•......•......•......•

''میرا خیال ہے' اس جوڑے کو پکڑا جائے۔'' آصف نے ایک طرف کھڑی ہوئی دو لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

الیکشن میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے' آصف نے الیکشن کا سارا انتظام سنبھال رکھا تھا اور ہم کنویسنگ کے لیے سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ میں آئے ہوئے تھے۔

''ان کے سینڈلوں کی ایڑی ملاحظہ فرما لیجیے۔'' میں نے ازراہ مذاق کہا۔ اتنی دیر میں آصف ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''معزز خواتین......! کیا آپ اپنے نازک نازک پیروں کو ایک منٹ تکلیف دینا پسند فرمائیں گی؟''

''کیا مطلب؟'' دونوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ہمارے یہ دوست سیکریٹری جنرل کا انتخاب لڑرہے ہیں' دیکھیے' دعوے تو ہر کوئی کرتا ہے مگر یہ کچھ تجربے کرکے دعوے کریں گے۔''

مجھے آصف پر زبردست غصہ آرہا تھا مگر وہ بولے جارہا تھا۔ میں نے خونخوار نظروں سے اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا تو وہ مزید چہکنے لگا۔

''دیکھیے محترمہ......! بات یہ ہے کہ آپ جوتا اتار کر ایک ایک ان کے سر پر دے ماریں، جس جوتے کی چوٹ کم ہوگی' ویسے ہی جوتے الیکشن کے بعد یہ اپنے باپ کی رشوت کی کمائی سے پیش کریں گے۔ کیسا آئیڈیا ہے؟''

آصف کی بات سن کر دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''خاتون' بات یہ ہے کہ......'' میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اوئے' یہ خاتون ہے؟ ابھی بے چاری کی عمر ہی کیا ہے' مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ابھی فیڈر تقسیم کرنے کا مطالبہ کر دیں گی۔'' اس نے چھوٹے قد والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ غالباً اسے غصہ تو آیا مگر اس نے دراز قد لڑکی کے قہقہہ لگانے پر خود بھی قہقہہ لگا دیا۔

''دیکھیے مسٹر! ووٹ آپ کو مل جائے گا' نام بتا دیجیے۔'' دراز قد لڑکی نے کہا۔

''یہ ہیں رہبر بے مثل' جناب افتخار چوہدری صاحب اور اس خادم کو آصف کہتے ہیں۔'' آصف نے جھکتے ہوئے کہا پھر وہ دراز قد لڑکی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا نام؟''

''حنا شیخ۔''

''اور آپ کا خونخوار نام؟'' اس نے چھوٹے قد والی لڑکی سے کہا۔

''شبانہ۔''

''آگے پیچھے کوئی نہیں' اوہ' میں سمجھ گیا' ظاہر ہے' اتنی سی عمر میں آپ اتنی بڑی بات کیسے سمجھ سکتی ہیں؟''

''اوہ' دیکھیے مسٹر' آپ بدتمیزی کر رہے ہیں۔''

''بدتمیزی تو ہمارا پیدائشی حق ہے' اگر آپ وعدہ کریں کہ ووٹ دیں گی تو جان چھوٹے گی ورنہ......''

''اوہو' کیا مصیبت ہے' جناب' ووٹ مل جائیں گے۔''

یہ شبانہ کے ساتھ میری اور آصف کی پہلی ملاقات تھی۔

الیکشن میں نے بھاری اکثریت سے جیت لیا۔ میری کامیابی کا سہرا آصف کے سر ہی تھا۔ جس دن میں نے پارٹی دی' شبانہ اور حنا بھی آئیں۔ آصف انہیں میری طرف آتا دیکھ کر خود بھی دوسروں کو چھوڑ کر میری طرف چلا آیا۔

''افتخار صاحب' کامیابی مبارک۔'' شبانہ نے کہا۔

''مت کیجیے گا مبارک باد قبول۔ انہوں نے ووٹ تمہیں نہیں دیا۔'' آصف نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' حنا نے قدرے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اب تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ووٹ ہمیں نہیں ملے' تاہم میں نے آپ دونوں کے لیے اور خاص طور پر مس شبانہ کے لیے خاص تحفے کا انتظام کر رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر آصف مڑا اور میز کی دراز سے سفید رنگ کا ڈبا نکال لایا اور شبانہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

شبانہ نے قدرے ناراضگی سے ڈبا کھولا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ کچھ پروا کیے بغیر اس نے ڈبا آصف پر دے مارا مگر آصف نیچے بیٹھ گیا اور ڈبے نے اپنے لیے ٹھیک وہ جگہ منتخب کی جہاں پروفیسر شیرازی کی عینک تھی اور بدقسمتی سے عینک اس وقت پروفیسر صاحب کی ناک پر تھی۔ عینک کو ساتھ لیے ہوئے ڈبا نیچے گر پڑا اور پھر شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ پروفیسر کی عینک بھی ٹوٹ گئی مگر اس سے پہلے ہی پروفیسر کے کھلے ہوئے منہ سے چیخ نکل چکی تھی۔ تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی نظریں پروفیسر شیرازی پر جمی ہوئی تھیں۔ فرش پر عینک کے شیشوں کے ساتھ فیڈر کی کرچیاں بھی پڑی تھیں۔ شبانہ کے

چہرے پر غصے کی جگہ اب خفت نے لے لی تھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' پروفیسر شیرازی دہاڑے۔

''سر......! وہ......وہ......'' شبانہ ہکلانے لگی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آصف جو ابھی تک مسکرا رہا تھا' یہ دیکھ کر آگے بڑھا اور پروفیسر شیرازی کے پاس پہنچ کر بولا۔

''سر......! چلیے' میں آپ کو باتھ روم تک لیے چلتا ہوں' غالباً چوٹ بھی لگی ہے۔'' آصف کی بات سن کر پروفیسر کچھ پریشان ہوگئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے' آصف انہیں باہر لے جا چکا تھا۔

پروفیسر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد شبانہ بھی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آصف واپس آیا تو کہنے لگا:

''بڑی مشکل سے معافی مانگ کر جان چھڑائی ہے ورنہ وہ تو کہہ رہے تھے کہ اس لڑکی شبانہ کی شکایت پرنسپل سے کریں گے۔'' پھر وہ حنا کی طرف مڑتا ہوا بولا۔

''تاہم آپ اس انگارے سے کہہ دیجیے گا کہ کچھ نہیں ہوگا' وہ پریشان ہو کر اپنے خون میں کمی نہ کرے۔ میں نے الزام اپنے سر لے کر پروفیسر صاحب کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔''

آصف میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ مسئلے کو سلجھانے کا بہترین حل فوراً ڈھونڈ لیتا تھا۔

•......•......•......•

اور پھر آصف کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس پر اسے خود بھی یقین نہیں آتا تھا۔ اب وہ اکثر شبانہ کے ساتھ نظر آتا۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگ گئیں۔ ایک دن وہ خوش خوش واپس آیا تو میں نے پوچھا۔

''حضرت' یہ کیا چلن اپنا رکھے ہیں؟''

''کیا مطلب ہے بھائی افلاطون؟'' اس نے سوئیٹر اتار کر پلنگ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''آج کل سائیکولوجی ڈپارٹمنٹ کے بڑے چکر لگ رہے ہیں۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟''

''یار' بات یہ ہے کہ میں نے کسی بھی لڑکی سے دوستی کرتے وقت واپسی کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا تھا مگر یقین کرو' اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو دروازہ ہی نظر نہیں آتا۔'' آصف کو سنجیدہ دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔

''مگر آصف' تم تو محبت کو سراب کہتے تھے؟''

''ہاں' کہتا تھا' اب بھی کہتا ہوں مگر یہ سراب اتنا خوبصورت ہے کہ اس میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔''

آج آصف بالکل بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی آصف تھا جس نے کبھی کسی کو اہمیت نہیں دی تھی۔ سائیکولوجی پڑھنے والی نازک اندام لڑکی نے نہ جانے سائیکولوجی کا کون سا گر استعمال کیا تھا کہ آصف صاحب اپنے آپ میں نہیں رہے تھے۔

دن گزرتے گئے' شبانہ اور آصف کی محبت روز بروز پروان چڑھتی رہی' کوئی بات کرو' شبانہ آموجود ہوتی۔ موسم کا ذکر کرتا تو کہتا۔ ''ہاں' سوچ رہا ہوں کہ شبانہ کے ساتھ پکنک پر جاؤں۔'' حتیٰ کہ بیماری کا ذکر ہوتا تو کہتا۔ ''یار' ایک تو شبانہ کی ماں کی بیماری نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے' بعض اوقات اچھے خاصے رومانٹک موڈ کا ستیاناس ہو جاتا ہے محترمہ تذکرہ اپنی ماں کا لے بیٹھتی ہیں۔''

کئی دفعہ میں بھی اُن کے ساتھ پکنک پر گیا۔ آصف اب بھی اسے تنگ کرتا لیکن اب وہ آصف کے مزاج کو سمجھ گئی تھی' وہ ناراض ہونے کی بجائے قہقہے لگاتی۔

وقت کا پرندہ اڑتا گیا۔ امتحان ہوئے اور ہم فائنل ایئر میں پہنچ گئے۔

•......•......•......•

ایک دن آصف آیا تو کچھ پریشان تھا۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔

''شبانہ کہہ رہی ہے کہ کل میں اُس کے گھر چلوں مگر......''

''اوہ اگر مگر کیا' اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ' چلے جاؤ۔''

''مگر یار' نہ جانے میں کیوں اُن کے گھر نہیں جانا چاہتا۔'' آصف نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں آج تک تمہاری اس طوفانی محبت کو نہیں سمجھ سکا۔ اگر وہ تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہے تو کیوں نہیں جاتے؟''

دوسرے دن آصف' شبانہ کے گھر گیا تو واپس آ کر کہنے لگا۔

''یار' مجھے وہ لوگ کچھ پسند نہیں آئے یا بہ الفاظِ دیگر میں انہیں پسند نہیں آیا کیونکہ وہ ایسی باتیں پوچھنے لگے جو مجھے پسند نہیں۔''

''کیسی باتیں؟''

''تمہارے والدین کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کتنے مکان ہیں؟ مستقبل میں کیا ارادے ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ ایسی باتوں سے میری جان جلتی ہے۔''

''آخر بتا دینے میں حرج ہی کیا ہے؟ مجھے کچھ نہیں بتاتے' یہ دوسری بات ہے لیکن اپنے سسرال والوں کو بتا دیتے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''یار' تم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر میں اپنے والدین کے حوالے سے لوگوں سے ملوں تو بہت سے لوگوں کی نظریں بدل جائیں۔ میں سچائی کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا پھر اچانک تیزی سے بولا۔ ''اچھا یار' گولی مارو ان باتوں کو۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

آصف اور شبانہ کے رومانس میں روز بروز ترقی ہوتی رہی مگر پھر ایک تیسری شخصیت اُن کے درمیان آ گئی۔ یہ امجد تھا' شبانہ کا کزن امجد' کراچی سے لاہور آیا تھا اور اسے داخلہ آصف کی کوشش سے ہی ملا تھا۔ امجد کے آنے کے بعد شبانہ نے اس کی گاڑی میں آنا شروع کر دیا۔ ایک دن آصف مجھ سے کہنے لگا۔

''یار' یہ مجھے شبانہ کا امجد کے ساتھ آنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں مگر وہ مانتی ہی نہیں۔''

''معاملہ خطرناک ہے۔ بہرحال تم خود اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہو' ڈھونڈ لو کوئی راستہ۔''

اس گفتگو کے کچھ دن بعد آصف بہت پژمردگی کے عالم میں کمرے میں آیا۔

''کیا بات ہے پارٹنر؟'' میں نے پوچھا۔

''یار' میں شبانہ کا امجد کے ساتھ آنا اور گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر...... مگر مجھے خود پر قابو نہیں رہا۔ آج شبانہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے امجد کے بارے میں اس سے شکوہ کیا لیکن اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ وہ اس کا کزن ہے اور وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔''

''تو کیا......؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں دوست' محبت کو شکست ہو گئی۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

چند روز بعد میں کالج سے ہاسٹل آ رہا تھا کہ اچانک شبانہ کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اس وقت میں کالج گارڈن سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا' شاید اس کے ساتھ آصف ہے۔ میں قہقہوں کی طرف بڑھا لیکن جونہی میں درخت کی اوٹ سے باہر آیا' مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین میرے قدموں سے نکل گئی ہو۔ شبانہ اور امجد ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مشغول تھے مگر میں نے اس واقعے کا آصف سے ذکر نہیں کیا' نہ معلوم کیوں؟

•......•......•......•

میں چند دنوں کے لیے راولپنڈی گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو کمرے میں آصف سسکیاں لے رہا تھا۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ کیا یہ وہی آصف تھا جو بڑی سے بڑی مصیبت کو ہنس کر ٹال دیتا تھا؟ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں بے قابو ہو گیا۔ کندھے سے پکڑ کر چہرہ اپنی طرف کیا تو یہ دیکھ کر میرے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ زخمی بھی تھا۔ اس کے سر پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی جس پر میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔

''کیا بات ہے' تمہاری یہ حالت کس نے بنائی ہے؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں......''

''بکواس مت کرو' بتاؤ' کیا بات ہے؟ میرے ہوتے ہوئے تم پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کس نے کی؟'' میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھا۔

''افتخار...... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' کسی نے کچھ نہیں کہا۔ تم خواہ مخواہ مجھے تنگ کر رہے ہو۔''

غصے کی جگہ کوفت نے لے لی اور میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بھاگا پھر جب ڈاکٹر کو رخصت کر کے واپس آ رہا تھا کہ نوید سے ملاقات ہو گئی۔ نوید ہمارا کلاس فیلو تھا' اس کا جبڑا سوجا ہوا تھا۔

''کیا باکسنگ شروع کر دی ہے؟'' میں نے مذاقاً پوچھا۔

''تمہیں آصف نے نہیں بتایا کہ کتنی اچھی 'باکسنگ' ہوئی تھی؟''

''کیا مطلب؟''

پھر نوید نے مجھے بتایا کہ آصف حادثے میں نہیں بلکہ لڑائی میں زخمی ہوا تھا۔

آصف سے کوئی نہیں لڑا تھا بلکہ آفتاب نامی ایک لڑکے کی امجد سے لڑائی ہو گئی۔ کالج کے باہر آ کر آفتاب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ امجد کو پکڑ لیا اور پٹائی شروع کر دی۔ اتنے میں آصف آ گیا۔ یہ دیکھ کر آصف' آفتاب وغیرہ سے الجھ پڑا اور پھر خاصا ہنگامہ ہوا۔ آخر لڑکوں نے لڑائی بند کروا دی۔ آصف نے خوب پٹائی کی تھی اور وہ امجد کو خود گاڑی میں سوار کروا کر آیا تھا۔ جاتے وقت آصف ٹھیک ٹھاک تھا یعنی اسے چوٹیں تو نہیں لگی تھیں لیکن اس کے حواس درست تھے مگر جب واپس آیا تو حواس میں نہیں تھا' میں سہارا دے کر اسے ہاسٹل لایا تھا۔ نوید کا خیال تھا کہ شبانہ جو وہاں موجود تھی گاڑی میں' اس نے آصف سے کچھ کہا تھا۔ اسی ہنگامے میں چند مکے نوید کے بھی لگے تھے۔ مجھے آصف پر بہت غصہ آیا' پہلی بات تو یہ کہ اسے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا تک تھی؟ واپس آیا تو آصف کی سسکیاں اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔

''تمیس مار خاں...... تمہیں پرائی لڑائی میں ٹانگ پھنسانے کو کس نے کہا تھا؟ اب بچوں کی طرح کیوں رو رہے ہو؟''

''افتخار' تم جانتے ہو کہ میں بزدل نہیں ہوں' جسم پر لگے ہوئے زخموں کا تو مجھے احساس بھی نہیں ہے۔ رو تو میں دل کے اس زخم پر رہا ہوں جس کا گھاؤ بہت ہی شدید ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس نے...... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے آفتاب اور اس کے ساتھیوں سے امجد کو پٹوایا ہے' اس نے مجھے ذلیل کیا' اس نے کہا کہ اب اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''لعنت بھیجو ایسی لڑکی پر' اچھا ہوا' اس کی اوقات کا ابھی پتہ چل گیا ورنہ ساری زندگی پچھتاتے رہتے۔''

''افتخار' تم نہیں سمجھ سکتے' اسے مجھ سے محبت نہیں ہے مگر مجھے تو اس سے سچی محبت ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں ہمیشہ واپسی کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں مگر شبانہ کے ساتھ میں نے جب مڑ کر دیکھا تو دروازہ بند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو چکا تھا۔ اب وہ اگلا دروازہ بند کر کے نکل گئی ہے اور میں پنجرے میں پھنس گیا ہوں۔''

''چھوڑو اس فلسفے کو مگر تم لڑے کیوں تھے؟''

''افتخار' میرے بھائی' مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں نہیں بتایا۔ ہماری بول چال تو کئی دنوں سے بند تھی اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس سے نہیں ملوں گا مگر افتخار' میں نہ سہی' امجد تو شبانہ کو عزیز ہے' جب میں نے امجد کو پٹتے دیکھا تو شبانہ شور مچا رہی تھی' اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں نے بھی لڑائی میں حصہ لے لیا مگر اس نے اس کا ذمے دار مجھی کو ٹھہرایا۔ اف خدایا! میں یہ سب کچھ سننے سے پہلے مر کیوں نہ گیا؟''

•......•......•......•

پھر آصف کی زندگی کا بدترین دور شروع ہوا۔ اس نے اپنی پروا کرنا چھوڑ دی' نہ کھانا وقت پر کھاتا نہ سوتا وقت پر۔ اسے سگریٹ سے نفرت تھی مگر اب وہ ایک کے بعد دوسری سگریٹ سلگائے رکھتا۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ شبانہ کی بے وفائی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس بے وفا کی یاد کو سینے سے لگائے سلگتا رہا لیکن اس نے تعلیم پر اپنی توجہ میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

آصف کی یہ حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے شبانہ سے مل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ آصف سے میں نے اس سے پہلے یہ بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ امجد اور شبانہ کو ساتھ ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ اب بھی میں نے خود ہی ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں کئی بار شبانہ کے ڈپارٹمنٹ گیا مگر معلوم ہوتا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی امجد کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ کئی دفعہ مجھے امجد کی گاڑی میں بھی نظر آئی مگر میں نے بات کرنا مناسب نہ سمجھی۔

ایک دن میں لائبریری سے آرہا تھا کہ اچانک اس سے ملاقات ہوگئی' وہ اکیلی آرہی تھی' آج وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگی۔ اس کا تروتازہ چہرہ دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے آصف کا پژمردہ چہرہ آ گیا۔

''ایکسکیوز می مس شبانہ' میں آپ کے چند منٹ لینا چاہتا ہوں۔'' میں نے قریب پہنچ کر کہا۔

''جی فرمائیے۔''

''مس شبانہ! مجھے آپ سے یہ بات کرنے کا کوئی حق تو نہیں ہے مگر میں اپنے دوست کی حالت دیکھ کر مجبور ہو چکا ہوں کہ آپ سے کچھ کہوں۔''

''دیکھیے افتخار صاحب' آصف کے علاوہ میں دنیا کے ہر موضوع پر بات کرسکتی ہوں۔''

''آصف کے متعلق کیوں نہیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھیے مسٹر افتخار' زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے' آصف ایک اچھا لڑکا ہے مگر نہ تو اس کا کوئی سوشل اسٹیٹس ہے اور نہ ہی بینک بیلنس...... وہ مجھے پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔''

''مگر وہ آپ سے محبت کرتا ہے' شدید محبت؟''

''معاف کیجیے گا افتخار صاحب' وہ دوسری لڑکیوں سے بھی ملتا تھا۔ میں امجد سے ملنے لگی تو اس نے شور مچانا شروع کردیا اور پھر اس کی آفتاب والی حرکت میں کیسے فراموش کرسکتی ہوں؟''

''مس شبانہ' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں قسم کھا سکتا ہوں کہ آصف نے ایسا نہیں کیا۔''

''چھوڑیے ان باتوں کو' مجھے ذرا جلدی ہے پھر باتیں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر میرے اصرار کے باوجود وہ چلی گئی۔

میں کفِ افسوس ملتا ہوا کمرے میں آیا تو آصف کو تیز بخار تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تو اس

نے دوا وغیرہ دی اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

''اماں کے گھر والوں کو اطلاع دے دیجیے' مجھے کسی خطرناک مرض کے آثار نظر آرہے ہیں۔''

میرے اصرار پر وہ دوائی تو لے آیا تھا لیکن شاید اس نے ایک دفعہ بھی صحیح طریقے سے استعمال نہیں کی تھی۔ وہ مکمل طور پر اپنی صحت کے متعلق لاپروا تھا۔ آصف کے چہرے پر جو کبھی گلاب کی طرح سرخ ہوتا تھا' اب زردی نے ڈیرے جما لیے تھے۔ وقت گزرتا رہا اور پھر امتحان قریب آ گئے۔ اب آصف زیادہ وقت مطالعے پر صرف کرتا۔ کھانا میں لے آتا تو کھا لیتا۔ اُن دنوں وہ ایک بات کہا کرتا تھا۔

''میں نے ایک بازی تو ہار دی ہے لیکن مرنے سے پہلے میں کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

امتحان کے دن قریب آ گئے۔ اُن دنوں پھر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مجھے پتہ چلا کہ امجد اور شبانہ کے لیکچر شارٹ ہیں' ان کا داخلہ نہیں بھجوایا جا رہا ہے۔ میں نے سرِ راہ اس کا ذکر آصف سے کر دیا تو اس نے اصرار شروع کر دیا کہ میں ان کا داخلہ بھجوانے کی کوشش کروں۔ میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا' آخر وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟ میں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا غرض؟ مگر پھر مجھے اس کے مجبور کرنے پر اُن کے پروفیسروں کو کہنا پڑا۔ جنرل سیکریٹری ہونے کی وجہ سے وہ میری بات پر توجہ دیتے تھے۔ قصہ مختصر اس کا داخلہ ہوگیا۔

امتحان کے بعد شبانہ صرف ایک دو دفعہ ملی۔ آصف کی صحت تیزی سے گرنا شروع ہوگئی تھی۔ میں نے ایک پارٹ ٹائم سروس کرلی۔ اگرچہ میرے والدین نے اس کی مخالفت کی تھی مگر میں لاہور نہیں چھوڑنا چاہتا تھا یا دوسرے لفظوں میں آصف کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

آصف کی صحت تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔ آخر اسے اسپتال میں ایڈمٹ کروانا پڑا' کچھ عرصے بعد اس کی صحت سنبھلی مگر پھر خراب ہوتی گئی۔ آخر امتحان کا نتیجہ نکلا۔ آصف کے بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ میں اس کی سند لے کر جب اس کے پاس پہنچا تو اس کی حالت خراب تھی لیکن سند دیکھ کر وہ ساری تکلیف بھول گیا اور پھر وہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس دن میں اسپتال سے باہر نکلا تو شبانہ سے سامنا ہوگیا۔ وہ غالباً اپنی کسی سہیلی کی عیادت کے لیے آئی ہوئی تھی۔

میں نے اسے پاس ہونے پر مبارک باد دی اور پھر کہا کہ وہ آصف کو دیکھ لے مگر اس نے بہت سنگدلی سے انکار کر دیا۔ اس وقت مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔

دوسرے دن میں پھر آصف سے ملنے گیا تو اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لفافہ میرے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

''افتخار بھائی' تم نے میرے لیے مصیبتیں برداشت کی ہیں' اب تمہیں آخری تکلیف دے رہا ہوں' یہ لفافہ کراچی میں میرے ایک عزیز کے لیے ہے۔ میری موت کے بعد انہیں پہنچا دینا۔''

''کیوں بری باتیں منہ سے نکالتے ہو؟'' میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

''افتخار......! میں سب جانتا ہوں' تمہیں میری موت پر افسوس تو ہوگا مگر اسے مشیتِ ایزدی سمجھ کر قبول کر لینا۔''

''کوئی دوسری بات کرو۔'' میں نے باتوں کا رخ اپنی سروس کی طرف موڑ دیا۔ آصف بھی باتیں کرتا رہا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اس دن میں معمول سے زیادہ اس کے پاس رہا جب واپس آیا تو نہ جانے کیوں دل بوجھل ہو رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو تین دن بعد میں آصف سے ملنے پھر اسپتال پہنچا تو اس کا بیڈ وہاں نہیں تھا۔ قدرے پریشان ہوا' نرس سے پوچھا تو اس نے کہا۔

''سوری مسٹر' غالباً وہ آپ کے عزیز تھے۔ ان کا آج صبح انتقال ہوگیا ہے۔''

''کیا..... ؟'' مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہو۔

•......•......•......•

ڈیفنس سوسائٹی' کراچی کے اُس خوبصورت بنگلے کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا میں بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ڈرائنگ روم بہت آراستہ تھا' مختلف نوادرات رکھے ہوئے تھے' میری نظریں اُن میں الجھی ہوئی تھیں۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی' تصویر مجھے شناسا سی محسوس ہوئی۔ میں نے غور کیا تو حیران رہ گیا' یہ آصف کی تصویر تھی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' اتنے میں ایک باوردی ملازم داخل ہوا۔

''میاں.....! بات سنو۔''

''جی.....'' ملازم نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟''

''سیٹھ صاحب کے صاحبزادے آصف میاں کی ہے۔''

''کیا؟'' مجھے ملازم کی بات کا قطعاً یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک باوقار خاتون اندر داخل ہوئیں۔ میں احتراماً کھڑا ہوگیا۔

''میں سیٹھ اکرم صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ آصف کا دوست ہوں۔''

''بیٹھو بیٹے!'' خاتون نے بے چینی سے کہا۔

''آپ.....؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''مسز اکرم ہوں۔ آصف ہمارا بیٹا ہے۔ کہو' وہ خیریت سے تو ہے؟ ہم نے اسے بہت تلاش کیا لیکن نامعلوم اسے کیا ہوگیا؟''

''اس نے مجھے یہ لفافہ آپ کو دینے کے لیے کہا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ آصف آپ کا بیٹا ہے۔ وہ میرا انتہائی عزیز ترین دوست تھا۔'' میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میں اتنی بھیانک خبر انہیں کس طرح سناؤں؟

''تھا سے کیا مطلب؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''یہ بات کہتے ہوئے خود میرے دل پر خنجر چلتا ہے لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ آصف کا انتقال ہوگیا ہے۔''

''کیا؟'' مسز اکرم کا چہرہ سفید ہونے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا' وہ بے ہوش ہو گئیں۔

•......•......•......•

آصف' سیٹھ اکرم کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ سے کچھ اختلاف ہوگیا تو بجائے اُن کا سامنا کرنے کے' وہ گھر سے بھاگ گیا۔ لاہور جا کر اس نے ایڈمیشن لے لیا تاکہ اپنی تعلیم مکمل کر سکے۔ وہ آصف جسے شبانہ نے امجد کی خاطر چھوڑا تھا' امجد جیسے دس امیرزادوں کو خرید سکتا تھا لیکن شاید وہ شبانہ سے سچی محبت کرتا تھا اور ایسی ہی محبت کا متلاشی بھی تھا مگر شبانہ کو تو دولت سے محبت تھی۔

آصف نے میرے متعلق اس خط میں بہت کچھ لکھا تھا۔ میرے اصرار کے باوجود انہوں نے مجھے جانے نہ دیا پھر سارا کاروبار بھی میرے سپرد کر دیا۔ میں نے بھی پوری کوشش کی کہ انہیں بیٹا بن کر دکھاؤں لیکن آصف جب بھی یاد آتا' دل خون کے آنسو روتا۔

شبانہ کے متعلق پتہ چلا کہ اس نے امجد سے شادی کر لی۔ تقریباً دو سال پہلے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تو کچھ مرجھائی سی تھی۔ مجھے پہچان کر میرے پاس آ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھنے لگی۔

''آصف صاحب کا کیا حال ہے؟''

''اُن کا انتقال ہوئے عرصہ گزر گیا۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ دوسری طرف مڑ گئی مگر میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی یا شاید میری آنکھوں کو دھوکا ہوا تھا۔

•......•......•......•

مجھے اپنے آفس کے لیے ایک سیکریٹری کی ضرورت تھی۔ اخبار میں اشتہار دیا تھا اس لیے بہت سی لڑکیاں انٹرویو دینے کے لیے آئی تھیں غالباً دسویں لڑکی کا نام پکارا تھا کہ دروازہ کھلا اور میں حیران رہ گیا۔ کاغذات کی فائل پکڑے وہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی فائل اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔

''تشریف رکھیے۔''

''افتخار صاحب..... آپ؟''

''جی ہاں' کیسے تشریف لائیں؟'' میرے لہجے میں طنز تھا۔

''سروس کے لیے۔''

''کیوں؟ آپ کا شوہر تو ماشاء اللہ' خود بہت امیر آدمی ہے پھر آپ کو سروس کرنے کی ضرورت کیوں آن پڑی اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ آصف جس کی غربت کو دیکھ کر آپ نے منہ موڑ لیا تھا' وہ جو ایسی چار ملوں کا اکلوتا مالک تھا' مرنے کے بعد آپ اس کی مل میں معمولی سی ملازمہ کیوں بننا چاہتی ہیں؟''

''کیا؟'' شبانہ کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ واضح طور پر محسوس کی۔

''ہاں' میں درست کہہ رہا ہوں' آپ اس کی تصدیق بھی کر سکتی ہیں۔ سیٹھ اکرم کو جا کر کہنا کہ آپ اس کے بیٹے کی قاتل ہیں تو دیکھیے' وہ کیا کرتا ہے۔'' میں جوشِ جذبات سے اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔

''افتخار صاحب..... میرے شوہر ایک الزام میں جیل چلے گئے ہیں' اس مقدمے میں ہماری جائیداد ضبط ہوگئی اور ان حالات میں اب کوئی میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ بچوں کا مستقبل تباہ ہو رہا ہے۔ امجد تو جیل میں ہے لیکن اس بڑی جیل میں جو مصیبتیں میں اٹھا رہی ہوں' وہ بیان نہیں کر سکتی۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے سروس ضرور دیں۔''

یہ کہہ کر شبانہ ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی۔

•......•......•......•

کل مجھے سیکریٹری کے لیے منتخب ہونے والی لڑکی کو اپائنٹمنٹ لیٹر بھیجنا ہے' کیا یہ لیٹر شبانہ کے نام بھیج دوں؟ شبانہ جو میرے دوست کی قاتل بھی ہے اور محبوبہ بھی' اس کے بے رحم فیصلے نے میرے ہنستے مسکراتے دوست کو منوں مٹی تلے دبا دیا' دولت کی ہوس نے اس عورت کے دل سے محبت کی سچائی کا احساس چھین لیا اور اس کی یہی ہوس اس کے شوہر کو جیل کی سلاخوں میں لے گئی۔ کیا اس فطرت کی عورت کے لیے یہ سزا کافی نہیں ہے کہ وہ اس فرم میں ملازمت کرے جس میں اس کی حیثیت مالکہ جیسی ہونا تھی؟ وہ جب بھی فرم کا حساب کتاب کرنے بیٹھا کرے گی' ایک پچھتاوا' ایک حسرت' ایک خلش اس کے سینے میں سانپ بن کر لوٹے گی کہ اگر وہ جلد بازی نہ کرتی تو یہ کروڑوں کی جائداد اس کا نصیب بنتی مگر اب وہ صرف انہیں گننے پر ملازم ہے' ایک بڑی فرم کی ایک ادنیٰ ملازمہ۔

میں نے اس کے اپائنٹمنٹ لیٹر پر دستخط کر دیے ہیں اور مجھے یقین ہے' دوسرے فیصلوں کی طرح میرا یہ اقدام بھی بالکل مناسب ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY THURSDAY AT 8:00PM Ik Yaad Hai

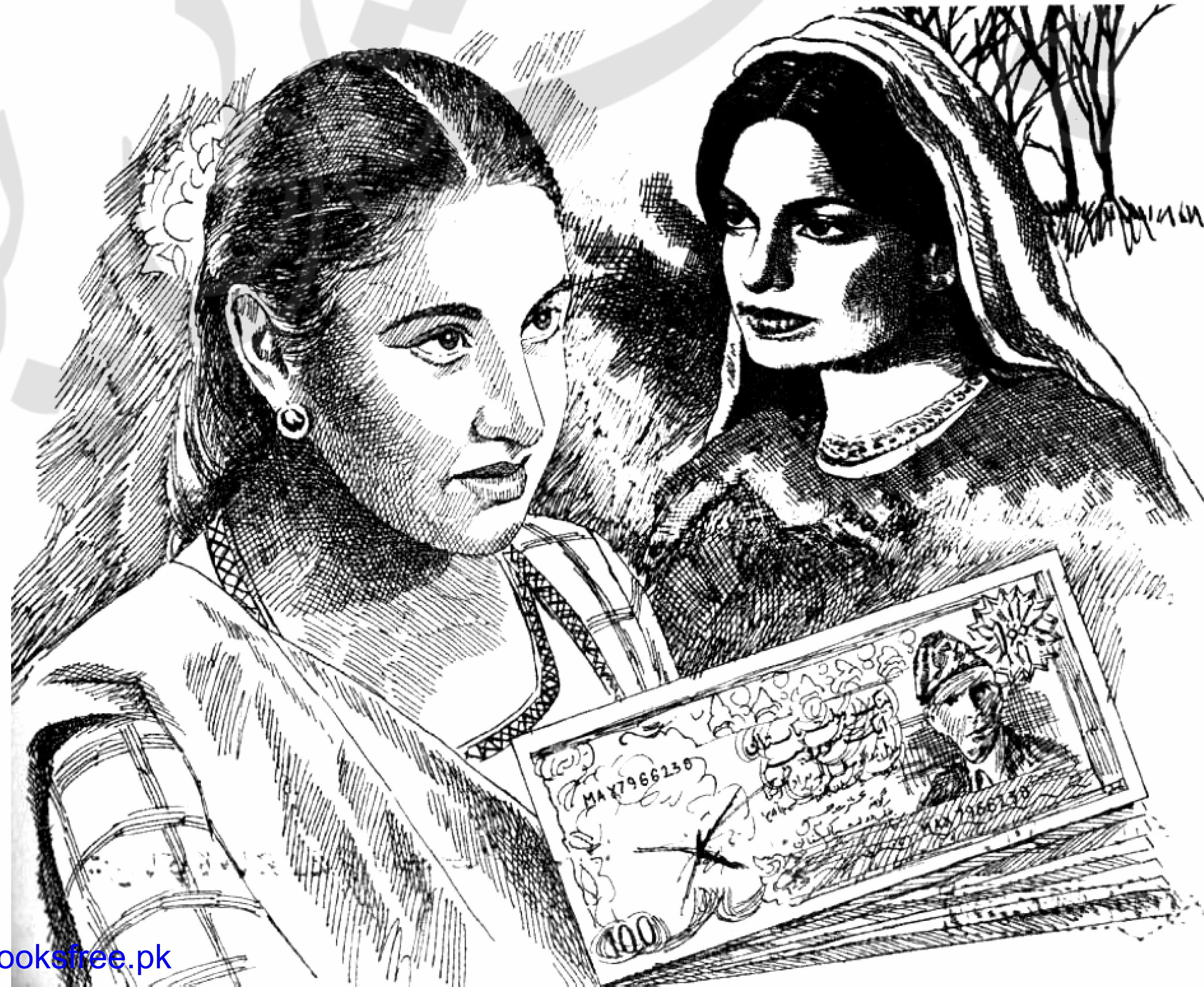
ام عادل

پرایا درد

ارتضا وارثی کا خیال

جو رہتے ہیں کچے گھروں میں ننگے تن اور بھوکے پیٹ
ان کو حقارت سے مت دیکھو سوچو یہ انسان تو ہیں

غربت وامارت کے درمیان بنے عجیب رشتے سے پھوٹتی ایک پُراثر کہانی



انسان کو ربِ کائنات نے کتنی اَن گنت' بن مول نعمتوں سے نوازا ہے جن کا شمار مشکل ہے۔ انسان جب تک ان نعمتوں سے مستفید ہوتا رہتا ہے' وہ ان کی اہمیت سے بے خبر رہتا ہے۔ خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ہوں یا بڑی سے بڑی لیکن جب کسی بھی وجہ سے ان نعمتوں میں سے کوئی ایک بھی چھن جائے یا کسی نعمت میں تعطل آ جائے تو انسان نہایت بے قرار و بے چین ہو جاتا ہے۔ اس لمحے اسے احساس ہوتا ہے کہ جس نعمت کو میں نے کبھی نعمت گردانا ہی نہ تھا' وہ میری زندگی کے لیے کتنی اہم اور ضروری تھی۔

آج سے تقریباً چار ماہ پہلے میں بھی اپنی زندگی کی تمام تر نعمتوں کے ساتھ روزمرہ کے فرائض میں مشغول و مصروف تھی' اپنے کاموں اور وقت کی تقسیم کچھ اس طرح کر رکھی تھی کہ دو دو جاب کے ہمراہ گھر کے تمام امور اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھی' کبھی کسی مددگار یا ماسی وغیرہ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی مگر اچانک ایک حادثے کی وجہ سے میری ریڑھ کی ہڈی کچھ اتنی متاثر ہوگئی کہ میری دوڑتی بھاگتی' مصروف زندگی ایک دم تھم گئی اور میں بستر سے جا لگی۔ اب مجھے اپنے چھوٹے بڑے کام کے لیے کسی دوسرے فرد کی مدد کی ضرورت تھی' بیٹی خداوند کریم نے مجھے دی نہیں' بیٹے کو زندگی میں کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا مگر اس نے اس کم عمری میں بھی جس بلند ہمتی اور جی جان سے حقِ فرزندگی ادا کیا' خدا سب کو ایسی خدمت گزار اولاد سے نوازے۔ جس بچے کو ماں کی صحت یابی میں کچن میں کبھی جھانکنے کی ضرورت بھی نہ پڑی تھی' اس مشکل وقت میں اسے کچن بھی سنبھالنا پڑا' گھر کی صفائی بھی کرنی پڑی' کپڑے بھی دھونے پڑے مگر یہ سب اس کے کام تو نہ تھے' ان کاموں کے لیے ماسی کی تلاش جاری تھی لیکن ماسی کا ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا جا رہا تھا' سب ملنے والوں' خیریت دریافت کرنے آنے والوں کو ماسی کا کہہ رکھا تھا۔

ایک ماہ کے بعد کسی ملنے والی نے ایک ماسی بھیجی تھی' اسے دیکھ کر مجھے الٹا اس پر ترس آیا تھا۔ بے چاری ماں بننے کے آخری دور سے گزر رہی تھی۔ میں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کیا تم اس حالت میں کام کرو گی؟''

کہنے لگی۔ ''جی باجی...... ! مجبوری ہے ورنہ اس حالت میں کس عورت کا دل نہیں چاہتا کہ وہ آرام کرے مگر شوہر بے روزگار ہے' بچہ کی پیدائش کے وقت رقم کی ضرورت ہوگی۔ میرے پاس ایک ڈیڑھ مہینے کا ٹائم ہے' اتنے میں کسی اور ماسی کا انتظام کر لیجیے گا۔'' واقعی مجبوری تھی' کوئی اور وقت ہوتا تو میرا دل ہرگز اسے کام پر رکھنے کو گوارہ نہ کرتا بلکہ میں اسے آرام کا مشورہ دیتی۔ خیر' دونوں طرف کی مجبوری کی وجہ سے اس نے کام شروع کر دیا تھا۔

•......•......•......•

وقت کا کام گزرنا ہے' سو گزر گیا۔ ایک مہینہ پورا ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے اور میں فکرمند تھی کہ ماسی کے جانے کے بعد کیا ہوگا کیونکہ ابھی اس کی جگہ کسی متبادل ماسی کا انتظام نہیں ہو سکا تھا مگر کہتے ہیں نا کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ اچانک میری ایک بہت اچھی ملنے والی کو میرے بارے میں معلوم ہوا تھا تو وہ اپنی کزن کے ہمراہ میری خیریت معلوم کرنے آئی تھی جس کی میں اکثر اس کے مشکل وقت میں مدد کیا کرتی تھی۔ باتوں باتوں میں' میں نے اس سے ماسی کا ذکر کیا تھا تو وہ بولی تھی۔

''باجی......! آپ بالکل فکر نہ کریں' میرے بچے چھوٹے ہیں اور ان کے اسکول کا بھی مسئلہ ہے ورنہ میں خود آپ کے کام کرنے آ جاتی مگر میری یہ کزن جس کی کم عمری میں شادی ہوگئی' اس کی آٹھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشرقی روایات

ہماری روزمرہ زندگی میں اکثر و بیشتر ''مشرقی روایات'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ عموماً اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ مشرقی روایات کو برقرار رکھنا اور ان کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے لیکن آج تک ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مشرقی روایات کسے کہتے ہیں؟ ہمیں آج تک پتا نہیں لگ سکا کہ مشرقی روایات کس چڑیا کا نام ہے۔ خدا بخشے ایک زمانے میں ہمارے ہاں برقعوں کا چلن عام تھا۔ ہماری بہو بیٹیاں بغیر برقعے کے گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ ہماری بہو بیٹیوں نے برقعے سے نجات ہی حاصل کر لی اور طرح طرح کے دوپٹے حاصل کر لئے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ لباس کا مشرقی روایات سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے باوجود پتا نہیں کیوں بعض دقیانوسی لوگ گاہے بہ گاہے مشرقی روایات کا نعرہ بلند کر کے ہماری مستورات کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔

لڑکیاں ہیں، تین کی شادی کم عمری میں کر چکی ہے، سب سے چھوٹی بیٹی آٹھ سال کی ہے، یہ آپ کے گھر میں کام کرے گی۔''

میں نے کہا۔ ''اس سے پوچھ تو لو۔'' کہنے لگی۔ ''گھر سے میرے ساتھ چلتے وقت ہی اُس نے کہہ دیا تھا۔ ''اگر کوئی کام کرنے والی نہ ہوئی تو میں کام کروں گی۔'' اس کا شوہر بوڑھا اور مریض ہے، دس افراد کے گھر میں صرف 5,000 کی کمائی آتی ہے جس سے دو وقت کی روٹی پوری کرنا بھی سخت مشکل ہے اس لیے یہ بھی کام کرنا چاہتی ہے، آپ اپنے علاوہ اپنے جاننے والوں کے ایک دو اچھے گھروں میں اس کو کام دلوا دیجیے گا تاکہ اسے کچھ رقم ملنے لگے۔''

میں نے فوراً ہی خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس نے بیٹھے بٹھائے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میرے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر میری محلے دار دو بہنیں نگہت اور نازیہ ایک ہی گھر میں بیاہی ہوئی تھیں اور دو منزلہ گھر میں اوپر نیچے رہتی تھیں اور میری تقریباً روزانہ ہی فون پر بات ہوتی تھی۔ اگلے دن میری خیریت معلوم کرنے کے لیے نگہت کا فون آیا تھا تو میں نے ماسی سے متعلق بات کی تھی۔ اس نے فوراً کہا تھا۔

''ہماری کام والی جا چکی ہے، اب پہلی کو اسے ضرور بھیج دیں۔'' یوں میری نئی کام والی پروین کے لیے دو مزید گھروں میں کام کا انتظام ہو گیا تھا۔

پروین نہایت محنت، توجہ اور پھرتی سے صاف ستھرا کام کرتی تھی لہٰذا نازیہ اور نگہت دونوں بہنوں کو بھی اس کا کام پسند آیا تھا۔ دونوں بہنوں میں نگہت ذرا نک چڑھی اور مغرور ہے جبکہ نازیہ انسان دوست اور نرم خو ہے۔

پروین کے کام شروع کرنے کے کوئی پندرہ دن بعد نازیہ کو کسی کام سے لاہور جانا پڑا تھا جبکہ نگہت گھر پر ہی تھی۔ ایک دن پروین مجھ سے بولی تھی۔

''باجی! کئی دن سے میری چھوٹی بیٹی بیمار ہے، گھر کے نزدیکی ڈاکٹر کی دوا سے افاقہ نہیں ہو رہا، میں کل صبح جلدی کام پر آؤں گی تاکہ دونوں گھروں سے دس، ساڑھے دس بجے تک فارغ ہو کر اسے سرکاری ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جا سکوں۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں، تم صبح آٹھ بجے میرے گھر آ سکتی ہو۔''

دوسرے دن پروین آٹھ بجے میرے پاس آئی اور تقریباً 9 بجے فارغ ہو کر نگہت کے گھر پہنچ گئی۔ نگہت اُس وقت بچوں کو اسکول بھیج کر لیٹی ہوئی تھی۔ پروین کو صبح نو بجے اپنے گھر دیکھ کر بھڑک اٹھی۔

''اتنی صبح کیوں آئی ہو؟ میں ابھی سو رہی ہوں، واپس جاؤ پھر آ جانا۔''

پروین کا گھر ہمارے محلے سے خاصا دور ہے مگر غربت کی وجہ سے پروین بے چاری سخت گرمی اور دھوپ میں پیدل ہی آئی۔ پروین نے ایک روز قبل نگہت کو بھی اپنی بیٹی کی بیماری اور اسے ہسپتال لے جانے سے متعلق بتایا تھا مگر نگہت کو کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ نگہت کے شوہر نے جو اُس وقت گھر پر ہی تھے، مداخلت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تمہیں پتہ بھی ہے، یہ بے چاری غریب اتنی دور سے پیدل آتی ہے، اتنی گرمی میں دوبارہ کیسے آئے گی؟ خیر ہے ماسی، تم کام کر لو، ہم ناشتہ بعد میں کر لیں گے۔'' نگہت کے شوہر نے اسے کام کرنے کی اجازت دے دی تو شوہر کی مداخلت پر اسے خاموش ہونا پڑا تھا لیکن اس نے جل کر اسے پہلے سیڑھیاں اور صحن دھونے کا حکم دیا تھا اور خود شوہر کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔

پروین بالٹی پانی سے بھر کر سیڑھیاں دھونے اوپر چڑھی تھی۔ جیسے ہی اس نے پہلی سیڑھی پر پانی ڈالا تھا، خدا جانے، اسے چکر آیا تھا یا پاؤں پھسلا، وہ کروٹ کے بل اوپری والی سیڑھی سے پھسلتی ہوئی نیچے آئی اور پھسلنے کا عمل تب رکا جب اس کے دونوں پاؤں پانی والی موٹر سے ٹکرائے جو صحن میں لگی ہوئی تھی۔

پروین کو ٹانگ اور پسلی پر سخت چوٹ آئی تھی۔ وہ بمشکل اٹھ پائی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے، خوف اور تکلیف کے مارے وہ پسینے سے شرابور تھی، وہ اٹھ کر لنگڑاتی ہوئی کچن میں جا کر پنکھے کے نیچے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے حواس ابھی تک مکمل بحال نہیں ہوئے تھے۔ نگہت کا شوہر باتھ روم میں تھا۔ اس نے پروین کو پنکھے کے نیچے بیٹھے دیکھا تھا تو بولی تھی۔

''کیا بات ہے، اتنی جلدی صحن اور سیڑھیاں دھو

کتنی چپ ہے ماں

تُو کہاں ہے؟
تجھے کہاں آواز دوں
کس دیس، کس دھرتی
کس امبر پہ
ڈیرے لگائے ہیں
بن تیرے
کتنے سُونے ہیں یہ دن
جانتی ہے
کتنا تجھے یاد کیا
کتنی راتیں جاگیں
کتنا دل برباد کیا
مگر
تُو اک بار بھی نہ پلٹی
خوابوں میں روز ملتی ہے
گلے لگاتی ہے اور
کہیں چھپ جاتی ہے
جب بیدار ہوتی ہوں تو
سارا منظر ہی بدل جاتا ہے
نگاہیں تیری متلاشی رہتی ہیں
اپنی بھیگی آنکھیں
سب سے چھپائے پھرتی ہوں
بوکھلائی، بوکھلائی سی رہتی ہوں
تیری نرم، گرم گود کو ترسی ہوئی
بتا، نا!
کس پتے پہ تجھے خط لکھوں
کس دیس تجھے چٹھی بھیجوں
بتانا، ماں بتانا!

زوبیہ شاذ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ ئی ہو؟''

پروین نے اسے بڑی مشکل سے بتایا تھا کہ میں اوپر والی سیڑھی سے گر گئی ہوں۔

نگہت اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا سن کر بجائے ہمدردی کرنے اور بروقت کوئی طبی امداد دینے کے زور زور سے ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''حیرت ہے تو پہلی سیڑھی سے گری اور بچ گئی' نہ تیرا سر پھٹا نہ ٹانگ یا باز وٹوٹا' چل تیری قسمت اچھی ہے ورنہ میری بہن نازیہ ایک بار اسی سیڑھی سے گری تھی جو تین ماہ تک پلنگ سے اٹھ نہیں سکی تھی۔ خیر تو شکر کر' تیرے ساتھ ایسا نہیں ہوا ورنہ تو' تو بھوکی مرجاتی۔ خیر'اب تو صفائی کیے بغیر نہ چلی جانا۔''

پروین' نگہت کی ہدایت کے مطابق بڑی مشکل سے کام ختم کر کے گرتے پڑتے نہ جانے کس طرح اپنے گھر پہنچی تھی۔ اس کی پسلی اور ٹانگ میں شدید درد تھا۔ وہ بیٹی کو بھی ہسپتال نہ لے جا سکی تھی اور دوسرے دن میرے گھر پہ کام کے لیے بھی نہیں آئی تھی۔ اس کے نہ آنے سے میرے گھر کے سب کام رک گئے تھے۔ ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق مجھے ریگولر ادویات کے ساتھ چھ ماہ تک مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی کیونکہ یہ ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ تھا' اسی لیے میرے جیسی فعال بندی کے لیے جو صرف چھ گھنٹے آرام اور اٹھارہ گھنٹے کام میں مصروف رہتی تھی' بستر پر چھ ماہ لیٹنا خاصہ صبر آزما مرحلہ تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

اگلے دو دن بھی پروین کام پر نہ آ سکی' میرا وہم بار بار اس کی بچی کی بیماری کی طرف جاتا رہا۔ میرے پاس پروین کا کوئی رابطہ نمبر نہیں تھا اور نہ آنے کی وجہ معلوم ہو سکی تھی۔ تیسرے دن پروین لنگڑاتی ہوئی آئی تھی۔ وہ چہرے سے کافی بیمار اور نڈھال لگ رہی تھی اور ہائے کہتے ہوئے مشکل سے بیٹھ گئی تھی۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' اس کی حالت دیکھ کر میں نے بے اختیار پوچھا تھا اور پھر پروین نے تین روز قبل اپنے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے اور نگہت کے رویئے کے بارے میں بتایا تھا جو میں اوپر بیان کر چکی ہوں۔ مجھے وہ تمام روداد سن کر سخت افسوس ہوا تھا۔ نگہت نے اتنے کٹھورپن کا مظاہرہ کرتے وقت ایک پل کے لیے بھی نہ سوچا تھا کہ اپنی آٹھ بیٹیوں کو دو وقت کی روٹی فراہم کرنے والی ماں کو کچھ ہو جاتا تو...... اسے خدا نے شاید اُن بچیوں کی خاطر کسی خطرناک حادثے سے بچا لیا تھا جو ماں کی معذوری یا خدانخواستہ موت کے بعد زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لیے بے آسرا ہو جاتیں۔ نگہت کی اپنی بہن جب سیڑھیوں سے گری تھی تو اس امیرزادی کو تین ماہ آرام اور علاج معالجے کی ضرورت تھی مگر جب ایک غریب ماں گری تو نگہت بجائے اس کی تیمارداری کرنے کے...... اس سے پوچھ رہی تھی...... ''تو بچ کیسے گئی؟'' جبکہ اس حادثے میں پروین کی دو پسلیاں فریکچر ہو گئی تھیں' کولہے پر بھی سخت چوٹ آئی تھی۔ میں نے گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر اسے پلایا' کچھ رقم دی اور گھر آرام کرنے بھجوا دیا۔ اس کے جانے کے بعد کئی روز تک میرا ذہن منتشر رہا تھا اور یہ سوال بھی ذہن میں گردش کرتا رہا تھا کہ آخر لوگ کام کرنے والی ماسیوں کو اپنے جیسا گوشت پوست کا انسان کیوں نہیں سمجھتے؟ چوٹ تو ہر انسان کو ایک جیسی لگتی ہے' درد تو سب کا مشترک ہوتا ہے تو پھر بہت سے امیر لوگ' غریب کا درد کیوں محسوس نہیں کرتے؟ انہیں اپنے جیسا انسان کیوں نہیں سمجھتے' آخر کیوں؟





جویریہ سلیم

ہمارا پرچم

قابل اجمیری کا خیال

ہم موت کی حدوں میں بھی نغمہ سرا رہے
غم کو دلیلِ عظمت انساں کیے ہوئے

اگر آپ کے ساتھ بھی ایسی صورت حال پیش آ جائے تو آپ کیا کریں گے؟



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

26 مارچ 1971ء کی صبح تھی۔ مشرق افق لہو کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ سورج ابھی خون کا یہ دریا عبور نہیں کر پایا تھا لیکن اس کی روپہلی کرنوں کی پیش قدمی جاری تھی اور آہستہ آہستہ شفق کی سرخی سپیدی میں ڈھلتی جا رہی تھی اور سورج کی ہیبت سے افق کا رنگ بھی پھیکا پڑنے لگا تھا۔

کھلنا شہر کے بیشتر شہری خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو صبح کی میٹھی نیند کو تیاگ کر معبودِ حقیقی کے آگے سربسجود تھے۔ ان ہی لوگوں میں زرینہ بیگم بھی تھیں۔ فجر کی نماز کے بعد وہ مصلّے پر بیٹھی شاید کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے اب کیا ہو اسی لیے وہ ہر نماز کے بعد خدا سے جان و مال، عزت و آبرو کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ اچانک انہیں باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ فضا میں عجیب سی ہلچل کا احساس ہوا۔ انھوں نے جلدی جلدی دعا مانگی اور لپک کر شوہر کو سوتے میں جھنجوڑ ڈالا۔

''سنیے، جلدی اٹھیے، دیکھیے، باہر کچھ گڑ بڑ ہے۔''

صفی اللہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کھونٹی پر سے قمیص اتاری اور پہنتے ہوئے باہر کی طرف بھاگے۔ زرینہ بیگم فوراً شہناز کے کمرے کی طرف لپکیں۔ ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا تو انہیں سب سے پہلے جوان بیٹی کا خیال آتا۔ وہ وقت ہی ایسا تھا، نہ کسی کی جان محفوظ تھی اور نہ عزت۔ بیٹی کے کمرے میں دیکھا تو وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ سب کچھ بھول کر مسکرا اٹھیں۔ ''چلو کسی بہانے ہی سہی، نوجوانوں کو بھی اب خدا یاد آتا ہے۔'' انہوں نے اسے کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا اور باہر آ کر شوہر کا انتظار کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد صفی اللہ گھر میں داخل ہوئے۔

''کیا بات ہے؟'' زرینہ بیگم نے فوراً پوچھا تھا

''کرفیو لگا دیا گیا ہے۔''

''کرفیو، وہ کیوں؟''

''معلوم نہیں، آٹھ بجے کی خبروں سے شاید کچھ پتہ چلے۔''

زرینہ بیگم نے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا، ایک جیپ پر فوج کے جوان مستعد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک فوجی ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو گھروں میں جانے کی تلقین کر رہا تھا۔

لمبے تڑنگے سرخ و سپید اور مستعد وطن کے یہ سپاہی کتنے سجیلے لگ رہے ہیں۔ زرینہ نے سوچا اور نظروں ہی نظروں میں ان کی نہ جانے کتنی بلائیں لے ڈالیں۔

آٹھ بجے خبروں میں بتایا گیا کہ شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ عوامی لیگ پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور فوج نے سارا نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ اس خبر سے انہیں جس قدر خوشی ہوئی، وہ بیان سے باہر تھی۔ صفی اللہ کے گھر کے ہر فرد کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ نہ صرف ان کے گھر میں بلکہ مشرقی پاکستان کے تمام محبّ وطن پاکستانیوں کے گھروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''خدا کا شکر ہے، اس نے پاکستان کو بچا لیا۔''

سب کی زبان پر یہی جملہ تھا۔ زرینہ اور شہناز نے فوراً شکرانے کے نفل پڑھے۔ انہیں جس قدر خوشی تھی۔ شاید کسی کو نہ ہو اور کیوں نہ ہو؟ اس ملک کی بنیادوں میں ان کے خاندان کا لہو شامل تھا۔ آج بھی زرینہ کو وہ منظر یاد تھا جب اس کے سامنے اس کے والدین کو ہندوؤں نے برچھیاں مار کر شہید کر دیا تھا اور اس کی چھوٹی بہن نگینہ کو جو اس وقت صرف دس سال کی تھی، زندہ آگ میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان لمحات کو یاد کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ حقیقت تھی کہ والدین اور بہن کی شہادت کا ماتم انھوں نے نہ اس وقت کیا تھا اور نہ ہی آج اس کا غم کر رہی تھیں کیونکہ انہوں نے ایک مقصد کے لیے جان دی تھی اور وہ مقصد حاصل کر لیا گیا تھا۔ زرینہ بیگم نے بڑی ثابت قدمی سے ہر غم سہا تھا صرف قائد اعظم کے پاکستان کی خاطر۔

دس بجے اعلان ہوا کہ گھروں پر سے بنگلہ دیشی اور سیاہ جھنڈیاں اتار کر پاکستانی پرچم لہرائے جائیں۔ زرینہ بیگم نے فوراً سبز ہلالی پرچم نکالا جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سیا تھا۔ آہ، اس سال ۲۳ مارچ کو بھی وہ لوگ یہ پرچم اپنے گھر پر نہ لہرا سکے تھے۔ اس کے بجائے یوم پاکستان کے موقع پر انہیں بنگلہ دیشی جھنڈا اور سیاہ جھنڈی دل پر پتھر رکھ کر لگانا پڑی تھی کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو عوامی لیگ کے غنڈے ان کا گھر جلا دیتے۔ اس روز شدت غم سے ان کے دل پھٹ گئے تھے لیکن تین روز بعد خدا نے یہ دن دکھایا کہ پاکستانی پرچم آب و تاب سے لہرا رہا تھا۔ زرینہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑی دیر تک بے خودی کے عالم میں قومی پرچم کو لہراتا ہوا دیکھتی رہیں پھر ان کے ہاتھ خود بخود دعا کے لیے بلند ہو گئے۔

''خدایا! اس پرچم کو تا ابد یوں ہی سرفراز رکھ۔''

''آمین!'' پیچھے سے آواز آئی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا، صفی اللہ کھڑے مسکرا رہے تھے۔

مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور کچھ بے اطمینانی میں مبتلا ہو گئے۔ بظاہر حالات دن بہ دن سدھرتے جا رہے تھے لیکن اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ دلوں میں نفاق کے جو بیج بوئے گئے تھے، انہوں نے تناور درخت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اپنوں کے درمیان ہونے والی اس کشمکش سے غیروں نے فائدہ اٹھایا اور عرصے سے پاکستان کو تباہ کرنے کی تاک میں رہنے والا دشمن موقع ملتے ہی وار کر بیٹھا۔ نو مہینے بھارت ماتا کے پیٹ میں رہنے کے بعد بنگلہ دیش نے جنم لیا اور ایک مرتبہ پھر وہی شر انگیز نعرہ سنائی دیا۔

''جے بنگلہ''

''اف اللہ!'' زرینہ بیگم نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ انہوں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا مگر وہ تو دور خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔ شاید وہ تحریکِ پاکستان کے روز و شب یاد کر رہے تھے جب وہ جوان تھے اور جوانی کی تمام تر صلاحیتیں انہوں نے تحریکِ پاکستان کے لیے وقف کر دی تھیں۔ یا اپنی ان دھواں دار تقریروں کو یاد کر رہے تھے جو انہوں نے بٹ کے رہے گا ہندوستان، لے کے رہیں پاکستان...... کے فلک شگاف نعروں کے درمیان کی تھیں یا پھر انہیں چاول کے وہ ڈھیر نظر آ رہے تھے جو انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے گھر گھر اور گاؤں گاؤں جا کر جمع کیے تھے اور مسلمان عورتوں نے پردوں کے پیچھے سے انہیں مٹھی مٹھی کر کے منوں چاول دیے تھے جنہیں بیچ کر ان لوگوں نے مسلم لیگ کے لیے فنڈ اکٹھا کیا تھا اور ان سب سے بڑھ کر شاید انہیں شعلوں میں لپٹا ہوا اپنا گھر یاد آ رہا تھا جس میں ان کے باپ دادا کی زندگی بھر کی جمع پونجی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ شعلوں کے سرد ہونے کے بعد جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تھے، انہیں چاروں طرف راکھ ہی راکھ نظر آئی تھی لیکن اتنے بڑے نقصان کا انہیں ذرا بھی افسوس نہیں ہوا تھا۔ ایک نئے عزم کے ساتھ انہوں نے آبائی وطن کو خیر باد کہا تھا۔ زرینہ کو ساتھ لیا تھا اور پاکستان جانے والے قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔

☆......☆

لیکن آج...... انہیں بڑا قلق ہو رہا تھا۔ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نقصان انہیں آج یاد آ رہے تھے۔ انھوں نے قریب ہی بیٹھی ہوئی شہناز کو اپنے قریب کرلیا جو ان کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ابو......! اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا بیٹی......! خدا پر بھروسہ رکھو۔ ہمارے محافظ ہتھیار پھینک کر دشمن کی پناہ میں چلے گئے تو کیا ہوا؟ خدا کا سہارا تو ہے۔ اب اس کے سوا ہمارا کوئی مددگار نہیں۔'' انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو چھلک پڑنے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''زرینہ!'' صفی اللہ بولے۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ وقت زخموں کا مرہم ہے لیکن آج چوبیس برس کے بعد میرے زخم کیوں رس رہے ہیں۔ مجھے تو اپنے گھر کے جلنے کا اس روز بھی غم نہیں ہوا تھا جس روز وہ جلا تھا پر آج مجھے اپنا نقصان کیوں یاد آ رہا ہے، بتاؤ زرینہ! میری پشتوں کی کمائی کیوں مٹی تھی؟ تمہارے والدین کیوں کٹ مرے تھے؟ نگینہ کو زندہ آگ میں کیوں ڈالا گیا تھا۔ کیا آج ہی کے دن کے لیے؟''

لیکن زرینہ کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ تو خود مجسم سوال بنی ہوئی تھی۔ آنسو بہہ بہہ کر اس کا چہرہ تر کر رہے تھے۔ شہناز سہمی سہمی سی باپ کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی اور صفی اللہ کی نظریں دور نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

☆......☆

پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالتے ہی غیر بنگالیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ بہاری ایک گالی بن گئے۔ وطن سے وفاداری کی انہیں ایسی بھیانک سزا ملی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے لیے زمین تنگ کر دی گئی تھی، چہار سو رقص ابلیس جاری تھا۔ ان د... زندگی گراں ہوگئی تھی اور موت کتنی ارزاں......

...موج بلا نے صفی اللہ کے گھر کا بھی رخ کیا لیکن جہاں ظلم و نفرت کے سوداگر تھے، وہاں نیکی اور شرافت کے پجاری بھی موجود تھے۔ صفی اللہ کے بنگالی ہمسائے فضل حسین نے ہمسائیگی کا حق ادا کر دیا۔ صفی اللہ اور ان کے کنبے کے لیے تو وہ نیکی کا فرشتہ ثابت ہوا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے گھر لے آیا۔ شرپسندوں نے ان کے گھر کو بھی گھیرا اور انہیں دھمکایا کہ بہاری کو بچانے کی سزا تمہیں بھی دی جائے گی لیکن فضل حسین سینہ تان کر کھڑا ہوگیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا۔

''پہلے میری جان جائے گی پھر صفی اللہ کو کچھ ہوگا۔'' وہ محلے کا ایک باعزت شخص تھا، یہ اس کی مقناطیسی شخصیت ہی تھی جس کی وجہ سے غنڈے اس کے خلاف کچھ نہ کر سکے۔

☆......☆

مشرقی پاکستان کے تمام شہروں میں کھلنا سب سے پہلے نارمل ہوگیا تھا۔ چار روز تک صفی اللہ کا خاندان فضل حسین کے گھر کے ایک کمرے میں بند رہنے کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا تھا۔ مہینے بھر کے بعد حالات معمول پر آ گئے تھے۔ قتل و غارت کا بازار فی الحال سرد پڑ چکا تھا لیکن اکا دکا وارداتیں اب بھی ہوتی تھیں۔ اکثر مکتی باہنی والے غیر بنگالیوں کے گھروں میں گھس کر تلاشی لیتے اور اگر کسی کے گھر سے کوئی ہتھیار، پاکستان پرچم یا خاکی کپڑا برآمد ہو جاتا تو اس کے مکینوں کی شامت آ جاتی۔ خاکی کپڑے کی اگر تھیلی بھی نکلتی تو وہ یہی کہتے کہ اس گھر کا کوئی فرد رضاکاروں میں شامل تھا جس کی وردی کاٹ کر اب تھیلی بنا دی گئی ہے۔

صفی اللہ کے گھر میں تو کوئی ایسی چیز نہیں تھی البتہ وہ پاکستانی پرچم ضرور تھا جسے زرینہ بیگم نے بڑے چاؤ سے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ صفی اللہ اکثر بیوی سے کہتا تھا کہ اسے کاٹ کر پھینک دو یا ...ا ہی دیں نہ جانے کون سی گھڑی مکتی باہنی والے ...لاشی لینے آ جائیں لیکن زرینہ بیگم یہی کہتیں۔

''کس دل سے اسے پھاڑوں؟ مجھ سے تو یہ کبھی ...ہوگا۔'' صفی اللہ بھی کہنے کو تو کہہ دیتے لیکن دل ان ...کا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس جھنڈے کو پھاڑ دیں یا جلا ...یں۔ ہمیشہ یہی سوچ کر چپ ہو جاتے کہ جب ...قت آئے گا، تب دیکھا جائے گا اور آخر وہ وقت ...ہی گیا جسے یہ لوگ نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اپریل 1972ء کی ایک گرم دوپہر تھی۔ مون سون کی بارشیں شروع ہو چکی تھیں اور اس روز صبح سے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ صفی اللہ نے دروازہ کھولا تو فضل حسین کھڑا تھا جس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

''خیریت؟'' صفی اللہ نے پوچھا۔

''مکتی باہنی والا سب بہاری لوگ کا تلاشی لیتا ہے۔ تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے نا؟'' فضل حسین نے سرگوشی کی۔

''میرے پاس، نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' صفی اللہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔ ''ہاں، صرف ایک پاکستانی جھنڈا ہے۔''

''ارے یار، کا گجب کرتا۔ جولدی اوس کو ٹھکانے لگاؤ۔''

''سنیے، میں اسے لا دیتا ہوں۔ آپ اپنے گھر لیتے جائیں۔ وہ لوگ آپ کے گھر کی تلاشی تو نہیں لیں گے۔''

''ہام ابھی کیسے لے جائے؟ باہر وہ لوگ کھڑا ہے۔ دیکھ لے گا تو ہام کو بھی نہیں چھوڑے گا۔''

''ابھی وہ لوگ کہاں ہیں؟'' صفی اللہ نے مضطرب انداز میں پوچھا۔

''کچھ باہیر کھڑا ہے اور کچھ تمہارا اباجو والا گھر کا تلاشی لیتا ہے۔ اب تمہارا نمبر ہے۔ تم جالدی کچھ کرو۔''

صفی اللہ بھاگتے ہوئے اندر آئے اور سیدھے اس الماری کی طرف لپکے جس میں پرچم رکھا ہوا تھا، وہ کپڑے اٹھا اٹھا کر اسے تلاش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ بڑبڑاتے بھی جا رہے تھے۔

''ہزار دفعہ کہا کہ اس جھنڈے کو جلا دینا یا پھاڑ کے پھینک دینا لیکن تم ہو کہ اب تک رکھے ہوئے ہو۔''

''آخر بات کیا ہوئی؟'' زرینہ شاید ابھی تک معاملے کو سمجھ نہ پائی تھی۔

''بات کیا ہوگی؟ گھر کی تلاشی لینے کے لیے مکتی باہنی والے آ رہے ہیں۔'' اسی وقت انہیں پرچم مل گیا جسے وہ لے کر باورچی خانے کی جانب لپکے۔ زرینہ بھی تیزی سے ان کے پیچھے لپکیں۔ شہناز باورچی خانے ہی میں تھی۔ لکڑی سے جلنے والا بڑا سا چولہا قریب ہی دہک رہا تھا۔ صفی اللہ نے چاہا کہ پرچم کو چولہے میں ڈال دیں لیکن ''نہیں......'' کی چیخ کے ساتھ زرینہ بیگم آڑے آ گئیں اور پرچم ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔

''پاگل نہ بنو زرینہ......! وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ اگر انہوں نے اسے دیکھ لیا تو ہمارا گھر سلامت نہیں رہے گا۔'' صفی اللہ بے تابی سے پرچم لینے کے لیے بڑھے۔

''نہیں، خدا کے لیے، اسے مت جلایئے۔'' زرینہ گڑگڑائی۔ ''اس جھنڈے کی خاطر تو ابا نے امی اور نگینہ کو قربان کر دیا تھا اور پھر خود بھی جان دے دی تھی۔''

''اور آج اسی کے لیے تم شوہر کی زندگی اور بیٹی کی عزت بھی قربان کر دو گی، کیوں؟'' صفی اللہ تیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں بولے۔ ”کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟“

”جو بھی ہو‘ میں جیتے جی ایسا نہیں کرسکتی۔“ اس کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

”امی......! کیا ہوگیا ہے آپ کو؟“ شہناز رو دی۔ ”خدا کے لیے‘ امی......!“ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

”زرینہ......! زرینہ......!!“ صفی اللہ ہیجان خیز لہجے میں چیخے۔ ”کیا تمہیں ہماری زندگیاں عزیز نہیں؟“

”ہاں‘ ہیں......لیکن یہ پرچم بھی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔“ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ صفی اللہ دروازے کی جانب بڑھے لیکن بار بار مڑ کر دیکھتے جاتے تھے کہ شاید اب بھی زرینہ بیگم پرچم کو آگ میں ڈال دے کیونکہ چھپانے کا تو وقت ہی نہیں تھا لیکن زرینہ اسے لیے ہوئے کمرے میں بھاگیں۔ شہناز ان کے پیچھے تھی۔ صفی اللہ بوجھل قدموں سے دروازہ کھولنے کے لیے بڑھ گئے تھے۔

کمرے میں پہنچتے ہی زرینہ بیگم کی نظر طاق پر رکھے ہوئے قرآن پاک کے نسخے پر پڑی۔ انہوں نے جھٹ اسے اتارا اور اس پر پرچم اس طرح لپیٹ دیا کہ چاند ستارہ اندر چھپ گئے اور اوپر سے صرف سبز کپڑا نظر آرہا تھا۔ پرچم کو لپیٹنے کے بعد انہوں نے جلدی سے قرآن کو طاق پر رکھ دیا۔ یہ سب پلک جھپکتے میں ہوا تھا اور فوراً ہی مکتی باہنی والے اندر گھستے چلے آئے تھے۔ انہوں نے سارا گھر الٹ پلٹ ڈالا‘ الماری‘ نعمت خانہ‘ ہانڈی‘ پتیلی حتیٰ کہ آنگن میں رکھے ہوئے مرغی کے ڈربے کو بھی نہ چھوڑا۔ دو کمرے میں موجود تھے اور باقی سارے گھر میں پھیل کر ایک ایک چیز دیکھ رہے تھے۔ اچانک کمرے میں موجود ایک کی نظر طاق پر رکھے ہوئے قرآن پاک پر پڑی۔

”اوٹا کی؟“ (وہ کیا ہے؟) اس نے پوچھا۔

”وہ قرآن مجید ہے۔“ صفی اللہ نے کہا

”امی دیکھبو۔“ (میں دیکھوں گا۔) کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔

”ٹھہرو بھیا۔“ زرینہ بیگم نے اس کی منت کی۔ ”تم شاید پاک صاف نہیں ہوگے‘ میں اتارتی ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے قرآن پاک اتار لیا اور اسے تھام کر کھڑی ہوگئیں۔

’ہام کو دو۔“ اس نے ہاتھ بڑھائے۔

”دیکھو‘ یہ خدا کا کلام ہے اور تت......تمہارے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔“ زرینہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولیں۔

”دو......“ وہ دھاڑا اور زرینہ بیگم سر سے پاؤں تک لرز گئیں۔ صفی اللہ کا رنگ فق ہوگیا اور شہناز باپ کے پیچھے چھپی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ زرینہ کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اس کے ساتھی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تھاک۔ تھاک“ (رہنے دو۔ رہنے دو۔)

شاید اس کے دل کے کسی گوشے میں دبی ہوئی ایمان کی چنگاری بھڑکی تھی۔ وہ اسے کچھ سمجھاتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

مکتی باہنی والے جاچکے تھے۔

صفی اللہ کھوئے ہوئے انداز میں بولے۔ ”کاش‘ اس ملک کے اس حصے میں سبز ہلالی پرچم کو سرفراز رکھنے کے لیے بھی قرآن ہی کا سہارا لیا جاتا۔“

زرینہ بیگم نے سسکی لی اور کلام پاک پر اپنے لب رکھ دیے۔ ان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے ٹپک کر اس پرچم میں جذب ہوگئے تھے جس میں قرآن پاک لپٹا ہوا تھا۔



ارشد بخاری

انسان نما درندے

محمد مظہر نیازی کا خیال

طوفان کب کا سر سے گزر بھی گیا مگر
دِل میں جو شور ہے وہ ابھی تھم نہیں رہا

ایک وکیل کی زندگی سے جڑا احساسِ ندامت، بصورتِ کہانی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی میں اکثر ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو لاکھ کوشش کے باوجود بھی دل و دماغ سے محو نہیں ہو پاتے۔ بطور سرکاری وکیل، میں نے بہت سے مجرموں اور ظالموں کو سزا دلوائی ہے لیکن یہ ایک انوکھے کیس کی داستان ہے جس میں، میں کچھ نہیں کرسکا تھا۔

ان دنوں میں صوبۂ سرحد کی وزارتِ قانون کے تحت سرکاری وکیل تھا اور پشاور ہائی کورٹ کی بار کا ممبر بھی تھا۔ گرمیوں میں ہائی کورٹ اور اس سے متعلقہ دفاتر پشاور سے ایبٹ آباد منتقل ہوجاتے تھے اور ستمبر کے آغاز میں واپس پشاور آجاتے تھے۔ ایبٹ آباد شہر کے اختتام پر جو علاقے تھے، ان میں منڈیاں سیبوں کے درختوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہ خوبصورت مقام تھا جہاں لاتعداد درختوں کے علاوہ سبزہ زار پہاڑیاں تھیں۔ منڈیاں سے پہلے ایک مقام پر ایک دو منزلہ بلڈنگ تھی جہاں وکیل اور ہائی کورٹ کے ملازم رہائش پذیر ہوتے تھے۔

وہ اسی (۸۰) کی دہائی کا زمانہ تھا۔ افغانستان میں جنگ کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں افغان پناہ گزین پاکستان آگئے تھے اور لنڈی کوتل سے کراچی تک اور دوسری طرف چمن سے کوئٹہ تک جابجا ان کے کیمپ قائم ہوگئے تھے۔ افغانی یہاں آئے تو اپنے ساتھ غیرقانونی اسلحہ اور منشیات بھی ساتھ لیتے آئے۔ ملک میں ایسی گاڑیوں کا بھی سیلاب آگیا تھا جن کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ جنرل ضیاء کی حکومت نے افغانیوں پر نرمی برتی ہوئی تھی اسی لیے افغان پناہ گزینوں کی غیرقانونی سرگرمیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا چنانچہ پولیس، فوج اور قومی سلامتی ادارے 'دوسرے ادارے بے بس تھے۔

ایبٹ آباد میں بھی یہ پناہ گزین بڑی تعداد میں آئے اور انہوں نے منڈیاں کے ہرے بھرے سیب کے درخت کاٹ کر وہاں اپنے کیمپ لگالیے جس سے بے حد نقصان ہوا مگر کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ ملکی صورتِ حال پر نظر رکھنے والے بیشتر دانش وروں کا خیال تھا کہ ضیاء حکومت کی یہ نرم پالیسی پاکستان کے مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ ان پناہ گزینوں میں عام افراد کے ساتھ ڈاکو، بدمعاش اور اسمگلر بھی بڑی تعداد میں در آئے تھے۔ اس کے علاوہ بھاری تعداد میں دہشت گرد بھی آگئے تھے۔ آج بلوچستان میں ریلوے لائنیں، سوئی گیس کی لائنیں، پل، بجلی ٹرانسفارمرز جو بار بار اڑائے جاتے ہیں اور زائرین کی بسوں پر حملے کرکے قتل و غارت کے جو واقعات اخبارات میں شائع ہوتے ہیں، اس بگاڑ کی ایک وجہ یہ لاکھوں افغان پناہ گزین بھی ہیں۔ افغان جنگ میں روسیوں کو شکست ہوئی اور وہ افغانستان خالی کرگئے۔ امریکہ واحد سپر پاور بن گیا اور پاکستان کی امداد سے اس نے ہاتھ روک لیا۔ امریکہ نے روس کے بعد اسلامی ممالک خاص کر عراق، افغانستان اور پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کے خلاف اقدامات شروع کردیئے۔ وقت نے یہ منظر بھی دکھایا کہ امریکہ اِن اسلامی ممالک کا سخت دشمن بن گیا اور لاکھوں مسلمان عورتوں، بچوں اور بے گناہ انسانوں کو قتل کردیا۔ ایک طرف امریکہ پاکستانی علاقوں پر ڈرون حملے کررہا ہے اور دوسری افغان پناہ گزین بلوچستان میں دہشت گردی میں مصروف ہیں۔ مطلب یہ کہ افغان جنگ سے پاکستان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

بہرحال افغان پناہ گزینوں نے منڈیاں میں بھی کیمپ قائم کرلیے تھے۔ ان کے کیمپ ہماری رہائشی عمارت سے نزدیک ہی تھے، ان کیمپوں میں وہ لوگ خاصے مزے سے رہ رہے تھے۔ حکومت کی طرف سے انہیں ٹھیک ٹھاک امداد ملتی تھی جس سے

کا گزر بسر اچھی طرح ہورہا تھا۔ ان کے بچے اکثر ...لتے ہوئے ہمارے پاس بھی آجاتے۔ ہم انہیں ...ے اور ٹافیاں دیتے، وہ خاموش ہوکر واپس چلے ...تے۔ بچے چھ سات سال سے لے کر آٹھ نو سال ...عمر کے تھے۔ ان میں چھوٹی بچیاں بھی ہوتی ...ں۔ یہ افغانی بچے کھیلتے ہوئے اور شور مچاتے ...ئے مجھے بہت پیارے لگتے تھے۔ وہ پشتو یا فارسی ...ان میں بات کرتے تھے۔ ان بچوں میں ایک ...ایت خوبصورت اور پری جیسی لڑکی ریشم بھی تھی جو ...ماہر اُن کی قائد تھی۔

ریشم کا گورا رنگ، نیلی آنکھیں، گلاب جیسے ننھے ...ونٹ تھے۔ اس کے بکھرے بال ہر وقت ہوا میں ...راتے رہتے تھے۔ اس کی معصوم مسکراہٹ اور قہقہے ...ے دلآویز تھے۔ وہ مجھے بے حد پیاری لگتی تھی اسی لیے میں اس کے لیے خاص طور پر اچھی چیزیں اور کھلونے لاتا تھا جنہیں دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوتی تھی۔ ہمارے چپراسی گل خان کے ان پناہ گزینوں سے تعلقات ہوگئے تھے۔ وہ شام ہوتے ہی اُن کے ...مپ میں چلا جاتا تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ ریشم کا ...اپ شہباز خان اس گروپ کیمپ کا سردار سمجھا جاتا ہے۔ وہ بہت لالچی، اکھڑ، ضدی اور بدتمیز آدمی تھا۔ اس کے برعکس ریشم کی عادات اس کے الٹ تھیں، ہر وقت مسکراتی ہوئی ریشم کو سب پسند کرتے تھے۔ ریشم چھ سال کی تھی جب اس کی ماں ٹی بی سے مرگئی تھی۔ چند دنوں ہی میں ریشم سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ ریشم تو محبت کی پیاسی تھی اس لیے میرے قریب آتی گئی۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں بھی پیار کی روشنی جگمگا اٹھی تھی۔

عید کی چھٹیوں میں مجھے اپنے گھر لاہور جانا تھا۔ ریشم کو پتہ چلا تو اس نے منہ بنالیا کیونکہ وہ مجھ سے ...ت فری ہوگئی تھی۔

بے وقوف

بیوی نے اخبار کا سنڈے میگزین پڑھتے ہوئے شوہر کو مخاطب کیا۔ ''اس میگزین میں ایک آدمی کی حیرت انگیز کہانی چھپی ہے۔ وہ بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا۔ 36 سال کی عمر تک اسے ایک لفظ بھی لکھنا اور پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر اس کی ملاقات ایک عورت سے ہوئی اور اس کی خاطر وہ دو سال میں بے پناہ تعلیم حاصل کرکے عالم فاضل اور دانش ور بن گیا......! ہے نا کمال کی بات؟''

''یہ تو کوئی خاص بات نہیں......'' شوہر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جو 36 سال کی عمر میں بہت بڑا عالم فاضل اور دانش ور تھا۔ پھر اس کی ملاقات ایک عورت سے ہوئی......اور صرف دو دن میں وہ بے وقوف بن گیا......اس نے عورت سے شادی کرلی!''

میں نے اسے مناتے ہوئے کہا: ''ریشم! میں ہمیشہ کے لیے نہیں جارہا۔ ایک ہفتے کے بعد واپس آجاؤں گا۔ اچھا، تمہارے لیے کیا لاؤں؟'' میری بات پر وہ خوش ہوگئی۔

''میرے لیے چابی والی موٹر کار لانا۔'' اس نے چہکتے ہوئے کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلادیا اور اسے پاس بلایا۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ ماں کی ممتا سے محروم بچی تھی مگر تھی بڑی حساس، وہ میرے گلے لگ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے اور پیار سے جانے کو کہا۔

گھر واپسی پر رات بھر مجھے ریشم کا خیال آتا رہا۔ میری ایک بیٹی صائمہ ہے جو بچپن میں ریشم کی طرح ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ خاندان والوں نے اُسے ''پھول'' کے نام سے پکارنا شروع کردیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہم

میں نے مندر کی سیڑھیاں چڑھتے
جب سے دیکھا ہے
اُس پری وَش کو
مجھ کو لگتا ہے
چاند اُس دِن سے
میری آنکھوں کو چومنے کے لیے
میرے آنگن میں روز آتا ہے

میثم علی آغا

اس کا یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ سب اس کا اصل نام جیسے بھول گئے تھے۔ اسے سب ہمیشہ ''پھول'' ہی کہتے تھے۔ ریشم کی عادتیں بھی پھول جیسی تھیں۔ دونوں میں گہری مماثلت تھی۔ آج بھی تین بچوں کی ماں صائمہ کو ہم پھول ہی کہتے ہیں۔

عید کے دوسرے روز میں انارکلی' لاہور سے چابی والی موٹر کار خرید کر لے آیا۔

بیگم نے پوچھا۔ ''یہ کار کس کے لیے ہے؟''

''ہماری پھول کی طرح ایبٹ آباد میں بھی ایک بچی ہر وقت مسکراتی رہتی ہے' اس کا نام ریشم ہے۔ وہ روز ہی افغان بچوں کے ساتھ ہمارے پاس آتی ہے۔ میں ٹافیاں بسکٹ وغیرہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر بازار سے لے آتا ہوں۔ وہ اُن میں بانٹ دیتا ہوں۔ بچے خوش ہو کر چلے جاتے ہیں۔''

''میں نے سنا ہے کہ افغان پناہ گزین اچھے لوگ نہیں ہوتے۔'' بیگم نے کہا۔

''اچھے برے لوگ ہر قوم میں ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہرحال آپ ان سے محتاط ہی رہیں تو اچھا ہے۔'' بیگم نے کہا۔

عید کے بعد جب میں ایبٹ آباد گیا تو موسم اور ماحول بدل چکا تھا۔ شام کو حسب معمول بچے آئے لیکن ریشم اُن میں موجود نہیں تھی۔ مجھے کچھ پریشا[illegible] ہوئی۔ دوسرے روز بھی ریشم کا کوئی پتہ نہ تھا۔ میں نے گل خان کو موٹر کار دی اور کہا کہ وہ کیمپ میں جا کر ریشم کو یہ کار دے آئے۔ جواب میں گل خان نے جو کچھ کہا' اسے سن کر میں چکرا گیا۔ اس نے غم ناک لہجے میں کہا تھا۔

''ریشم کی شادی ہو گئی ہے اور وہ چلی گئی ہے۔''

''گل خان! تم کیا کہہ رہے ہو؟ اتنی چھوٹی عمر میں شادی؟''

''اس کے باپ شہباز خان کو اپنی شادی کرنی تھی۔ لڑکی والے پچاس ہزار مانگ رہے تھے۔ اس نے ایک ساٹھ سالہ بوڑھے سے ریشم کا سودا کیا' ساٹھ ہزار روپے لے کر ریشم کو اس کے حوالے کر دیا۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل و دماغ میں بم پھٹ گیا ہو۔

گل خان کہنے لگا۔ ''رخصتی کے وقت ریشم روتی رہی' چیخیں مارتی رہی' کرلاتی رہی مگر شہباز خان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا بوڑھا خاوند زبردستی اسے اپنی گاڑی میں لے گیا۔''

میں غم سے نڈھال ہو کر رہ گیا تھا۔

گل خان کہہ رہا تھا۔ ''ہوسکتا ہے' وہ بوڑھا خاوند ریشم کو بیچ کر لاکھوں کمائے۔ شہباز خاں نے اپنی معصوم بیٹی کو درندوں کے حوالے کر دیا۔''

میں کئی روز تک اس غم سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ میں جو خود کو اتنا بڑا سرکاری وکیل سمجھتا تھا مگر اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے مگر میں بے بس تھا۔

اس بات کو اتنے برس گزر گئے ہیں مگر آج بھی جب کسی بچی کو کھلکھلاتے' چہکتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے ریشم بے طرح یاد آتی ہے اور میرے اندر اَن دیکھے آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی ہے۔

WATCH EVERY Fri-Sun AT 9:05PM Love Life aur Lahore PRESENTS

عکاشہ سحر ایمان

میں نے دیکھا ہے کہ....

محسن نقوی کا خیال

کہنے کو تو گزرے کئی طوفان بھی سر سے
ہم لوگ مگر شہر میں رونے کو بھی ترسے

قدرتی آفت سیلاب اور انسانی غفلت کی ایک خاص کہانی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قیامت تھم گئی ہے کیا' بتاؤ ناں؟ کیا درد کی رات آ کے گزر بھی گئی؟

کوئی بولتا کیوں نہیں؟ کوئی ہے جو مجھے بتائے؟ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

•......•......•......•

گھر کیسے بنتا ہے؟ نسل در نسل کتنی مشقت اٹھانا پڑتی ہے اور پھر اس بھرے پرے گھر کو خالی کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے؟ آدمی کا سارا سینہ خالی ہو جاتا ہے۔

جانتے ہو' جب ایک اَن دیکھی ہجرت پر دہلیز سے آ لگی تو شہروں کے شہر خالی ہوگئے۔ تم پر یہ المناک کہانی کیسے اثر کرے گی؟ کیونکہ تم کبھی اس درد سے نہیں گزرے' ہجرت نے کبھی تمہارے دروازے پر دستک نہیں دی' تم نے بے گھری کا عذاب نہیں سہا پھر بھلا تم ہمارے دکھ کو کیسے محسوس کرو گے؟

جانتے ہو' خدا کی کتنی بڑی زمین اذانوں اور سجدوں سے خالی ہوگئی ہے۔ سجدہ گاہیں اور مسجدیں پانی میں ڈوب گئی ہیں اور ان آبادیوں کے مکین اپنی پیشانیوں میں سجدے لیے خشک زمین ڈھونڈتے پھر رہے ہیں' لہر در لہر گزرتے ہوئے اِس وقت کے بہاؤ میں کیا جانیے' ہمارا کیا کچھ بہہ گیا ہے۔ وقت نے جو بہت بڑا ملبے کا ڈھیر چھوڑا ہے' اس کے نیچے دبا کچھ بھی اپنی پہلی حالت میں نہیں رہا۔ اب گزرا ہوا سارا سمے ملبے کا ڈھیر ہے۔ بہتی ہوئی ساری یادیں گدلا پانی ہوگئیں اور گزری ہوئی ساری زندگی محض کیچڑ...... یہ سارے لوگ جو تمہیں نظر آ رہے ہیں' اپنے گھروں کے انہدام اور روزگار کی تباہی پر نوحہ کناں ہیں۔ جب یہ اپنے اس نقصان پر رو دھو کر بیٹھ جائیں گے تو انہیں یاد آئے گا کہ ان کا سینہ اور گھر یادوں سے خالی ہوگیا ہے' گلیوں سے قدموں کے نشان مٹ چکے ہیں۔ کسی بھی شے سے اپنائیت کا احساس نہیں ہو رہا۔

یہ اجنبیت' یہ مغائرت' یہ خالی اور سپاٹ زمین' محرومی اور کم مائیگی کا ایسا مقام ہے کہ بہت سے لوگ پاگل پن کا شکار ہو جائیں گے' اپنی زندگی کو اردگرد ڈھونڈتے پھریں گے اور ہاتھ کیچڑ سے بھر جائیں گے پھر وہی سینہ کوبی......

پانی صدیوں سے آباد شہروں سے ہمیشگی کے سب نشان مٹاتا ہوا گزرا' تاریخی شہروں میں بزرگوں کے مقابر اور ان کی منقش دیواریں پانی میں ڈوبیں تو اس دکھ پر آنسو بہانے والا کبوتروں کے سوا کوئی نہ تھا۔

پانچ سال پہلے ایک صبح اچانک زمین کا سینہ پھٹا تو شہروں کے شہر ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ پانچ سال بعد ہم ایک بار پھر ملبے تلے آ دبے ہیں' ان پانچ سالوں کے درمیان گزرا وقت ہم نے ملبہ اٹھاتے اور بین کرتے گزارا ہے۔ اپنے اسکولوں کے ملبے تلے دب کر مرنے والے بچوں کے اسکول ابھی تعمیر ہی ہوئے تھے کہ 60 لاکھ بچوں کے اسکول پانی میں بہہ گئے۔ پانچ سال پہلے گھروں کے انہدام کے بعد آباد ہونے والی خیمہ بستیاں ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھیں کہ ایک بار پھر شہروں کے شہر خیمہ بستیوں میں اٹھ آئے۔

جب کوئی مصیبت ٹوٹنے والی ہو تو پرندوں اور جانوروں کو پتہ چل جاتا ہے' وہ اپنی اپنی بولیاں بول کر ایک دوسرے کو آنے والے خطرے سے آگاہ کرتے ہیں۔ بستی میں پانی آنے کی اطلاع پہنچی تو گلیاں سہمی ہوئی آوازوں سے بھر گئیں' چرند پرند خاموش ہوگئے اور......اور......پھر ایک حشر برپا ہوگیا' ہر طرف شور' عورتوں کی چیخ و پکار' موت کی ماری عورتیں چیخ رہی تھیں۔

''ہائے' میرا لختِ جگر......! ہائے' میرا ...اگ ...... ! ہائے' میرے ماں باپ......! ہائے' ...ری بیٹی......!''

پانی کا خوف جسموں میں ارتعاش پیدا کیے ...ئے تھا' ایسی صورت میں لوگوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا ...ہ گھروں سے کیا اٹھا جائے' کیا چھوڑا جائے؟ ...ک ایک قدم آگے بڑھتے اور دو قدم پیچھے ہٹ کر ...پنے گھروں کو آخری بار دیکھتے۔ بالآخر اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی اپنے بچوں کو بچا کر محفوظ مقامات ... لے آئے۔ وہ لوگ جو اپنے علاقوں میں پانی ...نے کے بعد وہاں سے نکلے' وہ اپنی یہ متاع بھی نہ بچا سکے...... پانی کا بہاؤ ماؤں کے سامنے اُن کے بچے بہا لے گیا اور مائیں بین کرتی رہ گئیں۔ ماؤں کے سامنے بہہ جانے والے بچوں کی لاشیں ابھی تک پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

بہت سی ماؤں کے لیے یہ پانی ہی بچوں کی قبر بن چکا ہے۔ ایسا تو ان ماؤں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اپنے بچے ایک روز پانی کے ریلے کے سپرد کرنا ہوں گے جو ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شناخت بھی ختم کر دے گا اور......اور......کیا بتاؤں' میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا' میری آنکھیں پتھر ہوگئی ہیں۔

''میرے سامنے پانی ہی پانی ہے' شور مچاتا' چیختا' چنگھاڑتا پانی۔ خدا کے لیے' اس پانی کو روکو۔''

وہ آنسو پیتا رہا۔ اُس کا گلا رندھ گیا' سینہ سلگ اٹھا مگر اس نے ایک بھی آنسو آنکھ سے نکلنے نہ دیا۔ اُس کے سینے کے اندر ٹپ ٹپ کرتے ہوئے گرتے ہی چلے گئے۔

''بابا......! حوصلہ کرو' ہمت سے کام لو۔'' میں نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''حوصلہ اور ہمت کہاں سے لاؤں؟'' وہ ہذیانی انداز میں چلایا۔

''میں نے کہا تھا ناں' تم اس کرب و درد سے کبھی نہیں گزرے' تمہیں کیا خبر ان معصوم بچوں کی بدنصیب ماؤں پر وہ لمحے کتنے کٹھن تھے جب سب لوگ اپنے گھروں سے نکلے تو کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اُن کی منزل کہاں ہے؟ یہ ہجرت کہاں جا کر ختم ہوگئی؟ پانی کے خوف سے لرزاں قافلے اونچے ٹیلوں پر آباد ہونے تک پیدل چلتے رہے' چلتے چلتے بچوں کے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ پانی کا شور مسلسل تعاقب میں تھا۔ کپڑے مٹی اور کیچڑ سے اٹ گئے' چہروں پر خوف نقش ہوگیا' جن بالوں میں مائیں روز کنگھی کیا کرتی تھیں' ان بالوں پر پڑی گرد ایک ناگہانی ہجرت کی رُوداد سنا رہی تھی' بستی والوں کا قافلہ جب ایک اونچے ٹیلے پر پناہ گزین ہوا تو اطراف میں شام ڈھل رہی تھی۔ بچوں نے حیران نظروں سے چاروں اور پھیلے پانی کو دیکھا تو انہیں اس خوف نے آلیا کہ آج ہم اپنے گھروں کی پناہ میں نہیں' چار سو ایک ویرانی ہے جس میں پانیوں کا شور گونج رہا ہے۔''

''جب سورج اپنی روشنی سمیت پانی میں ڈوب گیا تو اردگرد ایک خوفناک رات طلوع ہوگئی۔ لوگ اپنے آپ کو اس خیال کی بھیانکتا سے ہمکنار کر رہے تھے کہ آج کی رات یہیں کھلے آسمان تلے بسر کرنا ہوگی۔ گھروں کی چار دیواری سے دور عدم تحفظ کے احساس سے لرزاں مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھیں۔ بچوں کے چہروں پر پریشانی کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ اچانک انہیں بھوک کا احساس ہوا۔''

''بچے دیکھ رہے تھے کہ مائیں آج گھروں کی بجائے ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھی ہیں' روٹی کا وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہونے کے باوجود بھی انہیں اپنے پاس نہیں بلا رہیں' ناگہانی میں گھروں سے ہجرت کرنے والوں کے پاس ایک وقت کا کھانا بھی نہیں تھا۔ بھوکے بچوں کا شور پانی کی آواز میں گم ہوگیا۔ بچوں کو صبر کی تلقین کرتے کرتے والدین کے صبر کا پیمانہ بھی چھلک اٹھا۔''

''یہ پانیوں کا اور طرح کا بہاؤ تھا۔ رات کے بڑھتے بڑھتے بچوں کی آنکھوں میں نیند اتر آئی' گھروں میں نرمیلے بستروں پر سونے والے بچے سیلی مٹی پر سوئے پڑے تھے۔ ایک بچے نے مٹی کے ایک ڈھیلے کو تکیہ بنایا ہوا تھا۔ ماؤں نے یہ منظر دیکھا تو دیر تک اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتی رہیں۔ اس رات پانی کی خوفناک آواز بچوں کو نیند میں بھی سنائی دے رہی تھی۔''

''صبح سورج کے ابھرنے پر جب بچے نیند سے بیدار ہوئے تو ان کے چہروں پر بھوک کی شدت اور پانی کا خوف نقش ہو چکا تھا۔ وہ بچے جو اپنے گھروں میں اپنے خوابوں کے ساتھ پروان چڑھ رہے تھے' آج کھلے آسمان تلے پڑے تھے' نہ ان کے لیے کوئی بستر تھا نہ سروں پر چھت۔''

''سورج نکلتے ہی دھوپ اپنی حدت کے ساتھ اتر آئی۔ بچوں کے چہرے کچھ ہی دیر میں سنولا گئے۔ سیدھی سروں پر پڑنے والی دھوپ جسم کے اندر اترتی جا رہی تھی' ایسے میں ماؤں کے آنچلوں میں کتنے بچے چھپ سکتے تھے؟ شام تک نہ بچوں کو کھانا میسر آیا نہ ہی ایسی کوئی چھت جو کچھ دیر کو ''دھوپ کے سیلاب'' کو روک لے۔ جونہی شام ہوئی تو دو دن پہلے تک پھولوں کی طرح کھلے بچوں کے چہرے کمہلا گئے۔ اُس شام بھوک سے بلکتے بچوں کی چیخیں اتنی شدت لیے ہوئے تھیں کہ والدین کے سینے پھٹ کر رہ گئے۔''

''اب بے گھری اور بھوک میں لپٹی ایک اور رات سامنے تھی جس میں شیر خوار بچوں کے رونے کی آوازیں بھی شامل ہو چکی تھیں کیونکہ دو روز سے بھوکی بیٹھی ماؤں کا دودھ بھی خشک ہو چکا تھا' سو پناہ گزین بچوں کی راتیں بھوکے پیٹ کھلے آسمان تلے گزرنے لگیں۔ ہر آنے والی صبح بچے بیدار ہوتے تو ان کے چہروں پر بھوک کی شدت مزید گہری ہو چکی ہوتی۔ ابھی اس افتاد کو چند ہی روز گزرتے تھے کہ بچے بھوک کے ہاتھوں اتنے نڈھال ہو گئے کہ روٹی کے لیے آواز بلند کرنے کے قابل بھی نہ رہے اور......اور......'' بوڑھے شخص کی آواز بھرا گئی۔

''بھوک...... بے گھری...... اور بارش کے دباؤ کے ستائے لوگوں کے لیے نہ زمین مہربان رہی نہ آسمان اور نہ ہی وہ ہوا جو انہیں چھو کر گزر رہی تھی۔ سیلاب زدگان بچے جس فضا میں سانس لے رہے تھے' وہ اس قدر زہریلی ہوگئی کہ اس میں زندہ رہنا قطعی ناممکن بن گیا۔ جن شہروں اور آبادیوں میں پانی آیا' وہاں زمین پر موجود تمام تر گندگی اُس سے جا ملی اور ساری فضا متعفن ہوگئی' بچوں کی جلد ڈھیلی پڑ گئی' دل کی دھڑکنیں پانی کی رفتار سے بھی تیز ہوگئیں اور آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ وہ بچے جن کی ماؤں کے دودھ پہلے خشک ہوئے' جن کے باپ کوشش کے باوجود اُن کے لیے کہیں سے دودھ نہ لا سکے' وہ بچے سب سے پہلے مر گئے۔'' بوڑھے شخص کی سسکی نما آواز نکلی۔

''والدین کے سینوں میں دیواریں گر رہی تھیں' جس خیمہ بستی میں جاتے' وہاں کوئی نہ کوئی ماں اپنی گود میں بیمار بچہ لیے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں بچے کے نیم مردہ وجود پر ٹھہری ہوئی تھیں' بچے کا باپ زمین پہ تھوڑی سی خشک جگہ تلاش کرنے گیا تھا جہاں اُس کے بچے کی قبر بنائی جائے گی۔



پیاس اور جسم میں پانی کی کمی سے مرنے والے بچوں کا جنازہ پانی پر سے گزرتا تھا۔ میں اس ماں کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا' تب بھی میرا سینہ درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا لیکن حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ ایک چیخ ہے جو سینے کے درمیان آج بھی کہیں ٹھہری ہوئی ہے۔''

''چاروں طرف پانی' راستے پانی میں ڈوبے ہوئے اور ایک ماں گیسٹرو میں مبتلا اپنے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ بچے کا باپ کسی ڈاکٹر کی تلاش میں نکلا تھا۔ جتنی دیر میں اُس نے پانی میں ڈوبی ہوئی سڑک طے کی' اتنی دیر میں اُس کا بچہ زندگی کی تمام منزلیں طے کر گیا۔ باپ' ڈاکٹر نہ ملنے سے مایوس ہو کر واپس آیا تو اس کا بیٹا اپنی ماں کی گود میں پرسکون پڑا تھا۔ ماں اس کے چہرے پر بھنبھنانے والی مکھیاں اڑا رہی تھی' اس نے دوپٹے سے مکھیوں کو اڑایا اور ایک دلخراش چیخ کے ساتھ بولی۔ ''جاؤ' دفع ہو جاؤ...... میرے لال کو تنگ نہ کرو' کئی دنوں کے بعد آج ہی تو اسے سکون کی نیند آئی ہے۔''

ماؤں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے سائے میں پروان چڑھنے والے بچے ایسے موسم میں جدا ہوئے جب زمین پر قبریں بنانے کے لیے خشک جگہ بھی ختم ہوگئی۔ زمین پر اُگے ہوئے پھول پانی میں ڈوب گئے۔''

''اِن اجڑی بستیوں اور گھروں کے مکین جب واپس آئیں گے تو انہیں اپنے گھر کی بجائے زمین کا ایک ایسا ٹکڑا ملے گا جس پر پانی کی تہہ چڑھی ہو گی۔ وہ لوگ اس پانی میں اپنے گھر کو ڈھونڈنے کی کوشش میں کیچڑ سے اپنے ہاتھ بھر لیں گے اور پھر انہی ہاتھوں سے سینہ کوبی کریں گے۔ میں نے دیکھا کہ قد آور پانی کے ریلے کروڑوں لوگوں کے گھر بہا لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ نسلوں کے اثاثے پانی کے بہاؤ میں بہہ گئے۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں کو گھروں اور مال و اسباب کی بربادی نے کتنے گہرے گھاؤ لگائے۔ میں نے ان زخموں سے بہتا ہوا خون دیکھا ہے اور اس کے درد سے چیختے چلاتے لوگ دیکھے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بھوک کے کرب سے ناآشنا لوگ بھی روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے جانوروں کی طرح لڑتے نظر آئے۔ پانی کا شور بڑھتا تو پناہ گزین بستیوں سے بھی بین بلند ہونے لگتے۔''

''کچھ عرصہ پہلے یہاں سے تھوڑی دیر ایک بستی تھی۔ صبح ہوتے ہی گھروں سے دھواں اٹھتا' مائیں بچوں کو اپنے ہاتھ سے ناشتا کراتیں اور اپنی خواب آلود آنکھوں سے انہیں اسکول جاتا دیکھتیں اور پھر ایک رات ناراض پانی کا ریلہ کچے مکانوں کے ساتھ ساتھ اُن میں آباد مکینوں کے خواب بھی بہا لے گیا۔ اس منہدم بستی کے مکین کئی راتوں سے بے مہر آسمان تلے شب گزین ہیں۔ بچے کئی دن بھوکے رہے اور پھر مر گئے۔ ماؤں کی آنکھوں میں بھی سیلاب اتر آیا۔'' اُس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں مانتا ہوں یہ سیلاب وغیرہ قدرتی آفات ہوتی ہیں لیکن زمین پر موجود حکمرانوں کی غفلت اور بے حسی بھی تو اس کی تباہی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔'' یہ کہہ کر اُس بوڑھے شخص نے پل بھر میرے چہرے کو دیکھا اور پھر لاٹھی ٹیکتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM

عندلیب سلمیٰ

تہی داماں تھا وہ

قابل اجمیری کا خیال

راحتوں سے گریز، غم سے فرار
بعض لمحے عجیب ہوتے ہیں

ایک معروف لکھاری کی زندگی اور موت کا حال و مآل

زندگی کے کاغذ پر وقت کی سیاہی سے لکھی حرف بہ حرف یہ سچی کہانی ایک معروف کہانی کار کی ہے۔ اس کہانی کار کا نام...... ! لیکن ٹھہریے، میرے ذاتی خیال میں اس کہانی کار کا اصل نام لکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ سو ہم اس مرحوم کہانی کار کا فرضی نام ہمایوں یزدانی رکھ لیتے ہیں۔

اس کہانی کا پہلا منظر وہ ہے جب ایک ادبی ایوارڈ میں ہمایوں کی شخصیت اور کہانی کی بہت زیادہ تعریف رہی تھی جب کہ جواباً ہمایوں کے چہرے پر ایک استہزادیہ مسکراہٹ تھی...... ہمایوں کی تحریر اور شخصیت کا ایک زمانہ خصوصاً نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گرویدہ ہیں۔ واقعی ہمایوں کی شخصیت اپنا ایک سحر رکھتی ہے۔ نکلتا ہوا قد، گوری رنگت، روشن پیشانی، کھڑی ناک، بڑی بڑی روشن آنکھوں میں دل کو کھینچ لینے والی کشش، کالے گھونگھریالے بال، عنابی ہونٹ جو سدا بھینچے رہتے۔

انسان کی زندگی میں ابتدائی عمر سے جوانی تک جو نشیب و فراز آتے ہیں۔ وہی اس کے مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایک طرف اپنی وجاہت اور تحریروں کا زعم، دوسری طرف، غربت، بیکاری اور اپنی کم مائیگی کا احساس، بچپن سے یتیمی اور محرومی سب کچھ اچانک ہوگیا۔ کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باعث وہ اپنے حق کے لیے کچھ نہ کرسکا اور پھر اپنی انا اور خودداری اپنے پندار کو بچانے کے لیے اس نے کیا کیا قربان نہ کیا۔ دوست چھوڑے، رشتے داروں سے منہ موڑا، نہ کسی غمی میں نہ خوشی میں، نہ کسی کا ساتھ دیا نہ دینے دیا۔ بس ایک اماں، اس کی دکھ سکھ کی ساتھی اپنے لال کی حالت پر جلتی کڑھتی رہتیں۔

''ایسے ساری دنیا سے کٹ کر زندگی نہیں گزاری جاتی۔'' لیکن سب بے اثر تھا۔ گھر کا سناٹا اماں کے لیے ناقابل برداشت ہوا جا رہا تھا۔ بڑھاپا، بیٹے کی تنہائی اور خاموشی وہ آہستہ آہستہ شمع کی طرح پگھلتی



جا رہی تھیں۔

☆......☆

اور پھر بہت عبادتوں، دعاؤں اور آہ و زاریوں کے بعد ایک روز ہمایوں شادی کے لیے راضی ہوگیا مگر بدقسمتی سے آنے والی ہمایوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ لاسکی۔ چھوٹے موٹے اختلافات اور لڑائیاں، طول پکڑتی گئیں۔ یہاں تک کہ روز بروز گھر کے بگڑے ہوئے ماحول سے دل برداشتہ ہوکر اماں اپنی جان ہار گئیں تو بیوی اپنے باپ کے گھر سدھاری تھیں۔

اب گھر میں سناٹے کا ڈیرا تھا۔ باورچی خانے کے علاوہ سارا گھر بند پڑا تھا۔ ہمایوں اپنی انا اور خودداری کے زعم میں مگن رہا کہ ''اونہہ کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

کہانی لکھنے والا قلم اب بڑی یکسوئی سے رواں رہتا لیکن پھر یوں ہوا کہ لکھتے لکھتے انگلیاں شل ہونے لگیں۔ خیالات مل کے نہ دیتے الفاظ روٹھ جاتے تو کہانی کا سرا مل کے نہ دیتا ہمایوں کے عنابی ہونٹوں کو دوسرے سرے پر جلنے والی مسلسل آگ سیاہی مائل کرتی رہتی...... وقت چلتا رہا...... اور چلتا ہی رہا......!

☆......☆

اور پھر برسوں بعد ایک دن گھر کی مسلسل بھائیں بھائیں کرتی سرگوشیوں سے گھبرا کر میز کی دراز کو کھولا تھا۔ تو وہاں دو تین برس پہلے آیا وہ خط موجود تھا جس پر بھیجنے والی کا نام پڑھ کر اسے ضروری سمجھ کے میز کی دراز میں ڈال دیا تھا نہ جانے کیوں وہ خط اب کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

''ہمایوں! آج تمہارا بیٹا ڈاکٹر بن چکا ہے ملنا چاہو تو اس سے مل لینا۔ نیچے ایک اسپتال کا پتہ درج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تا۔ اب رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ موٹے موتے شیشے تلے دھندلی آنکھوں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ لوگ اسے ڈاکٹر شہزاد ہمایوں کے نام سے پکارتے ہیں کہ میں نے اسے یہ ہی نام دیا ہے۔''

خط پڑھتے پڑھتے ایک کسک آمیز بے قراری، ہمایوں کے وجود میں منڈلانے لگی۔ ایک عجیب سا طوفان اور ہیجان دل میں اٹھا۔ بیٹے کو دیکھنے کی آرزو نے سر ابھارا، ایک پرانے سے بیگ میں کپڑے اور ضروری سامان لے کر اس نے کراچی کا رخ کیا اور پھر اسپتال کا پتہ پوچھتے پوچھتے آخر منزل پا ہی لی۔

کلینک پورا بھرا ہوا تھا۔ کافی انتظار کے بعد ہمایوں کا نمبر آ گیا۔ ڈاکٹر شہزاد نے نبض ہاتھ میں لے کر تکلیف پوچھی۔ باپ کی پیاسی نظریں بیٹے کو دیکھ کر آنکھوں کو سیراب کیے جا رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا نبض پر ایسے ہی انگلیوں کا لمس رہے۔ وہ آنکھیں جو کبھی آئینہ میں اپنا ہی سراپا دیکھنا پسند کرتی تھیں۔ آج توصیفی نظروں سے جیسے اپنے ہی وجود کو دیکھ رہی تھیں، وہی بلند و بالا قد، ویسی ہی سرخ سفید رنگت آنکھوں میں ویسی دل کو کھینچنے والی کشش، مضبوط ہاتھ، سبز رگوں میں دوڑتا ہوا گرم خون جو ادھیڑ عمر ہمایوں کے خون کو بھی گرمائے دے رہا تھا۔

ڈاکٹر شہزاد حیران و پریشان جواب کا منتظر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مریض اسے کیوں تکے جا رہا ہے۔ دوبارہ حال پوچھا۔ لہجہ انتہائی شائستہ اور نرم تھا مگر یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ پدرانہ جذبات کے طوفان نے جیسے زبان گنگ کر دی تھی۔ پیاسی آنکھیں سیراب ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا اسے سینے سے لگا لے مگر وہ کس برتے پر گلے لگاتا۔ اس نے بیٹے کو دیا ہی کیا تھا کہ اب اس کا طلب گار تھا!...... اماں کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''بیٹا! دکھ سکھ کا بٹوارہ ضروری ہوتا ہے۔ رشتوں کو بوجھ مت بناؤ۔'' مگر یہ سب باتیں اس کو کبھی فضول لگتی تھیں۔ اپنی انا اپنی خودداری بچانے کے لیے اس نے سب سے رشتے توڑ لیے تھے۔ بس کاغذ اور قلم سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ دوسروں کی کہانیاں لکھنے والا اپنی زندگی کی کہانی اور کرداروں سے بے خبر تھا۔

آخر دوسرے مریض کا نمبر آنے پر ہمایوں کلینک سے باہر آ گیا تھا۔ باہر ایک گاڑی سے ایک بہت ہی خوب صورت گول مٹول سا بچہ بمع اپنی ماں کے کار سے اترا، ڈرائیور نے کلینک کے باہر بیٹھے ہوئے چپراسی کو کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب کو کہو ان کی بیگم بچے آئے ہیں۔''

ہمایوں یزدانی نے دل کو پرسکون رکھنے کے لیے دل پر ہاتھ رکھ لیا، جو کبھی تیز اور کبھی آہستہ دھڑک رہا تھا۔ اس کا اپنا خون بیٹے کا سامنے تھا۔ ہمایوں نے بڑھ کر بچہ کو سینے سے لگا لیا۔ بچے کی ماں تیر کی طرح لپکی جھپٹ کے بچہ کو چھینا اور زوردار تھپڑ ہمایوں کے گال پر رسید کیا۔ یہ تھپڑ گال پر نہیں دل پر پڑا تھا۔ آتی جاتی سانسوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر صاحب جیسے ہی باہر آئے لوگوں کو ایک بوڑھے کے اطراف جمع دیکھا۔ معائنہ پر پتہ چلا مسافر جا چکا ہے...... پتہ نہیں کون تھا؟ تلاشی کے دوران جیب سے شناختی کارڈ اور ایک تصویر نکلی تھی جو اس مرنے والے اور ڈاکٹر شہزاد کی ماں کی تھی...... یہ تصویر ان کی شادی پر کھینچی گئی تھی۔

جی ہاں! آپ یقین کر لیں کہ...... کہانی لکھنے والے کی بھی اپنی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے!!

WATCH EVERY Fri-Sat AT 8:00PM انوکھی PRESENTS

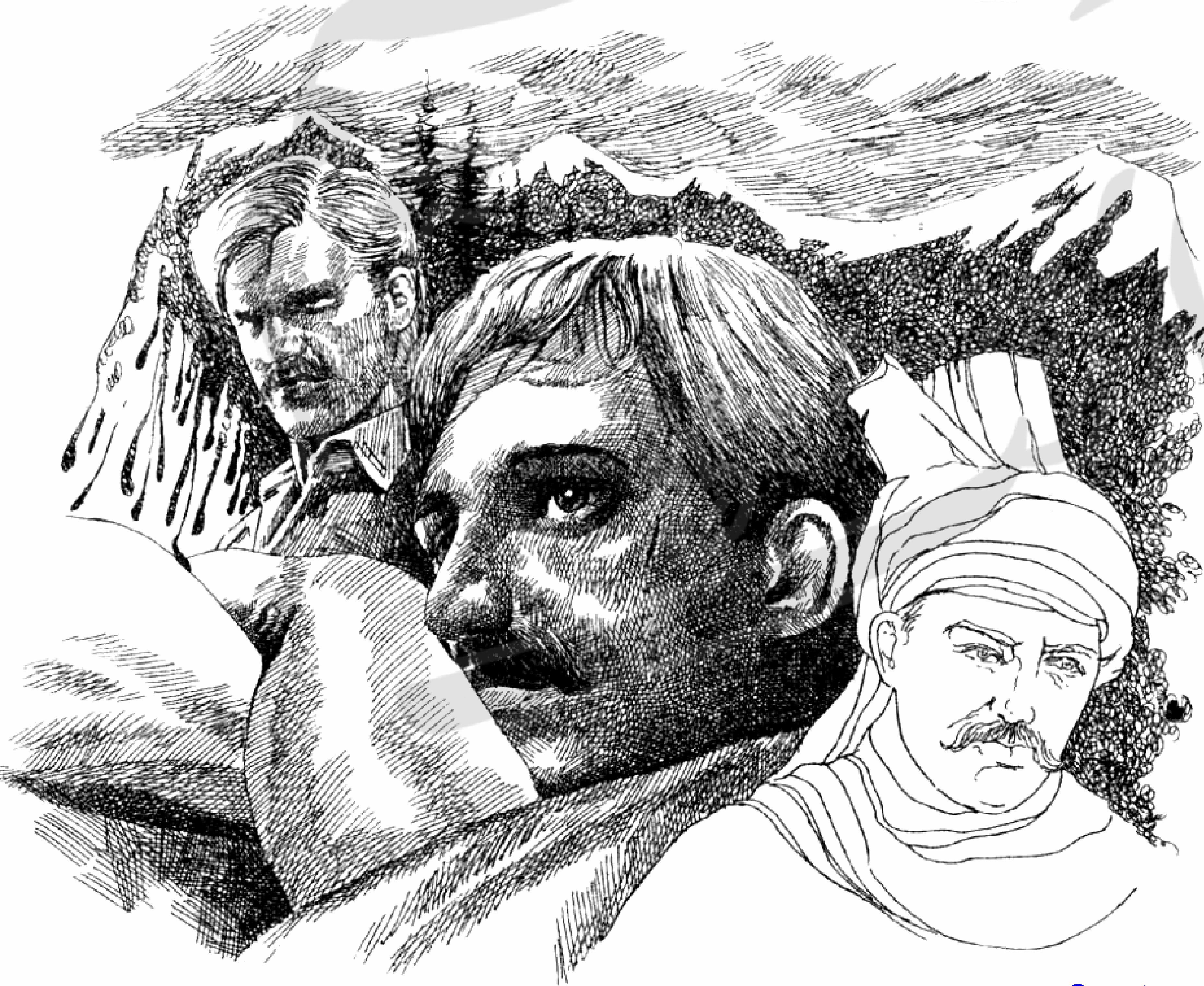
ارباب قربان علی اریری

نہ تھمنے والے آنسو

شاداب صدیقی کا خیال

دور ہوں زندگی کے کیسے الم
ظلمتوں کا شکار رہتی ہے

انسانی حرص اور درندگی سے جڑا ایک المیہ، ایک کہانی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر انسان یہ گلہ کرتا ہے کہ زندگی بہت ہی مختصر ہے مگر پل بھر کے لیے بھی یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اس مختصری زندگی میں ہزاروں قسم کے ایسے ایسے بدترین حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں کہ کہیں اپنے رشتوں سے [illegible]ت سی ہونے لگتی ہے...... تو کہیں حقیقی رشتوں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور ان حادثات کو انسان لاکھ کوششوں کے باوجود فراموش نہیں کرسکتا۔ یہ حادثات و واقعات انسان کو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح دکھ، تکلیف اور اذیت پہنچاتے رہتے ہیں۔ ہم ہر لمحہ دکھ، بے چینی، غم والم میں بتلا رہتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ انسان جو شکوۂ مختصر زندگی کرتا ہے وہ زندگی کو مزید مختصر کرنے کی دعائیں مانگتا ہے۔ وہ اس تکلیف دہ زندگی سے چھٹکارہ چاہتا ہے۔ ایسا ہی ایک دردناک واقعہ جو میرے علم میں ہے بہت دکھے دل کے ساتھ قلم کی زبانی بیان کر رہا ہوں۔

رمضان ایک ضعیف شخص تھا۔ اس کی تمام خوشیوں اور امیدوں کا واحد مرکز اس کا بیٹا تھا اور اس کے علاوہ رمضان کی زرعی زمین تھی جس کے ذریعے وہ اپنی بیوی، بیٹی سکینہ اور بیٹے احمد کی ضروریات زندگی پوری کر رہا تھا۔ لیکن علاقے کے چند بااثر لوگ اس کی زرعی زمین ہتھیانے کی مذموم کوشش میں تھے۔ ان بااثر لوگوں میں، رمضان کی زمین سے سب سے زیادہ دلچسپی شاہ زمان کو تھی، کیونکہ اس کی نظر اس زرعی زمین پر تھی۔ سو وہ اس کے آسان حصول کے لیے کئی مرتبہ سکینہ کے رشتے کے لیے رمضان سے بات کر چکا تھا لیکن رمضان اور اس کا بیٹا یہ جانتے تھے کہ شاہ زمان ایک عیاش، دھوکے باز اور حقیقی رشتون کی اہمیت سے ناواقف انسان ہے۔ وہ صرف اپنے مفاد پر ہی نظر رکھتا ہے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے اپنے حقیقی رشتوں کو فراموش کرنے والوں میں سے ہے۔

گاؤں کے لوگ سادگی پسند اور غیرت مند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے لپٹی ہوئی فرسودہ روایات کو ہمیشہ خود سے جوڑے رکھتے ہیں۔ یہ روایات انہیں وڈیروں، جاگیرداروں اور سرداروں کا حکم بجالانے اور ساری عمر ان کا خادم بنے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ سادگی اور نادانی دیکھ کر وڈیرے غیرت کا مفہوم ہی بدل دیتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے ہی الفاظ غیرت استعمال کرتے ہیں، یہ سادہ لوح انسان نہ صرف ان کی ہر بات کو سچ تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس پر عمل بھی آنکھیں بند کر کے کرتے ہیں۔ خواہ کتنی بھی محبت، پیار، خلوص، چاہت ایک دوسرے کے لیے ان کے دلوں میں ہو لیکن غیر حقیقی غیرت کی ایک چھوٹی سی چنگاری ان کے درمیان تمام نیازمندی، محبت وخلوص کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

شاہ زمان جو کافی عرصے سے رشتے سے انکار کے باعث ہونے والی اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے ایک دن یہ موقع اس وقت نکالا جب کہ احمد اپنی زمینوں کی طرف جا رہا تھا۔ شاہ زمان سیدھا گھر آیا اور اپنی بہن نجمہ کو کسی بہانے سے احمد کی زمینوں کی طرف کسی کام کے لیے بھیج دیا۔ نجمہ جیسے ہی احمد کی زمینوں کی طرف گئی پیچھے ہی شاہ زمان اپنے ماموں کے ساتھ چل پڑا۔ جب بے چاری نجمہ وہاں پہنچی تو اس کا سامنا احمد سے ہوا۔ بس یہی وہ وقت تھا جب شاہ زمان اور اس کا ماموں وہاں پہنچے اور دونوں کو عاشقی والے چکر کے الزام میں اسلحے کے زور پر پکڑ کر اپنی خالی حویلی میں لے آئے اور صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے انہیں کاروکاری کا نام دے دیا۔ نجمہ انتہائی حیرت سے اپنے بھائی اور ماموں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ جس بھائی کو وہ اپنی عزت کا وارث سمجھتی تھی وہی اسے دنیا میں بدنام کرے گا۔ جس ماموں کو وہ عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے وہی اسے یہ

بدنام موت دے گا۔

اس کے بعد کا منظر انتہائی دردناک تھا کہ ایک بہن اپنے بھائی اور ماموں کی درندگی سے پناہ مانگ رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ حویلی کے باہر گونگوں اور بہروں کا ہجوم تھا۔ شاہ زمان پر جھوٹی غیرت سوار تھی اور وہ کلہاڑی کے وار سے کبھی نجمہ تو کبھی احمد کو لہولہان کر رہا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس درندگی کو روکے، ہر کوئی بس یہی کہہ رہا تھا کہ ”یہ غیرت کا معاملہ ہے۔“

نجمہ کبھی اپنے بھائی تو کبھی اپنے ماموں کے سامنے ہاتھ جوڑتی وہ کبھی دروازے کی طرف دوڑتی تو کبھی ان ظالموں سے معافیاں مانگتی، اب انتہائی قیامت خیز منظر تھا کہ اس کے سگے بھائی نے ذاتی مفاد کے لیے اس پر کلہاڑی سے شدید وار کیا۔ وہ درد سے چلا اٹھی۔ ”بھائی ایسا ظلم مت کرو آخر میں تمہاری بہن ہوں۔“ لیکن بھائی کی نظریں تو بہن پر نہیں بلکہ اس کی موت کے بعد ہونے والے فائدے پر تھی۔ اس کے بعد اس کے ماموں نے اس پر شدید وار کر کے اس کی ایک ٹانگ جسم سے علیحدہ کر دی تھی۔ نجمہ نے شدید تکلیف اور رواں آنسوؤں سے اپنے باقی ماندہ وجود کو سمیٹتے ہوئے التجا کی تھی۔

”ماموں! خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ میں اپنے ادھورے وجود کے ساتھ زندگی گزار دوں گی۔ میری جان بخش دو۔“ لیکن ان درندوں میں انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں تھی۔ انہوں نے احمد اور نجمہ دونوں کو پے در پے وار کر کے قتل کر دیا اور فرار ہو گئے۔ پولیس آئی میڈیکل رپورٹ جب سامنے آئی تو دونوں بے گناہ ثابت ہوئے لیکن پھر بھی ظالموں نے نجمہ کو بے نام قبر کے حوالے کر دیا اور احمد کا بوڑھا والد سب کچھ جانتے ہوئے بھی انصاف نہ پا سکا۔ کیونکہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ انصاف مانگنے پر اس کے گھر کے باقی افراد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

چند ماہ بعد شاہ زمان کے ماموں نے خود کو پولیس کے حوالے کرتے ہوئے تنہا ہی اقبال جرم کرلیا تھا...... اور اسے عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ ادھر شاہ زمان نے قبائلی معتبرین سے رجوع کیا او پھر ایک جرگے کا انعقاد کیا گیا جہاں شاہ زمان نے جھوٹے گواہ بھی پیش کیے اور ان ظالم حاکموں نے یہ فیصلہ دیا کہ...... اس معاملے میں شاہ زمان کا نقصان رمضان سے بڑھ کر ہوا ہے، کیونکہ ایک تو اس کی بہن ماری گئی اور دوسرا اس کا ماموں جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ تیسرا اس کی بے عزتی بھی ہوئی ہے جب کہ رمضان کو صرف بیٹے کا نقصان ہوا ہے اس لیے اب یا تو رمضان اپنی بیٹی کا رشتہ شاہ زمان کو دے یا پھر دشمنی کے لیے تیار رہے۔ اس جرگے کے بکے ہوئے ٹھیکیداروں نے ایک مجبور بوڑھے کی مجبوری اور کمزوری کا مذاق اڑایا تھا اور بوڑھا رمضان نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیٹی کی شادی اپنے معصوم و بے گناہ بیٹے کے قاتل کے ساتھ کر دی تھی۔

چند ماہ کے اندر اندر شاہ زمان نے اپنی بیوی اور اپنے سسر پر زور دے کر خون معاف کرنے کی صورت اپنے ماموں کو بھی باعزت بری کروایا تھا اور طاقت، جہالت اور ظلم کے بل بوتے پر ان کی زمین پر بھی قبضہ کرتے ہوئے ظلم وجہالت کی ایک نئی کہانی رقم کر دی تھی۔

☆......☆

کاروکاری کے جھوٹے الزام میں قتل ہونے والے احمد کے بوڑھے والدین آج انتہائی تنگدستی، مفلسی اور دکھ و پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہیں جب بھی اپنی بیٹی پر ہونے والے ظلم اور اپنے بے گناہ و معصوم بیٹے کی یاد شدت سے آتی ہے تو ان کی آنکھوں سے کبھی نہ تھمنے والے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM
جیو سہیلی

موبائل کی مہربانیاں

ایسی جان سوز کہانیاں جنہوں نے اس ایجادِ جدید کے ذریعے جنم لیا

ایڈیسن ادریس مسیح

ایک تارِ عنکبوت

سید معین اختر نقوی کا خیال

سینے میں اِک گھٹن سی اترتی چلی گئی
ہر سانس اپنے آپ ہی مرتی چلی گئی

دورِ جدید کی ایجاد موبائل کی فتنہ سامانی سے جڑی رودادِ غم

2007ء کی ایک حبس زدہ گرم دوپہر......

ملیرندی کے قریب مدینہ کالونی' قائد آباد کے اس نیم پختہ مکان میں آج پھر چاروں دوست جمع تھے۔ تیز آواز میں بے ہنگم میوزک چل رہا تھا' گوشت بھونا جارہا تھا' شراب چل رہی تھی' تاش کی بازی عروج پر تھی' آج سب مست تھے' اپنی کامیابی کے غرور میں جشن منا رہے تھے' کل کی وارداتوں میں تگڑا مال ہاتھ آیا تھا۔

''ابے' فون دیکھ' کس کا ہے؟'' شاہد نے عبدالرحمان عرف کامی کی توجہ اس کے نہایت قیمتی' چھینے ہوئے موبائل کی طرف دلائی۔ اسی اثناء میں بیل بند ہوچکی تھی۔ اجنبی نمبر سے موصول ہونے والی مسڈ کال پر کامی کا ماتھا ٹھنکا۔

''کون ہے بے بھین...... آواز بند کر یار۔''

کامی نے کال بیک کرتے ہوئے کہا۔ اسلم جو ڈیک کے قریب تھا' ہاتھ بڑھا کر آواز بند کردی۔ موبائل پر بیل جارہی تھی' دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہیں ملا' دوبارہ کال ملانے پر فون اٹھالیا گیا تھا۔

''ہیلو......کون؟'' کامی نے قدرے مہذب انداز اختیار کیا تھا۔

''جی......وہ......میں......وہ......'' کوئی لڑکی تھی' بے حد گھبرائی ہوئی' دیہاتی آواز والی۔ کامی کے پھیلے پھیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود آئی۔

''جی' کہیے' میں سن رہا ہوں۔'' کچھ ایسی مٹھاس بھرے لہجے میں بولا گیا کہ ارشد' اسلم اور شاہد مسکرا کر رہ گئے۔

''وہ......دراصل......''

''دیکھیے میرا نام کامی ہے' کامی' آپ پلیز' مجھے



میرے نام سے پکاریئے پلیز۔''

''مگر میں تو آپ کو نہیں جانتی؟''

''لیکن مس' مسڈ کال تو آپ ہی کی تھی۔''

''وہ......دراصل میں کسی اور کا نمبر ملا رہی تھی تو آپ کا نمبر غلطی سے لگ گیا۔''

''اچھا......جی...... ویسے کچھ غلطیاں بڑی حسین ہوتی ہیں' آپ کی آواز کی طرح۔''

''جی......کیا مطلب ہے آپ کا؟'' ذرا ترش لہجے میں پوچھا گیا۔

''تعریف کی ہے جناب کی آواز کی۔ ماشاءاللہ' بہت خوبصو......''

''خدا حافظ!'' کہہ کر دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا تھا...... اگلے ہی لمحے سب دوستوں کے چھت پھاڑ قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔

''ابے' بہت حرامی ہے یار' کیسا پٹا رہا ہے بچی کو' داد دیتے ہیں تیری' شہزادہ ہے یار' شہزادہ۔''

•......•......•......•

وہ زیادہ تر اپنا موبائل silent پر ہی رکھتی تھی اور بہت کم کسی کو فون یا میسج کرتی تھی۔ اس روز غلطی سے ایک نمبر لگ گیا تھا' جان عذاب کردی تھی اس لڑکے نے' ہر گھنٹے' ڈیڑھ گھنٹے بعد چار چھ بار متواتر کال کرتا تھا اور sms تو ان گنت موصول ہورہے تھے۔ آج اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ فون ریسیو کر کے ٹھیک ٹھاک سنادے گی کم بخت کو......

''ہاں' نہیں تو......اتنی بھی تو فارغ نہیں ہوں کہ اس کے فضول messages ہی پڑھتی رہوں۔ اس نے سر جھٹکا تبھی اس کا موبائل vibrate کرنے لگا۔ اس نے دیکھا' وہی نمبر تھا۔ اِدھر اُدھر صورت حال کا جائزہ لیا' قریب کوئی نہیں تھا۔ اس نے فون ریسیو کرلیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' کامی شروع ہوچکا تھا۔

''آپ کو ذرا سا بھی احساس ہے کہ کوئی کتنی شدت سے آپ کی آواز سننے کا منتظر ہے؟ حد ہوتی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''دیکھیں' میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔'' وہ بمشکل بس یہی کہہ سکی تھی۔

''کس قسم کی' میں نے آپ کو ایسا ویسا کیا کہا ہے؟ خدا نے آپ کو خوبصورت آواز سے نوازا ہے' سن کر ہمارے دل کی کلی کھلتی ہے تو کیا ہرج ہے؟ انسان کی زندگی کا مقصد اپنی ذات سے دوسروں کو خوشی دینا ہوتا ہے نا کہ انتظار کی سولی پر لٹکا کر سسکاتے رہنا۔''

اس بے چاری کے پاس جواب نہ بن پایا' بڑا تیز لڑکا تھا' خوب خوب باتیں کرتا تھا۔ ''دیکھیں' آپ جو کوئی بھی ہیں......''

''کامی...... کامی نام ہے میرا۔ پہلے بھی بتایا تھا' بھول گئیں آپ ہاں' ہمیں یاد بھی رکھیں تو کیسے' آپ تو آپ ہیں' ہزاروں چاہنے والے ہوں گے۔ ایک ہم کیا' ہماری اوقات کیا' ویسے آپ کا بھی تو کوئی خوبصورت سا نام ہوگا ناں؟''

''صائمہ۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نام پھسل گیا تھا۔

''صائمہ' صائمہ جی' بہت ہی خوبصورت نام ہے ماشاءاللہ! مجھے تو ویسے بھی فلم اسٹار صائمہ بہت پسند ہے' آپ یقیناً اس سے زیادہ خوبصورت ہوں گی۔''

''جی' میں فلمیں نہیں دیکھتی۔''

''او کے' اچھی بات ہے' ٹائم بہت برباد ہوتا ہے' ویسے میرے ساتھ تو دیکھیں گی ناں فلم؟ میں دکھاؤں گا آپ کو۔''

''نہیں' کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیوں ضرورت نہیں بھئی؟'' کامی نے روٹھنے والے انداز میں کہا۔

''بس ویسے ہی مجھے نہیں پسند۔''

''مجھے تو ہے ناں' دل رکھنے کو ہی ہاں کردو' ویسے بھی اب ہم دوست ہیں' اتنا تو احساس کرو' میرا دل بہت نازک ہے یار۔''

''دیکھیں کامی' آپ بہت پھیل رہے ہیں' ہم کیسے دوست ہو سکتے ہیں؟ آج ہی تو بات ہوئی ہے ہماری اور میں تو آپ کو جانتی تک نہیں ہوں؟''

''دیکھیں صائمہ جی' دوستی کے لیے جاننا ضروری نہیں ہے' پہلے دوستی ہو جاتی ہے' جانتا بندہ ساتھ رہتے رہتے ہے' ایک دوسرے کے مزاج مل جائیں تو یاری پکی ورنہ سب ختم۔''

''عجیب بات ہے؟''

''ہاں' ہے تو عجیب بات مگر صائمہ جی' سچ تو یہی ہے کہ آج آپ کے منہ سے اپنا نام سن کر بہت اچھا لگا ہے۔ آپ کے خوبصورت ہونٹوں سے چھو کر میرا نام کتنا انمول ہوگیا ہے ناں؟''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟'' وہ شرما گئی تھی۔

''آپ کو اگر برا لگا تو لگا کرے' یہ سچ ہے صائمہ جی' اور مجھے سچ کا اظہار کرتے ہوئے بالکل شرم نہیں آتی۔''

''اچھی بات ہے' اب میں فون بند کردوں؟''

''اگر مجھ سے پوچھ رہی ہیں تو یہی کہوں گا کہ نہیں' کبھی نہیں' ساری زندگی اسی طرح مجھ سے بات کرتی رہو۔ آپ جب بولتی ہو تو لگتا ہے' پھول کھل رہے ہوں' زخم سل رہے ہوں جیسے...... جیسے ہوائیں۔''

''اچھا' اچھا' زیادہ فری نہ ہوں' مجھے پتہ ہے کہ میں کیسی ہوں۔''

''نہیں صائمہ جی' نہیں' آپ کو نہیں پتہ کہ آپ کیا ہو' یہ تو میں بتاؤں گا کہ آپ درحقیقت ہو کیا؟''

''اچھا تو پھر بتایئے؟''

''اس طرح نہیں' کسی روز ٹائم نکالیں' مل کر سامنے سے بتاؤں گا' ایسے مزہ تھوڑا ہی نہ آئے گا۔''

''نہ بابا' بہت مشکل ہے۔''

''کچھ مشکل نہیں' جہاں بتائیں گی' میں پک کرلوں گا۔''

''اچھا تو یہ سروس بھی ہے' ویسے آپ رہتے کہاں ہیں؟''

''لانڈھی...... اور آپ؟''

''لانڈھی...... یہ کہاں ہے؟''

''یہ کراچی میں ہے' آپ کہاں رہتی ہو؟''

''میں...... میں تو پنجاب میں رہتی ہوں' ڈیرہ غازی خان میں۔''

''تو کیا ہوا' ہیں تو اسی دنیا میں ناں' میں پہنچ سکتا ہوں' آپ ایک......''

بس اسی پر لائن کٹ گئی تھی' شاید اس کا بیلنس ختم ہوگیا تھا۔ صائمہ کی دھڑکن بہت تیز تھی' پورے بدن پر ہلکا پسینہ تھا' عجب سرشاری سی طاری تھی۔ ''اف' کتنے مزے کی باتیں کرتا ہے یہ لڑکا۔'' اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اب خود اس کو فون کرے۔

''صائمہ...... !صائمہ......!'' امی آواز دے رہی تھیں' اس نے گھبرا کر موبائل ہی بند کردیا۔

•......•......•

پھر یوں ہوا کہ یہ سلسلہ چل نکلا۔ ڈیرہ غازی خان کے چھوٹے سے قصبے میں رہنے والی صائمہ جس نے دنیا صرف اپنے گھر کی چار دیواری کی حد تک ہی دیکھی تھی' کامی جیسے گھاگ شکاری کے لیے اسے اپنے جال میں پھنسانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہی تو تھا۔ ابتدا میں وہ گریزاں رہی مگر زیادہ عرصے تک اس کا یہ بھرم برقرار نہ رہ سکا۔ صرف ڈھائی مہینے ہی کی قلیل مدت میں وہ اس کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوب چکی تھی' بنا دیکھے' بنا سمجھے' صرف آواز ہی کے سحر میں ڈوب کر وہ اس کی لچھے دار باتوں میں پھنس چکی تھی اور اسے لگتا تھا' اسے ہفتِ اقلیم مل گیا ہو۔ محبتوں کو ترسی ہوئی لڑکیوں کی زندگی میں عموماً سراب سفر لکھے ہوتے ہیں...... کامی جی بھر کر اپنے دوستوں میں اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

''ہونہہ' بڑی نیک پروین بنتی تھی سالی' ابے' ایسی ایسی پرائیویٹ باتیں کرتا ہوں' یقین کر کوئی شوہر بھی کیا کرتا ہوگا۔''

''ابے' باتوں سے کب تک پیٹ بھرتا رہے گا بھین......'' کوئی کمینہ آنکھ دبا کر کہتا تو اس کی انا پر جیسے ضرب پڑتی۔

''بس دادا...... تو ٹینشن نہ لے' تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر...... جو تو بول...... ہاہاہا......'' زبردست قہقہہ پڑتا۔

''ڈز...... ڈز...... جھولے لعل...... دے خوشیاں تے غم ٹال۔'' ارشد منا جب ترنگ میں ہوتا تو یہی نعرہ لگاتا تھا۔

•......•......•

''یار' ایک بات کہوں؟''

''جی' بولیے۔''

''یار' اب رہا نہیں جاتا تمہارے بغیر۔''

''اچھا جی...... ہاہا......''

''کب مٹاؤ گی یہ دوریاں؟ کب میں تمہیں ہاتھ بڑھا کر چھو سکوں گا' میری جان' کب؟'' دنیا جہان کی بے تابیاں اپنے لہجے میں سمو کر کامی نے کمال اداکاری کی۔

''ہاں تو میں نے کہا تو تھا کہ یہاں آ جاؤ ڈیرہ غازی خان' ابا سے میرا ہاتھ مانگ لو۔''

''کیسے آؤں میری جان' لاکھوں کا بزنس صرف میرے سر پر ہے۔ سچ کہوں تو سر کھجانے کی فرصت نہیں' تم ہی کوئی صورت نکالو۔''

''میں کیا کروں؟''

''تم آ جاؤ ناں' کراچی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں...... میں کیسے آ سکتی ہوں؟"

"کیا مسئلہ ہے جان، دیکھو تم نے کہا تھا ناں کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے، یہاں میرے ساتھ عجیب مسئلہ ہے، امی اپنی بہن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور ابو اپنی اور میں صرف اور صرف تمہیں ہی اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں یعنی ہماری شادی ہمارے گھر والوں کی مرضی سے تو ہو نہیں سکتی پھر ہمیں ہی کچھ......"

"پلیز کامی......"

"حقیقت کا سامنا تو کرنا پڑے گا جاناں...... ہمارا ملن دوسری کسی صورت ممکن نہیں ہے۔"

"تو پھر چھوڑو سارا بزنس اور آ کر مجھے لے جاؤ۔"

"کہا ناں، میری جان، آ سکتا تو دوسری سانس آنے جتنی دیری بھی نہ کرتا۔"

"آ جاؤ ناں، کیا کرو گے اتنا کام کر کے؟"

"کام نہیں کروں گا تو تمہارے شایان شان محل کیسے تعمیر ہو سکے گا میری جان؟ میں نے اپنے عشق میں شاہ جہاں سے ٹکر لینے کا سوچا ہے۔"

"نہیں کامی، مجھے تاج محل نہیں چاہیے، بس چھوٹا سا گھر ہو، تمہارا بہت سارا پیار اور...... اور بس۔"

"یار پلیز، میرے جذبے کو اور ہوا مت دو جان، میرے لیے تو ویسے بھی ایک ایک لمحہ کاٹنا عذاب ہے۔ سوچتا ہوں، ابو سے بات کروں، اپنی محبتوں کے چکر میں ہماری واٹ تو نہ لگائیں۔"

"واٹ کیا ہوتا ہے؟"

"واٹ...... ہاہاہا...... واٹ مطلب، بیڑہ غرق کرنا، یہ کراچی کی لینگوئج ہے، سب سکھا دوں گا، آخر کو تمہارے سسرال کی زبان ہے۔"

....

پتہ نہیں کیسے بے اختیار لمحے تھے جب اُس کے قدم اٹھ گئے تھے۔ اتنی بہادر تو وہ کبھی نہیں تھی۔ کئی بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ واپس پلٹ جائے مگر کامی کا مسلسل اصرار، اس کے روٹھ جانے کا ڈر، مستقبل کے حسین سپنے، پیار پانے کا سلگتا احساس، پتہ نہیں کیا کیا، اس کے قدم بس بڑھتے ہی گئے...... بسوں کے اڈے پر پہنچ کر اس کا ذہن جیسے بالکل سپاٹ ہو چکا تھا۔ وہ بدنصیب اعتبار کے کچے دھاگے سے کھنچی چلی آئی تھی، سب کشتیاں جل چکی تھیں، اب بس آگے ہی کا سفر باقی تھا، ابھی کچھ وقت اور حالات کے دھارے پر تھا، جس طرف بھی لے جائیں، راستوں کی مرضی ہے۔

وہ بس میں بیٹھ گئی، دل بہت بری طرح دھڑک رہا تھا، آنکھ میں آتے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس نے کالا چشمہ پہن لیا تھا۔ نقاب تو ویسے بھی تھا ہی، اسے پہچاننا اب مشکل تھا۔ یوں بھی اب شاید وہ اپنی پہچان کھونے جا رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے رہ جانے والے اپنے شہر کو دیکھا۔

"خدا حافظ! اماں......!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ سسک اٹھی اور اپنا سر کھڑکی سے ٹکا دیا تبھی اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس کے بھائی کا فون تھا۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

ایک لمحے اس کا دل چاہا کہ وہ فون اٹھا کر بتا دے کہ وہ کہاں ہے، اسے لے جائیں پھر اگلے ہی لمحے خوف کی سرد لہر اس کے رگ و پے میں رینگ گئی۔ اسے اپنی خون میں لت پت لاش نظر آنے لگی۔

اس نے بے حسی سے اپنے آنسو نگلے اور لائن کاٹ دی، فوراً ہی موبائل دوبارہ گونجنے لگا۔ کامی کا فون تھا، اب اس نے بجلی سی تیزی سے فون اٹھا لیا۔ وہ مسلسل اس سے رابطے میں تھا۔

....

سہراب گوٹھ الآصف اسکوائر پر بس سے اترتے

ہوئے صائمہ کو بالکل احساس نہ تھا کہ وہ ماں کے شفیق پہلو کو چھوڑ کر کتوں اور بھیڑیوں کے جنگل میں اتر آئی ہے۔ اسٹاپ پر کامی پہلے سے موجود تھا۔ فون پر بات کر کے ایک دوسرے کو پہچانا اور پھر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔ کئی منٹوں کی خاموشی کو بالآخر صائمہ کی سسکیوں نے توڑا۔

"پاگل تو نہیں ہو، ہم ٹیکسی میں بیٹھے ہیں۔"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کامی......"

"فکر نہ کرو جان، اب تو سارے فاصلے ہی سمٹ گئے ہیں، یہ لمحات تو خوشی کے ہیں جاناں، روتے نہیں اس طرح۔"

صائمہ نے اثبات میں سر ہلا کر آنکھیں پونچھ ڈالیں جبکہ کامی ٹیکسی ڈرائیور کو شاید رستہ سمجھانے لگا۔ جلد ہی گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کھانے کے دوران کامی مسلسل اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا۔ صائمہ اب قدرے محفوظ خیال کر رہی تھی خود کو۔

"گھر کب چلیں گے کامی؟" صائمہ نے کوئی تیسری بار پوچھا تو کامی نے جیسے اپنی گھڑی میں وقت اور پھر باہر روڈ پر پھیلتی تاریکی کو دیکھا۔

"بس چلتے ہیں۔" اس نے لاپرواہ انداز میں کہا اور سگریٹ سلگا لی۔ صائمہ سرشار ہو گئی، اسے سگریٹ پیتے ہوئے مرد بہت اچھے لگتے تھے۔

"تم بیٹھو، میں بل کلیئر کر دوں۔" کامی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ادائیگی سے فارغ ہو کر کامی نے اپنے دوست کو فون کر کے مطلع کیا اور پھر صائمہ کو لے کر دوبارہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔

چار سو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اب وہ اسے لے کر اپنے کوارٹر میں جا سکتا تھا تاکہ مکینوں کی نظر میں نہ آئے ورنہ سوال اٹھ سکتا تھا۔ چار چھڑوں کے گھر میں اچانک لڑکی کی آمد مشکوک تھی...... لکڑی کا

میں رو پڑتا ہوں

کالی اندھیری رات میں
جب یاد تمہاری آتی ہے
چپکے سے اس دل میں
اک درد کی شہنائی بجتی ہے
تب تنہائی میں رو پڑتا ہوں
تجھے یاد بہت میں کرتا ہوں

وفا صدام حسین۔ حیدرآباد

دروازہ کھول کر جب وہ لوگ اس کچے صحن والے مکان میں داخل ہوئے تو صائمہ کی چھٹی حس بیدار ہو کر خطرے کی گھنٹیاں بجانے لگی...... کامی کے تینوں دوست ایک ایک کر کے باہر آئے تو صائمہ بری طرح گھبرا گئی۔

"ارے...... ارے...... کیا ہوا، دوست یار ہیں، بس چلے بھی گئے۔ عورت نہیں تھی گھر میں تو سب کی بیٹھک بنا ہوا تھا۔ اب تو مالکن آ گئی ہے بھئی، گھر بھر کی۔"

"ہاں...... آں...... ں۔" بے بسی سے صائمہ کے منہ سے فقط یہی نکل سکا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا، کامی کے تینوں دوست باہر نکل چکے تھے۔ کھلے دروازے کے باہر گاڑھا اندھیرا تھا۔ صائمہ کا ذہن بھی تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

....

گزشتہ چھ دنوں میں صائمہ نے ان گنت مرتبہ اپنے مرنے کی دعا مانگی تھی۔ زندگی اس قدر بھیانک روپ اختیار کر سکتی ہے، فون پر میٹھی میٹھی باتیں کرتے وقت کب اس نے ایسا سوچا تھا۔ آج چھٹا دن تھا اُس سانولی رنگت کی پرکشش لڑکی کو مسلسل اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنتے، نہ آسمان گرا نہ ہی زمین پھٹی، آس پڑوس میں کسی کو کیا خبر ہوتی، اس بے چاری کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمہ وقت منہ میں کپڑا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



ٹھونسے رکھا جاتا تھا جو صرف اسی وقت نکلتا جب ہوس کے پجاریوں کو اس کے لمحہ لمحہ مرتے جسم سے کچھ اور لہو پینا ہوتا تھا۔ اس دوران تیز میوزک اور اسلحہ اس کی آوازوں کو دبائے رکھتا۔ خدا جانتا ہے' کتنی دفعہ اس نے کامی کے پیر پکڑے ہوں گے' محبت کے واسطے دیئے ہوں گے کہ وہ اس سے شادی کر لے مگر کامی کا بدکار ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔

چھ روز تک مسلسل جنسی تشدد کا نشانہ بننے کے بعد اب وہ بقول کامی' ان کے کسی ''کام'' کی نہیں رہی تھی لہٰذا قائد آباد' گوشت گلی سے دو خالی بوریاں لا کر اس کا گلا کاٹ کر لاش بوری میں موڑ توڑ کر ڈالی گئی جس پر دوسری بوری چڑھا کر راتوں رات چاروں ملزمان نے گھر کے کچے صحن میں کھڈا کھود کر اس کی لاش کو دبا دیا۔ اس واقعے کے بعد بھی وہ دوست اس گھر میں رہائش پذیر رہے اور اکثر و بیشتر کامی کی فن کاریوں اور اپنی مشترکہ بدکاریوں پر ہنستے' فحش مذاق کرتے رہے۔

شہر بھر میں چھوٹی بڑی ڈکیتیاں بھی ہوتی رہیں اور رفتہ رفتہ صائمہ ان کے لیے گزرا کل بن گئی' قصہ پارینہ..... مگر میرا یقین ہے' ڈیرہ غازی خان کے کسی قصبے میں بدنصیب صائمہ کی برباد ماں کے بوڑھے ہاتھ روز دُعا کے لیے اٹھتے رہے ہوں گے اور اس کی آنکھیں اپنی بیٹی کے انتظار میں مزید بوڑھی ہوتی رہی ہوں گی..... واقعے کے تقریباً تین ماہ بعد ملزمان نے وہ گھر چھوڑ دیا۔

•.....•.....•.....•

بدھ 30 جون 2010ء

صائمہ کے قتل' انسانی جذبات کے ساتھ اس سنگین کھلواڑ کی واردات کے پورے تین برس بعد..... قائد آباد' مدینہ کالونی کے اسی مکان میں دو سفاک ملزمان کو پولیس کی بھاری نفری میں لایا گیا جنہیں زمان ٹاؤن پولیس نے خفیہ اطلاع پر کورنگی سیکٹر 51-C میں واقع جنجال پورہ سے گرفتار کیا تھا۔

عام خیال یہی تھا کہ پکڑے جانے والے ملزم کا تعلق کسی ڈکیتی گروپ سے ہے مگر دورانِ تفتیش ملزم کامی نے اپنے دیگر ساتھیوں کی نشاندہی کے ساتھ صائمہ کے قتل کا بھی اعتراف کر لیا تھا..... انسپکٹر عارف عثمان' پولیس سرجن ڈاکٹر حامد پریال' ڈاؤ میڈیکل کے ڈاکٹر فرحت مرزا اور کورنگی کی ایڈیشنل سرجن فریدہ ایاز کی نگرانی میں پورے تین سال بعد اس گڑھے سے بدنصیب صائمہ کی لاش برآمد کر لی گئی جو اب محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی..... بعد ازاں صائمہ کے موبائل نمبر کا ریکارڈ نکلوایا گیا تاکہ اس کے گھر کا ایڈریس مل سکے مگر وہ سم صائمہ کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھی لہٰذا ڈیرہ غازی خان کے پولیس افسران کو فون کر کے انٹری کروا دی گئی کہ وہ مقتولہ کے لواحقین سے رابطہ کریں..... خدا کرے کہ پولیس کا رابطہ کبھی لواحقین سے نہ ہو پائے ورنہ نازوں پلی بیٹی کا عبرت ناک انجام سن کر کیا ماں باپ اور دیگر پیار کرنے والے حواس پر قابو رکھ پائیں گے؟

قارئین.....! ممکن ہے' آپ میں سے بہت سے لوگوں نے اس واقعہ کو اخبارات میں پڑھا ہو۔ میرا اس دردناک واقعے کو کہانی کا روپ دینے کا مقصد اس کہانی میں چھپے خاموش پیغام کو ان تمام افراد تک پہنچانا ہے جو دن رات اپنے بچوں کے موبائلز کی ٹوں ٹوں سنتے ہیں مگر زندگی کے دروازے پر دستک دیتی موت کی اُس آواز پر کان نہیں دھرتے۔ خدا نہ کرے' ایسا کچھ کسی دشمن کے ساتھ بھی ہو مگر..... کیا احتیاط لازم نہیں؟



پراسرار کہانیاں

عقل کو گُند کر دینے والی ایسی کہانیاں جن پر دل اور ذہن یقین نہیں کرتا

شوکت عثمان احمد سعدی

دو مسافروں کا سفر

حزیں صدیقی کا خیال

جب حقیقت فسانہ بن جائے
کیا حقیقت کسی فسانے کی

دو مسافروں کا قصہ عجب جو عالمِ ارواح سے آئے تھے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گرمی کی دوپہر ڈھلنے لگی تھی اور ارہر کے کھیت میں پڑتے ہوئے سائے آہستہ آہستہ لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اسی ڈھلتی دوپہر میں کشٹیا ضلع بورڈ کی سڑک پر ایک مسافر کہیں جا رہا تھا۔ اس نے گیروے رنگ کا تہہ بند اور صدری پہن رکھی تھی۔ لمبوترے چہرے پر گھنی سفید داڑھی تھی اور ہاتھ میں اک تارا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا' اس کی نگاہیں راستے پر نہیں تھیں بلکہ راستے سے دور کہیں کھوئی ہوئی تھیں۔ گرمی کی تیز دھوپ میں ہر چیز جھلس کر رہ گئی تھی۔ اس جھلسے ہوئے رنگ کا حسن بیراگی کے دل کے رنگ سے مشابہ تھا شاید اسی لیے وہ اسے دیکھتا ہوا راستہ طے کر رہا تھا۔ گاہے گاہے اَنجانے میں اس کی انگلی اک تارے کے تار سے ٹکرا جاتی اور اس کی ٹنگ ٹنگ کی آواز دھوپ سے تپتی ہوئی فضا میں ہلکی سی چیخ بن کر گونج اٹھتی مگر یہ گویا اس کی لاعلمی میں ہو رہا تھا کیونکہ مسافر کا دل تو اس وقت اک تارے کی موسیقی سے کہیں دور بھٹک رہا تھا' کسی دوسری دنیا کی سیر کر رہا تھا۔ راستے میں سایہ دار درخت بھی تھے لیکن مسافر ان درختوں کے سائے میں رکے بغیر چلا جا رہا تھا وہاں سے تقریباً تین میل کی دوری پر ایک گاؤں تھا' شاید وہی مسافر کی منزل تھی۔

پہلے مسافر کے پیچھے پیچھے ایک دوسرا مسافر بھی اسی راستے پر چل رہا تھا۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا' وہ آگے جاتے ہوئے مسافر کے قریب پہنچنا چاہتا ہے۔ پہلے مسافر کو آواز دے کر روکا جا سکتا تھا مگر دوسرا مسافر شاید آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے مسافر کا چہرہ روکھا سوکھا سا تھا اور اس کی مونچھ اور اس کے دونوں بازوؤں کے بال سیاہ تھے۔ چہرہ چوڑا تھا اور آنکھیں گول تھیں۔ اسے دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ حکم دینے کا عادی رہا ہو' حکم کی تعمیل کا نہیں۔ راستے کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ہم سفر سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی' شاید اسی لیے وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ تیز چلنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر تھکن کے آثار ابھر آئے تھے پھر بھی اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی' وہ تیز تیز چلتا رہا۔ ذرا قریب پہنچ کر دوسرے مسافر نے پہلے کو آواز دی۔ ''بھائی صاحب......!''

پہلے نے پیچھے مڑ کر دیکھا' دوسرے مسافر کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''کیا آپ نے مجھے آواز دی ہے؟''

''جی ہاں۔'' دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' پہلے مسافر نے جواب دیا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' دوسرے مسافر نے پوچھا۔

''وہ جو سامنے آبادی نظر آ رہی ہے' وہیں جانا ہے مجھے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' دوسرے مسافر نے کہا۔ ''میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔''

''چلیے پھر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔'' پہلے مسافر نے خوشی کا اظہار کیا۔

راہ میں ہم سفر مل جائے تو راستے کی طوالت کا خوف دل سے نکل جاتا ہے' شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر داڑھی والے مسافر کی نگاہیں دور خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ مونچھوں والے مسافر کی نگاہیں بار بار اپنے ہم سفر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ گرمی کے دنوں میں دور افق پر بہت تیز روشنی دکھائی دیتی ہے۔ افق کا یہ حال ہمیشہ نظر نہیں آتا۔ دوسرا مسافر بار بار اپنے ہم سفر کی طرف دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی نگاہوں کی جستجو کیا ہے اور وہ دور افق پر نظریں جمائے

کیا دیکھ رہا ہے۔ دوسرے مسافر نے کئی بار دور افق کی طرف دیکھا پھر پہلے مسافر کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نظریں پھیر لیں۔

پہلا مسافر خاموشی سے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔

دوسرے مسافر کو اس کی خاموشی اچھی نہیں لگی۔ آپس میں باتیں ہی نہ ہوں تو ہم سفری کیسی؟ اس نے خاموشی توڑنے کے لیے بلند آواز میں پہلے مسافر سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب' آپ گانا گا سکتے ہیں؟''

پہلا مسافر محویت سے چونک اٹھا۔ ''آپ نے مجھ سے کچھ کہا بھائی صاحب؟''

''جی ہاں۔'' دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

پہلا مسافر دوسرے مسافر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کہیے؟''

''آپ گانا گاتے ہیں کیا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''جی ہاں' گانا گاتا ہوں۔''

''تو پھر کوئی گانا سنائیے نا؟'' دوسرا مسافر بولا۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔''

''زحمت کی کیا بات ہے؟'' پہلے مسافر نے کہا۔ ''سننا چاہتے ہیں تو سنیے۔''

گیروے لباس والے نے اک تارا سنبھال لیا اور گانے لگا۔

میں نے دل کے دریا میں ایک عجب تماشا دیکھا
جسم کے اندر ایک گھر ہے
اس گھر میں چور گھس آیا ہے
چھ آدمیوں نے مل کر نقب لگائی ہے
ایک آدمی نے چوری کی ہے
جسم کے اندر ایک باغ ہے
اس میں مختلف اقسام کے پھول کھلے ہیں
پھولوں کی خوشبو سے ساری خلقت دیوانی ہو گئی ہے
لیکن لالن کا دل دیوانہ نہیں ہوا

نغمے اور موسیقی کے آبشار سے سنسان میدان نے ہونٹوں میں پانی بھر کر اپنی پیاس بجھالی۔ دھوپ کی حدت پرے ہٹ گئی اور سُروں کے اندر ساری دنیا ملفوف ہو گئی۔ گانا کب ختم ہوا' محسوس ہی نہیں ہوا۔

دوسرے مسافر نے اس سکوت میں اپنی آواز کا پتھر پھینکا۔ ''واہ وا' آپ تو بہت اچھا گاتے ہیں۔''

''جی......'' پہلے مسافر نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کا نغمہ بھی خوب تھا۔'' دوسرے نے تعریفی انداز میں کہا۔

''جی' بس یہی کچھ مجھے آتا ہے۔''

''نہیں' نہیں' سچ مچ آپ کی آواز میں بلا کا لوچ اور درد ہے۔'' دوسرا مسافر بولا۔ ''میں نے ایسا نغمہ پہلے کبھی نہیں سنا۔''

''کبھی نہیں سنا؟'' پہلے مسافر نے حیرت سے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔'' پہلا مسافر مسکرایا۔

دونوں کے درمیان مزید گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ دونوں پھر تیز قدم بڑھانے لگے تاکہ جلد از جلد منزل پر پہنچ سکیں۔

میدانی علاقہ ختم ہو گیا اور دونوں آبادی کے قریب پہنچ گئے۔ چاروں طرف درختوں کی قطاریں تھیں اور درختوں کے درمیان مکانات کھڑے تھے۔ پختہ عمارتیں اور ٹین کے گھر دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگ گھروں سے نکل کر اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ یہ دونوں آگے بڑھتے گئے مگر کسی نے ان دونوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ''چلو' اتنی دیر بعد کچھ آدمی تو نظر آئے۔'' پہلا مسافر بڑبڑایا۔

دونوں ایک دوراہے پر جا کر رک گئے۔ راستے کے دونوں طرف دور تک زمین خالی تھی' اس کے بعد متمول لوگوں کے مکانات اور تالاب تھے۔ ایک جگہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ساتھ کئی عمارتیں تھیں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کا ایک بڑا سا باغ تھا۔

اس طرف نگاہ پڑتے ہی دوسرے مسافر نے اپنے بیراگی ہم سفر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''جلدی ادھر آیئے' وہ دیکھیے' وہ میرا گھر دکھائی دے رہا ہے' وہ میرا باغ ہے اور اس کے چاروں طرف جتنی زمینیں پھیلی ہوئی ہیں' وہ سب میری کاشت کی زمینیں ہیں۔ اس طرف آیئے' وہ جو ناریل کے پیڑوں کی لمبی قطار دکھائی دے رہی ہے نا' آپ ان پیڑوں کے ایک ناریل کا پانی پی لیں تو سات دن کی پیاس بجھ جائے گی۔''

پہلے مسافر کو کوئی جواب دینے کا موقع نہیں ملا۔ اس کا ہاتھ دوسرے مسافر کی مٹھی میں تھا اور وہ اسے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ دونوں ایک پختہ کنارے والے تالاب کے پاس جا کر رک گئے۔ تالاب کے کنارے ناریل کے سیکڑوں پیڑ تھے۔

دوسرے مسافر نے کہا۔ ''آپ اس پیڑ کے سائے میں بیٹھ جایئے۔ میں ناریل توڑنے کا انتظام کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ میرا ہے' یہ تالاب' یہ باغ باغیچہ' یہ پختہ عمارت اور وہ جو حدِ نظر تک پھیلی ہوئی کاشت کی زمینیں ہیں' وہ سب میری ہیں اور یہ گاؤں بھی میری ہی زمین پر آباد ہے اور وہ جو......''

دوسرے مسافر کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بڑی بڑی مونچھوں والا ایک فربہ اندام شخص آ کر ان دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ وہ تالاب کنارے دو موٹے موٹے پیڑوں کے پیچھے کھڑا ہوا دوسرے مسافر کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا پھر دوسرے مسافر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیا کہہ رہے تھے؟''

''میں کہہ رہا تھا کہ یہ باغ' یہ تالاب' یہ عمارت سبھی کچھ میرا ہے۔'' دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

''آپ کا اسمِ شریف؟'' اس آدمی نے پوچھا۔

''سبحان جواردار۔'' دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

وہ شخص قہقہہ لگا کر ہنسا پھر اس نے رکھائی سے پوچھا۔ ''جواردار صاحب' آپ کو اپنے والدِ گرامی کا نام تو یاد ہوگا؟''

''کیوں نہیں؟'' دوسرے مسافر نے جواب دیا۔ ''میرے والد کا نام غلام رحمان جواردار ہے۔''

وہ شخص پھر ہنسا پھر اچانک ہنسی روک کر برہمی سے بولا۔ ''آپ کا دماغ تو صحیح ہے؟''

دوسرا مسافر حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کیوں؟''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا کہ آپ کا دماغ صحیح ہے۔'' وہ شخص بولا۔ ''جواردار خاندان کا کوئی گدھا بھی اس گاؤں میں نہیں ہے' آدمی ہونا تو دور کی بات ہے۔''

''تم جھوٹ بکتے ہو۔'' دوسرے مسافر کو غصہ آ گیا۔ ''یہ سب کچھ میرا ہے' سبھی کچھ میرا ہے' تم کون ہو؟''

بات جب آپ سے تم تک جا پہنچی تو اس شخص کو بھی غصہ آ گیا۔ ''زبان سنبھال کر شریفوں کی طرح بات کیجیے۔ میرا نام سلیمان ملک ہے۔ یہ اراضی' یہ باغ' یہ تالاب' یہ عمارت اور دالان جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں' سب میرا ہے۔''

''خوب' تمہارے کہنے سے یہ سب تمہارا کیسے ہو گیا؟'' دوسرے مسافر نے غصے سے کہا۔ ''یہ سب کچھ میرا ہے۔''

''خاموش' دغاباز کہیں کا......'' وہ شخص غصے میں غرایا۔

''کیا کہا؟'' دوسرا مسافر آپے سے باہر ہو گیا۔ ''میں اپنی چیز اپنی کہنے سے دغاباز ہو گیا؟''

''میں کہتا ہوں' یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ شخص بولا۔ ''اسی میں تمہاری بھلائی ہے ورنہ مار کھانی پڑے گی اور ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی لگ سکتی ہے۔''

''تم بکواس کر رہے ہو۔'' دوسرے مسافر نے کہا۔

وہ شخص آگے بڑھ آیا' اس نے دوسرے مسافر کے گال پر ایک تھپڑ جڑ دیا پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کرنے لگے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے دیکھ کر پہلا مسافر دونوں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان ملک نے اس کا چہرہ دیکھ کر ہاتھ روک لیا۔

دوسرا مسافر چیخا۔ ''یہ تمام جائیداد میری ہے' یہ سبھی کچھ میرا ہے۔''

وہ شخص اسے طمانچہ مارنے کے لیے پھر آگے بڑھا مگر پہلا مسافر درمیان میں آ گیا۔

دونوں کی چیخ و پکار سن کر کچھ لوگ ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے آ پہنچے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس شخص سے کہا۔ ''بڑے صاحب' میں آپ کی آواز سن کر بھاگتا ہوا آیا ہوں' کیا بات ہے؟''

سلیمان ملک نے دوسرے مسافر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس درویش کے پیچھے یہ جو ایک آدمی کھڑا ہے' یہ جواردار نہ ٹواردار' اس سالے کا یہاں کسی نے نام بھی نہیں سنا۔ کہتا ہے کہ یہ زمین جائیداد' باغ' تالاب اور مکان اس کا ہے' اس کی یہ ہمت؟''

''حکم دیجیے' میں ابھی اس سالے کا سر دو ٹکڑے کروں گا......'' لٹھ بند آدمی بولا۔

دوسرے مسافر نے حالات کی نزاکت سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ پہلا مسافر آگے بڑھ آیا۔ ''یہ میرے ہم سفر ہیں۔ زمین' جائیداد کا جھگڑا تو عدالت کے ذریعے ہی طے ہو سکتا ہے' اس طرح قضیہ کرنا مناسب نہیں۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ سب کو ایک گانا سنانا چاہتا ہوں۔''

سلیمان ملک کا غصہ فرو ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''جناب درویش صاحب' آپ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ پہلے ناریل کا پانی پی لیجیے پھر گانا سنایئے گا۔''

''نہیں بھائی' میں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں۔'' پہلے مسافر نے جواب دیا۔ ''مجھے بہت کم بھوک اور پیاس لگتی ہے۔''

''تو پھر بیٹھ جایئے۔'' سلیمان ملک نے کہا۔

''نہیں' مجھے کھڑے ہو کر گانا زیادہ اچھا لگتا ہے۔'' درویش گانے لگا۔

اے انسان! اے میرے بھائی! اپنی عقل سے کام لو
تمہیں حال ہی میں انمول چیزیں مل جائیں گی
جنت تو مرنے کے بعد ملے گی
یہ سن کر کسی کا دل خوش نہیں ہوتا
لالن کا کہنا ہے کہ باقی کے لالچ میں
وہ کون ہے' جس نے اس دنیا میں
نقد حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے

گرمی کی اس ڈھلتی ہوئی دوپہر کی حدت نغمے کی آواز میں تحلیل ہو گئی اور اس کی نغمگی لوگوں کے دلوں میں لرزش پیدا کرنے لگی۔ بہت سارے لوگ جمع ہو گئے۔ کتنے ہی لوگ سُروں کی نغمگی سے مسحور ہو کر اپنے کام دھندے چھوڑ کر وہاں آ گئے تھے اور سب نغمہ سن کر مبہوت تھے۔

گانا ختم ہونے کے بعد سلیمان ملک نے پوچھا۔ ''معاف کیجیے گا جناب' آپ کا نام؟''

''میرا نام لالن شاہ ہے۔'' پہلے مسافر نے جواب دیا۔

''آپ کا نام لالن فقیر ہے؟'' ایک آدمی نے حیرت سے پوچھا۔

''کشتیا کے لالن فقیر؟'' دوسرے نے تصدیق چاہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں بھائی......!'' پہلے مسافر نے جواب دیا۔

لالن فقیر کا نام سن کر تمام لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ ایک آدمی چیختا ہوا گاؤں کی طرف دوڑنے لگا۔ ''بھائیو......! سنو' لالن فقیر واپس آ گئے ہیں' لالن فقیر واپس آ گئے ہیں۔ لوگو......! جلدی سے یہاں آؤ' یہاں آ کر گانا سنو' آؤ' اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرلو' آؤ' جلدی آؤ۔''

ایک آدمی لالن کے قریب آ کر بولا۔ ''میں نے اپنے دادا سے آپ کا نام سنا تھا اور میرے دادا نے اپنے دادا سے آپ کا نام سنا تھا۔ ان سے میں نے آپ کا کلام بھی سنا تھا۔ اب ہم آپ کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ جہاں ہم کھڑے ہیں' یہاں جگہ بہت کم ہے۔ آپ گاؤں کے میدان میں چلیے' وہاں بہت زیادہ لوگ جمع ہو سکتے ہیں۔''

''چلیے۔'' پہلے مسافر نے کہا۔

لوگوں نے اسے کندھوں پر اٹھالیا۔ وہ منت سماجت کرتا رہا لیکن کسی نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا شاعر' ان کا مطرب پیدل چلے۔ چاروں طرف سے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔

لالن شاہ نے کہا۔ ''آپ لوگ میرے ہم سفر کا خیال رکھیے گا' وہ کہیں اس بھیڑ میں پس نہ جائے۔''

لوگوں نے دوسرے مسافر کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے مسافر کے قریب ہی کھڑا تھا۔

ہزاروں آدمی دور دراز کی آبادیوں سے آتے رہے۔ سبھی مگن تھے اور بلند آواز میں اس امر پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ لالن فقیر لوٹ آیا ہے۔

گانے کی محفل دیر تک جمی رہی۔ لالن فقیر گاتا رہا۔ لوگ جھومتے رہے۔ موسیقی فضا میں ابھرتی رہی۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ موسیقی اور شراب میں فرق ہی کتنا ہے؟

محفل کے بعد دوسرے مسافر نے پہلے کو مخاطب کیا۔ ''شاعر بھائی...''

''کیا ہے جناب؟''

''میں تو سمجھا تھا کہ یہاں آ کر تمہیں قیدی بننا پڑے گا۔'' دوسرے مسافر نے کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' پہلا مسافر بولا۔ ''میں وہاں سے یہ کہہ کر آیا ہوں کہ یہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رکوں گا۔ آج صبح ہی مجھے اپنے ٹھکانے پہنچنا ہے۔ ایک دن کے لیے باہر نکلا تھا۔ اب صبح کا ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ چلو' ہم دونوں ہواؤں میں تحلیل ہو جائیں......''

''میں بھی ایک ہی دن کی چھٹی لے کر دنیا دیکھنے آیا تھا۔'' دوسرے مسافر نے کہا۔

''تم نے کیا دیکھا؟''

''مجھے یہاں کوئی بھی نہیں پہچانتا' کوئی میرا نام تک نہیں جانتا۔'' دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

''اور کیا دیکھا؟''

''اور تو میں نے کچھ نہیں دیکھا۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''تم میں یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔''

''کیا؟'' دوسرے مسافر نے پوچھا۔

''تم نے اور کچھ نہیں دیکھا؟'' پہلے مسافر نے سوال کیا۔

''کیا دیکھنے کی بات پوچھ رہے ہو؟'' دوسرا مسافر بولا۔

پہلے مسافر نے غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک دن دنیا میں تمہارے پاس کتنا کچھ تھا اور تمہارے برعکس میرے پاس کچھ نہیں تھا لیکن آج میرے پاس بہت کچھ ہے' تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔''

WATCH EVERY SUNDAY AT 8:00PM
ہوئے بیگانے کیوں
PRESENTS



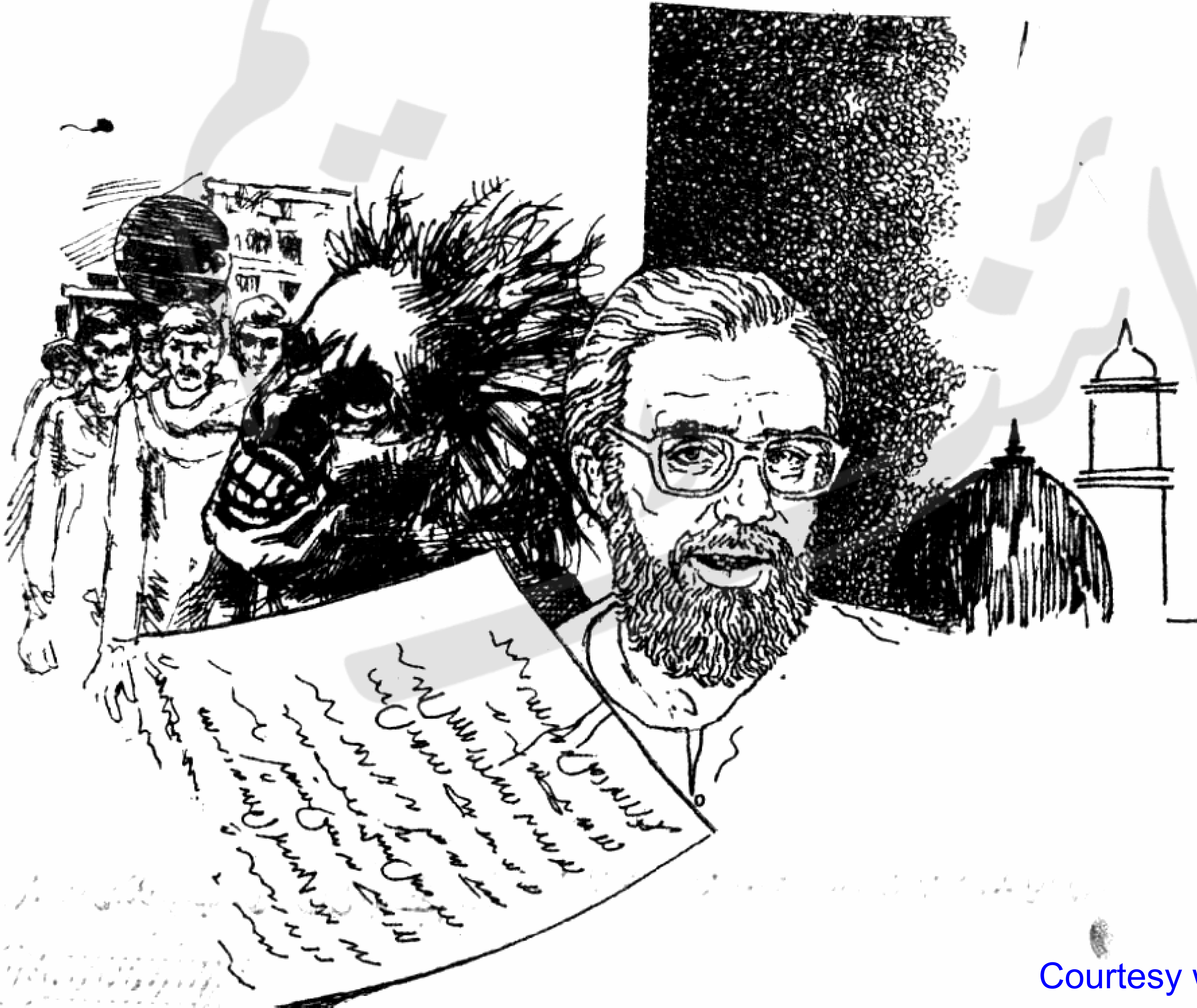
محمد عمر گولہ

سب مایا ہے

محسن نقوی کا خیال

کر رہا ہوں طے اندھیروں کا سفر
بوجھ صدیوں کا مرے سر پر بھی ہے

ایک صدیوں پرانی کہانی جو آج کے نوجوان سن رہے تھے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُن دنوں ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں کوئٹہ گئے ہوئے تھے اور وہاں کے تفریحی مقامات کی سیر میں ہمارے شب و روز گزر رہے تھے۔ ایک روز حنا اڑک جانے کا پروگرام بنا۔ وہاں پہنچے تو ایک گھنے سایہ دار درخت کی چھاؤں میں ہم سب دوست بیٹھ گئے اور اپنے ساتھ لائی گئی کھانے پینے کی چیزیں مزے سے کھانے لگے۔ ہمارے نزدیک ہی ایک سفید پوش بزرگ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم نے سوچا کہ اس بابا کو بھی کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ دینا چاہیے پھر ہم سب دوست اُس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اُس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور مسکرانے لگا۔ ہم نے اُسے کھانا اور فروٹ وغیرہ دیئے تو اس نے تشکر آمیز نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے فوراً لے لیے اور انہیں یوں کھانے لگا جیسے کئی روز کا بھوکا ہو۔ ہم اسے کھاتا دیکھتے رہے، جب اس کا شکم سیر ہوگیا تو ہم نے اسے کولڈ ڈرنک بھی دی۔ کھانا کھا کر وہ خوش نظر آ رہا تھا اور ہمیں دُعائیں دے رہا تھا۔

''بابا جی! آپ کا گھر یہیں قریب ہی ہے؟'' فضل نے اُس سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا، میں مسافر ہوں اور نگر نگر پھرتا رہتا ہوں۔ جہاں شام ہوتی ہے، وہیں رات بسر کر لیتا ہوں اور کوئی کچھ دے دیتا ہے تو کھا لیتا ہوں۔'' اُن بزرگ نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''بابا......! آپ کا گھربار، بیوی بچے کچھ نہیں ہے؟'' امجد کے سوال پر بزرگ گہری سوچ میں ڈوب گئے اور پھر اپنی کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔

''بیٹا......! میرا نام رحمان ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو ایک امیر کبیر شخص جان محمد کی وسیع و عریض حویلی میں پایا۔ جان محمد کے بقول، میرے پیدا ہوتے ہی میرے ماں باپ کسی پراسرار بیماری کا شکار ہو کر مر گئے تھے اور میرا کوئی بھائی بہن یا عزیز رشتے دار بھی نہیں تھا لہٰذا جان محمد نے مجھے پالا تھا اور میں اس کے نوکر کی حیثیت سے اس کی حویلی میں رہنے لگا تھا، تاہم جان محمد مجھے نوکر سے زیادہ اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ اس کی اور میری عمر میں پندرہ برس کا فرق تھا، جب میں بیس سال کا ہوا تو وہ پینتیس برس کا ہو چکا تھا لیکن اس نے شادی نہیں کی تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ماں باپ بھی جلد ہی اس دنیا سے چلے گئے تھے اور وہ بھی میری طرح اس بھرے جہاں میں اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ بھی اکیلا تھا، میں بھی اکیلا تھا، یوں ہم دونوں ایک دوسرے کے غم گسار بن گئے تھے۔ بہرحال وہ بہت امیر کبیر تھا، اس کی بہت بڑی جاگیر تھی، اس کی زمینیں میلوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک دن ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے کہ میرے مالک جان محمد کو خیال آیا کہ اس کے بعد اس کی اتنی بڑی جائیداد کا وارث کون ہوگا؟ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ بے چین ہوگیا اور اس نے فوراً شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی بات پر میں بھی خوش ہوگیا کہ اتنی بڑی حویلی میں جب کوئی عورت آئے گی تو رونق ہو جائے گی، تب میں نے اپنے مالک کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کر دی اور جلد ہی ایک مناسب رشتہ مل گیا۔ لڑکی کی عمر بھی مناسب تھی اور خاندان بھی اچھا تھا۔ مجھے تو یہ رشتہ ہر لحاظ سے بہترین لگ رہا تھا لیکن مالک کی منظوری ضروری تھی چنانچہ میں نے اپنے مالک سے کہا تھا۔

''مالک! ایک بہت اچھا رشتہ ملا ہے، خاندانی لوگ ہیں، مجھے تو پسند ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟''

''یار، جو تم کو پسند، وہ مجھ کو پسند، بس جلدی سے شادی کی بات کرو۔'' مالک کی رضامندی جان کر میں نے بات پکی کر دی اور پھر شادی ہوگئی۔

پہلی رات میرے مالک نے اپنی نئی نویلی دلہن سے ایک وعدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر میں پہلے مر گیا تو تم میری قبر پر ایک رات گزارو گی۔ اگر تم پہلے مر گئیں تو میں تمہاری قبر پر ایک رات گزاروں گا۔''

پھر کچھ عرصے بعد ہی مالک کی بیوی قضائے الٰہی سے وفات پا گئی۔ اس دن مالک نے مجھ سے اپنی بیوی سے کیے گئے وعدے کے متعلق بتایا تو میں نے کہا۔

''مالک! ایسے وعدوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔''

''نہیں یار، میں اس کی قبر پر ضرور ایک رات بیٹھوں گا۔ میں نے اس سے سچا وعدہ کیا تھا۔ آدمی کی زبان ایک ہوتی ہے۔''

پھر میرا مالک جان محمد اپنے وعدے کے مطابق وہ رات بیوی کی قبر پر گزارنے کے لیے قبرستان پہنچ گیا۔ میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ابھی آدھی رات گزری تھی کہ مالک کو نیند آ گئی اور وہ قبر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے مالک کو نیند سے جھنجھوڑا۔

''اے شخص، آدھی رات کو قبر پر کیوں لیٹے ہو؟''

میرے مالک نے اسے جواب دیا۔ ''یہ قبر میری بیوی کی ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کی قبر پر ایک رات گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔''

''کیا تم اپنی بیوی سے بات کرنا چاہو گے؟''

یہ سن کر مالک نے فوراً کہا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' تب اس شخص نے کچھ پڑھنا شروع کیا اور چند لمحوں میں مالک کی بیوی قبر سے نکل کر کھڑی ہوگئی۔ یہ دیکھ کر مالک حیران رہ گیا۔

اس آدمی نے کہا۔ ''اپنی بیوی سے بات کرو۔''

پھر اس نے مالک کی بیوی کو مخاطب کیا۔ ''اے خدا کی نیک بندی......! اس آدمی کو پہچانتی ہے؟''

جواب میں عورت نے اپنے شوہر کو نہیں پہچانا۔

''یاد کرو، اپنی گزری دنیا میں چلی جاؤ۔''

''ہاں، مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ میں ایک نیک شخص کی بیوی تھی۔''

مالک نے فوراً کہا۔ ''وہ آدمی میں ہوں۔''

اس شخص نے مالک کی بیوی سے کہا۔ ''اے نیک عورت! تم مرنے کے بعد بہترین جگہ پر ہو، اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''ہاں......خدا کی مجھ پر رحمت ہے کہ مجھے بہت اچھا بدلہ ملا ہے اور میں حقیقی جہاں میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ اے نیک انسان......! تیرا وعدہ پورا ہوا۔ تم اپنے گھر جاؤ اور خدا کی عبادت کرو اور خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خیرات کرو۔ بس یہی کام اچھا ہے۔'' مالک کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا اور پھر وہ دوبارہ قبر میں غائب ہوگئی اور ساتھ ہی وہ درویش نما شخص بھی غائب ہوگیا۔ میرا مالک جان محمد گھر چلا آیا۔ اس نے نماز پڑھی پھر اس کی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ اس نے اپنی تمام جائیداد غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دی۔ اس کا بس ایک ہی کہنا تھا کہ یہ تو فانی دنیا ہے، اس میں تو ثواب کمانا ہے۔ اصل دنیا تو آخرت کی ہے۔ میرا مالک سب کچھ خیرات کرنے کے بعد بادشاہ سے فقیر بن گیا اور کچھ دنوں بعد وہ بھی اس جہاں سے رخصت ہوگیا۔ مالک نے مجھے بھی خیرات میں جائیداد کا خاصہ حصہ دیا تھا اور میں نے بھی اسے خیرات کر دیا۔

بچو......! میری ایک بات ذہن میں بٹھا لو کہ یہ دنیا، اس کی آسائشیں اور اس کا مال سب دھوکا ہے۔ زندگی وہ ہے جو ظاہری آنکھیں بند ہونے کے بعد ملے گی۔ بس اسی کی فکر کرو۔'' اپنی کہانی سنا کر بابا خاموش ہوگئے۔

''بابا! یہ قصہ کتنا پرانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹا......! یہ کہانی ڈیڑھ سو برس پرانی ہے۔''

''کیا......!!!'' ہم تینوں دوست حیرت سے چلائے مگر ہماری حیرت کا جواب دینے کے لیے وہ بابا موجود نہیں تھے۔ عین ہماری آنکھوں کے سامنے وہ فضا میں تحلیل ہوگئے تھے اور ہم حیرت کے بت بنے یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھتے رہ گئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

WATCH EVERY Mon-Fri AT 9:00AM

میرے شہر کی کہانی

شہر کراچی میں جنم لینے والی کہانیوں کا نیا خاص سلسلہ

ارم زہرا

زندگی کا حق ادا ہوا

قابل اجمیری کا خیال

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

شہر کراچی میں ہونے والے نوجوان کے اغواء اور رہائی سے جُڑی کہانی



وہ اتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا جیسے اس کی چال ں بجلی کوند گئی ہو۔ پاک کالونی کی مختلف گلیوں کو عبور رتا ہوا وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے چھے فائر کرتے لڑکے اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ ت مضبوط اعصاب کا لڑکا تھا' موت اس کے اقب میں تھی اور وہ زندگی کو بچانے کی کشمکش میں بری اور چابک دستی سے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

''ارے' تیزی سے بھاگو...... الٹے ہاتھ کی گلی ں مڑ گیا ہے وہ......'' یہ جملہ اس کے کانوں میں بم ں طرح بلاسٹ ہوا' اس نے اپنے بھاگتے قدموں و بریک لگائے اور سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ یا۔ فائرنگ کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ اقہ مکین اپنے اپنے گھروں میں مقید تھے۔ لمحہ بھر ں نے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر تیزی سے سامنے لے گھر کے ادھ کھلے دروازے کو دھکیلتا اندر داخل وگیا۔

''کک......کون ہو تم؟ نکلو یہاں سے......'' یں خالہ خاتون اپنی چیخ دباتی اسے ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھیں......''میں نے کہا' نکل جاؤ یہاں سے ورنہ ابھی میں شور مچا دوں گی۔'' وہ پریشان کن مداز میں اس سے مخاطب تھیں۔

''دیکھیے' اس وقت میں آپ کی مدد کا طلب گار وں' آپ بس مجھے پندرہ' بیس منٹ دے دیجیے' میں ود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' وہ سرعت سے روازہ بند کرتا اب اپنی پشت دروازے سے لگائے کھڑا تھا۔

''ابھی فوراً نکلو یہاں سے' میں کچھ نہیں جانتی۔'' ہ خاتون تیزی سے اس کی جانب بڑھیں اور دروازہ کھولنے لگیں مگر فائرنگ کی آواز سے یکدم ٹھٹک کر ک گئیں۔

''دیکھیے' میرے حال پر رحم کیجیے' یہ لڑکے مجھے اغوا کرنے کی کوشش میں ہیں' میں اپنی جان بچا کر بھاگا ہوں۔ محترمہ' مجھے کچھ وقت دے دیجیے' یقین جانیے' آپ میری بہن جیسی ہیں۔'' وہ الجھن بھرے انداز میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے' یہاں آ جاؤ۔'' وہ خاتون اسے صحن سے ملحقہ کمرے میں لے گئی تھیں۔

''بہن' میرا نام شاہ زیب ہے' ہم پانچ لڑکوں کو مختلف مقامات سے اغوا کیا گیا تھا اور پھر ایک ایک کر کے میرے ساتھ کے لڑکوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر مختلف مقامات پر پھینک دیا گیا۔'' یہ بتاتے ہوئے اس کے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ ''آج میری باری تھی' مجھے موقع مل گیا تو میں بھاگ کھڑا ہوا۔'' شاہ زیب کے اعصاب ابھی تک منتشر تھے۔

''لیکن اگر وہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے تو؟'' وہ خاتون اب تھر تھر کانپنے لگیں' شاید خوف کا' دہشت کا' نادیدہ ہاتھوں کا ڈر اُن پر طاری ہو چکا تھا۔

''بہن......! آپ تسلی رکھیے' مجھے یقین ہے' وہ یہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔'' شاہ زیب قدرے سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔

''اللہ کرے' ایسا ہی ہو۔'' وہ خاتون دل ہی دل میں خود کو سرزنش کرتی بیڈ کے کونے پر ٹک گئیں۔ اُن کے تینوں بچے گہری نیند سو رہے تھے اور اس طرح کی سچویشن میں وہ یقیناً رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتے۔

''بہن......! آپ کا نام کیا ہے؟'' شاہ زیب نے نرمی سے پوچھا تھا۔

''شوکت بی بی......!''

''ایک گلاس پانی مل جائے گا؟'' وہ اب سینے پر ہاتھ رکھے اپنی منتشر سانسیں بحال کر رہا تھا۔

''ہاں' ہاں' ضرور۔'' وہ کچھ پریشان سی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ لیجیے۔'' پانی کا گلاس وہ شاہ زیب کی طرف بڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی جرأت اور حوصلہ مندی کی داد دے رہی تھیں۔

''شکریہ' ایک گلاس اور ملے گا؟'' پانی نے فوری توانائی کا کام کیا تھا جبھی اس کی آواز میں جان سی پڑ گئی۔

''جی ضرور' معاف کیجیے گا' میں آپ سے پانی کا پوچھ نہیں سکی۔'' وہ متانت سے کہتی ہوئیں دوبارہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

اگلے ایک گھنٹے میں گلی کی رونقیں واپس لوٹ آئیں۔ تڑتڑاتی گولیوں کی آوازوں نے علاقے کے جن مکینوں کو بدحواس کر دیا تھا' اب ان کے چہروں پر زندگی کی رمق لوٹ آئی تھی۔ اس دوران میں شاہ زیب کو یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ شوکت بی بی کا گزارہ بہت تنگدستی سے ہو رہا تھا۔ اُن پر چھ ماہ کا کرایہ چڑھا ہوا تھا۔

''شکر ہے خدا کا' وہ لوگ آپ کو ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔'' شوکت بی بی آہستگی سے بولی تھیں۔

''جی......'' وہ جیسے عالم خود فراموشی سے عالم خود شناسی میں آ گیا۔ ''میں آپ کا یہ احساس کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر آپ آج میری مدد نہیں کرتیں تو یقین کریں' میری بوری بند لاش کسی جگہ پھینک دی جاتی' آپ نے میری جان بچائی ہے' میں آپ کا شکر گزار ہوں اور میری پوری کوشش ہو گی آپ نے جو مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے' میں اس کو اتار دوں بشرطیکہ یہاں سے نکلنے کے بعد بھی یہ زندگی مجھ سے وفا کرتی ہے تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا ورنہ آپ مجھے معاف کر دیجیے گا۔'' شاہ زیب صحن عبور کرتا اب داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''بھائی......! اپنا خیال رکھنا۔'' شوکت بی بی گھر کا دروازہ کھولے اسے رخصت کر رہی تھیں اور شاہ زیب بشرطِ زندگی دوبارہ آنے کا وعدہ کرتا باہر پھیلے اندھیرے کی چادر میں گم ہو گیا تھا۔

•......•......•......•

ایک صبح شاہ زیب کی دوبارہ اپنے گھر آمد پر شوکت بی بی اسے اپنی زندگی کی یہ کہانی سنا رہی تھیں ... ''ایک روز میرے میاں رفیق نے مجھے آ کر کہا تھا۔

''جانتی ہو' پی ٹی سی ایل کو پرائیویٹائز کر دیا گیا ہے اور ہم سب کو ادارہ گولڈن ہینڈ شیک کے ذریعے ڈبل رقم دے رہا ہے یعنی اگر میں گولڈن ہینڈ شیک کے ذریعے ریٹائرمنٹ لیتا ہوں تو مجھے سولہ' سترہ لاکھ گریجویٹی مل جائے گی۔'' چالیس سالہ رفیق اپنی بیوی شوکت بی بی سے مخاطب تھا۔

''سولہ' سترہ سال کی سروس پر سولہ' سترہ لاکھ......'' شوکت بی بی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''ہاں' میں تو سوچ رہا ہوں' ریٹائرمنٹ لے کر اپنا بزنس شروع کر دوں۔ یقین کرو' اس سے ہماری تینوں اولادوں کی زندگی سنور جائے گی۔ اللہ نے ہمیں دو بیٹوں سے نوازا ہے۔ ماشاءاللہ' آگے چل کر میرا بزنس یہ دونوں سنبھال لیں گے پھر چین سکھ کی زندگی گزاروں گا۔'' رفیق کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب تھے۔

''جیسے آپ کو بہتر لگے' بس مجھے تو اپنی اکلوتی بیٹی کی فکر ستاتی ہے' اس کے لیے میرے دل میں بہت ارمان ہیں۔ میرا خیال ہے' اگر ہم بیٹی کے نام کچھ پیسے فکس کر دیں تو تو اس سے اس کی شادی کے وقت ہمیں ہی آسانی ہو گی۔'' شوکت بی بی بڑے ہی رسان سے بولی تھیں۔

''ارے' ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے' ایک بار میرا بزنس جم جائے پھر دیکھنا' ہم اسے کیسے شان و شوکت

رخصت کرتے ہیں۔ ابھی تو میرا سارا دھیان
، کاروبار پر ہے کہ میں کس طرح ریٹائرمنٹ
بعد اپنے بزنس کی شروعات کرتا
ں؟'' رفیق کی پرسوچ نظریں خلا میں کسی
رئی نقطے کو گھور رہی تھیں۔

''آپ اللہ کا نام لے کر کام شروع کیجیے' مجھے
رہے' آگے سب بہتر ہو گا' یقیناً اضطراب پریشان
تا ہے لیکن کوشش اور زندہ دلی اضطراب سے نکال
ں دیتی ہے۔ آپ قدم بڑھائیے' میں آپ کے
تھ ہوں۔'' مستقبل کے سہانے خوابوں سے آباد
لت بی بی نے بہت یقین اور اعتماد سے کہا تھا......
۔ یوں رفیق نے گولڈن شیک ہینڈ کی صورت
ٹائرمنٹ کے بعد بھیم پورہ' اولڈ سٹی ایریا میں
نوروں کا چارہ بنانے والی مشین لگا لی۔

آہستہ آہستہ رفیق کا کاروبار بہتری کی طرف
امزن ہونے لگا' وہ روز بروز اپنے کاروبار کی ترقی
بہت خوش تھا کہ اچانک ایک دن بھتہ خوروں نے
ں کو گھیر لیا اور بھتے کا مطالبہ کیا۔ اس نے انکار کیا تو
واب میں مار کٹائی شروع ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا
کہ رفیق اپنی جان بچانے کے چکر میں بھتہ خوروں کا
نہ بند کرنے لگا اور یوں گزرتے وقت کے ساتھ
رفیق کی مشکلات میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ کبھی
چارہ رکھنے پر پڑوسیوں سے جھگڑا تو کبھی چارہ وقت
پر نہ پہنچنے کی وجہ سے ڈیلر سے لڑائی جو تھوڑا بہت
پرافٹ اسے ہوتا' وہ کبھی بھتہ خوروں کی نذر ہو جاتا تو
کبھی کسی نقصان کے ازالے کی صورت ختم ہو جاتا۔
رفیق کے دونوں بیٹے ابھی اس قابل نہیں تھے کہ وہ
اس کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتے' پی ٹی سی ایل کی
آرام دہ نوکری چھوڑ کر اب چارہ کاروبار میں بری
طرح پھنس گیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ حالات
کی خرابی نے اس کے کاروبار کا بیڑہ غرق کر دیا تھا اور
اب سوائے نقصان کے اسے کچھ بھی حاصل نہیں تھا۔

•......•......•

''میں بہت جلد اپنا یہ چارے والا کاروبار سمیٹ رہا ہوں۔'' رفیق نے بہت غور و فکر کے بعد اپنی بیوی کو یہ خبر سنائی تھی۔

''ارے' اتنے عرصے کی محنت آپ چار دن میں سمیٹنے کی بات کر رہے ہیں؟ اتنی جلدی نہیں کریں' کچھ صبر کریں۔ مجھے پوری امید ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ یہ ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔'' شوکت بی بی نے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

''نہیں' مجھے نہیں لگتا ایسا ہو۔'' رفیق کا فرسٹریشن سے آباد لہجہ شوکت بی بی کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

''اصل میں آپ ہمت ہار گئے ہیں۔ تھوڑی سی ہمت کریں۔''

''کتنی ہمت کروں' کب تک میں اپنے کاروبار کو اپنے لہو سے جلاتا رہوں گا؟ دل جلتا ہے میرا جب مفت خورے میری کنپٹی پر پستول رکھ کر مجھ سے ٹھیک ٹھاک پیسے لے جاتے ہیں' مجھے اکیلا سمجھ کر فائدہ اٹھاتے ہیں' نقصان کرتے ہیں میرا' اب میری اتنی استطاعت تو نہیں کہ میں چار پانچ ملازم رکھ سکوں۔'' آواز کا تعلق براہِ راست دل سے ہوتا ہے جبھی رفیق کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''آپ جذباتی ہو کر اپنا نقصان نہ کر بیٹھیں' میں بس اسی بات سے ڈرتی ہوں' اچھا خاصہ کاروبار پھیلایا' اب اچانک ساری محنت پر پانی پھیرنا کہاں کی عقل مندی ہے' میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا کہ یہ کاروبار سمیٹنے کے بعد آپ کریں گے کیا؟'' شوکت بی بی کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''ہاں' یہ بات غور طلب ہے' میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ لیکن اس کاروبار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے چھٹکارہ حاصل کرنا تو بہت ضروری ہوگیا ہے اب۔ کہیں کل پیسوں کے چکر میں بھتہ خور مجھے جان سے ہی نہ مار جائیں......'' رفیق کی آنکھوں میں موت کا خوف نمایاں تھا۔

''لیکن اس بار آپ ایک معقول رقم سیونگ ڈپازٹ کی شکل میں ہمارے لیے رکھیں گے۔'' شوکت بی بی نے سوالیہ نظروں سے رفیق کو دیکھا۔

''دیکھتے ہیں' میں پوری کوشش کروں گا' میری ضرورتوں' امیدوں اور خواہشوں کا سلسلہ تو ایسے تھما ہے جیسے اب کچھ شروع ہی نہیں ہوسکے گا۔ شادی سے پہلے میرے کتنے ارمان تھے لیکن تم سے شادی کے بعد ضرورتوں کے انبار لگنا شروع ہوگئے اور پھر ایک کے بعد ایک بچے کی ولادت نے مجھے خواہشوں سے عاری کردیا' میری ہر خواہش پس پشت جاتی رہی اور میں تمہاری اور بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا گیا مگر اس بار میں اپنے مطلب کا کام ڈھونڈوں گا جس سے سکونِ قلب بھی حاصل ہو اور دولت کا راستہ بھی ہموار ہو۔'' رفیق کے انداز میں فکر تھی اور آواز میں تشویش۔

''اس کا مطلب ہے آپ اپنے بارے میں سوچ رہے ہیں صرف؟'' شوکت بی بی نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔

''ارے' تم سب بھی تو میرے ہو اور میری خوشی تم لوگوں کی خوشیوں میں ہے' بس دُعا کرو' میں نے جیسا سوچا اور چاہتا ہوں' سب کچھ ویسا ہی ہو جائے۔'' رفیق نے ایک سرد آہ بھری اور شوکت بی بی کے سراپے سے اپنی نظریں ہٹالیں۔

•......•......•

''کیا کہا آپ نے' چھ لاکھ؟'' شوکت بی بی کی آنکھیں حیرت سے واہوگئیں۔

''ہاں' میں نے ٹریول ایجنسی سے بات کرلی ہے' یہاں سے یونان جانے میں چھ لاکھ کا خرچہ آرہا ہے۔ میں نے ہامی بھرلی ہے' ایک بار یونان چلا جاؤں پھر زندگی سنورنی شروع ہوجائے گی۔ مجھے لگ رہا ہے' میری زندگی کا یہ فیصلہ ہمارے لیے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔'' رفیق کے چہرے سے خوشی نمایاں تھی۔

''سارے پیسے آپ اس ٹریول ایجنسی کی نذر کرکے یونان چلے جائیں گے' اگر خدانخواستہ وہاں سیٹ نہیں ہوسکے تو پھر؟''

''منہ سے اول فول مت نکالو......میرا ایک دوست وہاں موجود ہے' اس کے ساتھ اس کے بزنس میں پارٹنر شپ پر کام شروع کروں گا۔'' خیالات کے تانے بانے بُنتا رفیق' شوکت بی بی کو راضی کرنے کی کوششوں میں جتا ہوا تھا۔

''آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں گے' کرائے کا گھر ہے ہمارا' میں یہ سب کچھ اکیلے کیسے دیکھوں گی؟'' شوکت بی بی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''افوہ......بس دیکھتی جاؤ۔ دو تین ماہ کی بات ہے' میں وہاں جاتے ہی تمہیں معقول رقم بھجوانا شروع کردوں گا پھر ہمارے سارے مسائل خود بخود حل ہونا شروع ہوجائیں گے۔''

''نہیں' میرا دل نہیں مان رہا ہے' بہت گھبرا رہا ہے' جب اپنے ملک میں' اپنوں نے ہمیں ڈسنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تو پھر آپ بیرونِ ملک میں کیسے' کس پر اعتبار کریں گے؟'' شوکت بی بی کی آنکھوں سے اب آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے مگر رفیق کی آنکھوں میں شاید سنہرے خوابوں کی چکاچوند تھی جبھی اسے بیوی اور تین بچوں کو اکیلا چھوڑ دینے پر ذرا بھی ملال نہیں تھا۔

•......•......•

''پھر اس کے بعد کیا ہوا' رفیق صاحب کیا فوراً چلے گئے تھے؟'' شاہ زیب نے شوکت بی بی کی [طرف] دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''جی' چلے تو گئے تھے مگر ایران سے جس کشتی [کے] ذریعے وہ یونان جا رہے تھے' آدھے راستے میں [اس]ے یونانی پولیس نے قبضے میں لے لیا' کشتی میں [سوا]ر آٹھ' دس افراد مارے گئے جبکہ رفیق سمیت کچھ [افر]اد کو پولیس نے گرفتار کرلیا' بس وہ دن ہے اور آج [کا] دن' مصیبت ہمارا دروازہ تھام کر بیٹھ گئی [ہے]......'' شوکت بی بی نے زاروقطار روتے ہوئے [بتای]ا تھا۔

''ارے' آپ تو بہت مخلص خاتون ہیں' جانتی [ہیں]' آپ نے میری زندگی بچائی ہے۔ میں جس [م]کان کے تہہ خانے میں قید تھا' وہاں میرے جیسے تین [اف]راد کو قتل کرکے بوری میں بند کرکے مختلف علاقوں [می]ں پھینک دیا گیا۔ جس دن میرا نمبر تھا' اس دن میں [اس]ں تہہ خانے میں بنے روشن دان کو توڑتا گلی میں [چ]ھلانگ لگا چکا تھا مگر بدقسمتی سے مجھے لڑکوں نے دیکھ [ل]یا اور پھر بھاگتے بھاگتے میں اُن گلیوں میں [ب]ھٹکتا آپ کے دروازے تک پہنچ گیا' یقین جانیے' آپ میری محسن ہیں' میں آپ کے لیے ایک کمرے کا [م]کان ڈھونڈ چکا ہوں' آپ فوراً وہاں شفٹ ہوجائیں تاکہ مکان کے کرائے کا بوجھ آپ کے اوپر سے اتر جائے' یہ چھوٹا سا کمرہ میری بہن کے گھر کا اوپری پورشن ہے' وہاں آپ کو میری بہن کی بھرپور مدد حاصل ہوگی۔'' شاہ زیب انتہائی خلوص سے کہہ رہا تھا۔

''بہت شکریہ بھائی! میں آپ کی شکرگزار ہوں ورنہ کون آج کے دور میں اس طرح سوچتا ہے۔'' شوکت بی بی تشکر آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

نظم

خود کو
بدلنا ہوگا
صفدر
گر
تقدیر کو بدلنا ہے

محمد صفدر ٹھٹوی۔ سندھ

''میں فیڈرل بی ایریا کا رہائشی ہوں۔ الیکٹرک سسٹم کا میکینک ہوں۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہوگا' میں آپ کی مدد کروں گا۔ آج کے بعد سے میں آپ کا حقیقی بھائی ہوں' جب بھی آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو' بلاجھجک آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔'' ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ شاہ زیب کے موبائل پر یہ اطلاع آئی کہ آپ کو تفتیش کے لیے پولیس' تھانے بلا رہی ہے۔ شاہ زیب جو کہ بازیاب ہوتے ہی پہلے ہی علاقہ مکین کے سوالوں سے ہراساں تھا' اب ایک بار پھر پریشان ہوگیا۔ وہ شوکت بی بی سے رخصت لے کر پولیس اسٹیشن پہنچا تھا۔

''کتنے لوگ تھے تمہارے ساتھ؟ اغوا کہاں سے ہوئے؟ حبس بے جا میں رکھنے کی مکمل تفصیل سے ہمیں آگاہ کریں۔'' یوں ایک گھنٹے کے سوال و جواب کے بعد شاہ زیب کو گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

•......•......•

''بھائی' آپ نے آج کا اخبار دیکھا؟'' کلثوم بھاگنے والے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کوئی خاص خبر؟'' شاہ زیب نے برجستہ سوال کیا۔

''بھائی......! بازیاب ہو جانے والے افراد سے وفاقی وزیرداخلہ رحمان ملک صاحب ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اوہ یعنی ایک امتحان کے بعد دوسرا امتحان؟'' شاہ زیب نے چبھتی نظر سے اخبار کو دیکھا۔

''بھائی......! اب کیا ہوگا؟'' کلثوم' بھائی کی محبت سے لبریز لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا' یقیناً یہ کڑا وقت بھی گزر جائے گا۔ محلے والے' رشتہ دار' گھر والوں کے بعد اب وزیر صاحب بھی مجھ سے پوچھ گچھ کریں گے تو کوئی بات نہیں۔ اگر خدانخواستہ میری لاش کسی گلی میں بوری سے برآمد ہوتی پھر؟ اف...... میں وہ بھیانک منظر کبھی نہیں بھول سکتا جب وہ سفاک' شقی القلب لوگ ڈرل سے جسم میں سوراخ کرتے تھے......'' ابھی شاہ زیب کی سوچ و بچار جاری تھی کہ شاہ زیب کے موبائل پر کال آئی تھی۔

''السلام علیکم!'' شاہ زیب نے ان نون نمبر اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔

''میں محکمۂ داخلہ' سندھ کے آفس سے بات کر رہا ہوں' آپ شاہ زیب بول رہے ہیں؟''

''جی......!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کیا آپ کو ہی اغوا کیا گیا تھا؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''جی' میں ہی ہوں۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''آپ سے وفاقی وزیرداخلہ رحمان ملک صاحب بات کرنا چاہتے ہیں' آپ جتنی جلدی ہو سکے' سندھ سیکریٹریٹ میں وزارتِ داخلہ کے دفتر کرائسس مینجمنٹ سیل آفس میں آجائیں۔''

''جی' ٹھیک ہے۔'' خوف اس کی آواز میں نمایاں تھا۔

''مقررہ وقت پر پہنچ جایئے گا۔'' یہ کہہ کر لائن ڈراپ کردی گئی تھی۔

•......•......•......•

شاہ زیب جب وہاں پہنچا تو دو تین لڑکے اور بھی موجود تھے جو شاہ زیب کی طرح بچ گئے تھے۔ شاہ زیب فرداً فرداً اُن سے ہاتھ ملاتا ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر جب وزیرداخلہ نے اُس سے اُس کے بارے میں مکمل تفصیل دریافت کی تو اس نے شوکت بی بی کا تذکرہ من و عن بیان کیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھ پیش آنے والی ساری روداد بھی سنائی کہ کس طرح وہ اپنی جان بچا کر بھاگا تھا۔

وزیرداخلہ سمیت وہاں موجود سبھی لوگوں نے شوکت بی بی کے اس جرأت مندانہ فعل کو سراہا تھا اور پھر اُن کو بڑے ہی احترام سے محکمۂ داخلہ سندھ کی گاڑی میں سندھ سیکریٹریٹ لایا گیا تھا۔ وفاقی وزیرداخلہ رحمان ملک کی طرف سے جو مغویان بازیاب ہوئے تھے' اُن کو پچاس ہزار روپے کیش کی صورت میں پیش کیے تو شاہ زیب نے پاس کھڑی ہوئی شوکت بی بی کی طرف پچاس ہزار بڑھا دیئے اور کہا کہ ''ان کی زیادہ حقدار یہ ہیں۔'' شاہ زیب کی اس بات سے وزیرداخلہ بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی طرف سے شوکت بی بی کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے کا اعلان کردیا۔

اور یوں شوکت بی بی کی زندگی میں ایک بہار کا جھونکا آگیا۔ شاہ زیب نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ابھی ہمارا معاشرہ بانجھ نہیں ہوا۔ کراچی کے کلچر میں پیار' محبت اور خدمت کی وہ روایات اب بھی برقرار ہیں جنہیں دیکھ کر یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب شاہ زیب جیسے کراچی کے نوجوان اپنی اعلیٰ و ارفع روایات کا پرچم ایک بار پھر بلند کریں گے۔

راوی / مسعود جمانی
تحریر / ظہیر احمد

محبت اور عقیدت کا لازوال سفر

رضا کا خیال
ہو بیاں کیا عظمتیں اس کی
بس یہ جانو روشنی کا سفر تھا وہ

مقاماتِ مقدسہ کی زیارتوں کا روح پرور احوال

خاتم النبین رسول اللہ ﷺ کے داماد اور اُن کے بچپن کے ساتھی امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ سے محبت و عقیدت ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ شجاعت اور علم کا پیکر شیرِ خدا کے لیے رسول اللہؐ کا یہ قول تاقیامت جگمگاتا تعارف ہے کہ ''میں شہرِ علم ہوں اور علیؓ اِس کا دروازہ ہیں۔''

جی ہاں' اسی عظیم ہستی کے روضۂ مبارک پر حاضری اور زیارت کے لیے ماہ مئی کے اوائل میں ہمارے دوست جناب مسعود جمانی نجف اشرف (عراق) تشریف لے گئے پھر وہاں سے وہ کربلا گئے اور شہید راہِ حق حضرت امام حسین عالی مقامؑ کے روضۂ مبارک اور دیگر شہدائے کربلا کے مزارات پر حاضری دی۔

انہوں نے کچھ نشستوں میں اپنی محبت و عقیدت کے اس لازوال سفر کی داستان بہت وجد کی کیفیت میں بیان کی۔ سب سے پہلی بات تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں خود سے نہیں گیا تھا' مجھے تو بلوایا گیا تھا اور بغیر امیرؓ کی اجازت کے حاضری ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں فیملی کے بغیر اور تنِ تنہا تھا جبکہ عراق میں زیارت کے لیے تنہا شخص کو ویزہ نہیں ملتا لیکن سب کام آسانی سے ہوگیا۔ وہ کہتے ہیں۔

''دوسرا واقعہ تو بہت حیران کن ہے' ہمارا گائیڈ یا امیرِ کارواں کا کہنا بھی تھا کہ ایسا 'معجزہ' بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابوظہبی سے بغداد کے لیے جس فلائٹ میں مسعود جمانی روانہ ہوئے' اس میں کپڑوں' ادویات اور دیگر زادِراہ پر مشتمل سوٹ کیس لوڈ نہیں ہو سکا تھا بلکہ دیگر مسافروں کا سامان بھی لوڈ ہونے سے رہ گیا تھا۔ مسعود جمانی بے فکری کے ساتھ کہ جس نے بلایا ہے' وہی سامانِ سفر بھی مہیا کرے گا۔ بغداد میں اترے تو ایئرپورٹ والوں نے نجف میں ان کے ہوٹل کا پتہ لے کر کہا کہ سامان آگیا تو ہوٹل بھجوا دیں گے۔ امیرِ کارواں سلمان اور قافلے کے دیگر افراد تو فکرمند رہے لیکن مسعود جمانی نے کسی فکر اور تشویش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ روضۂ حضرت علیؓ پر حاضری اور زیارت میں کسی اور دنیاوی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



بات کا خیال شامل کرنے کو تیار نہ تھے۔ اپنی خاص کیفیت میں جسے وہ زندگی کے سب سے انمول لمحات سے تعبیر کرتے ہیں، ہر فکر سے بے نیاز ہوگئے تھے پھر اچانک انہیں ان کا گم شدہ سوٹ کیس جوں کا توں مل گیا۔''

جناب مسعود جمانی بتانے لگے کہ اس سے پہلے ستمبر ۲۰۰۸ء کے دوران میں نے ۱۵ دن کا عمرہ کیا تھا اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دی تھی۔ اس سفرِ مقدس کی داستان بھی عجیب ہے کہ دو تین مرتبہ پہلے کوشش کی تو دفتر سے رخصت نہیں ملی لیکن جب بلاوا آیا تو اس طرح آیا کہ میں اپنے دونوں بڑے بچوں کو بھی ساتھ لے کر گیا۔

اب نجف اشرف اور کربلا کے سفرِ مبارک کا ارادہ کیا تو تنہا ہونے کے سبب ممکن نظر نہ آتا تھا مگر بلاوا تھا تو کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوا۔ قافلے میں ۱۱۶ افراد تھے جبکہ سترہویں فرد امیرِ کارواں سلمان تھے۔ یہ قافلہ ۲۳ اپریل کو کراچی سے روانہ ہوا اور ابوظہبی سے دمشق (شام) پہنچا۔ مسعود جمانی ۲ مئی کو کراچی سے ابوظہبی اور وہاں سے بغداد پہنچے اور انہوں نے اسی شام کو نجف اشرف میں قافلے کو جوائن کیا۔ بعدازاں مسعود جمانی اور دیگر زائرین ۱۱ مئی کو واپس آئے۔

مسعود جمانی سے ۱۰ روز کے اس یادگار سفر کی تفصیل سننے میں زینب اسماعیل کی ترتیب سے مرتب کردہ روداد نے بہت معاونت کی۔ مسعود جمانی کے مطابق بغداد سے نجف اشرف تقریباً ۳۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لہٰذا ٹیکسی میں شاہراہ طوسی پر ہوٹل عبدعلی کے لیے روانہ ہوا۔ پہلے یہ شاہراہ کھلی ہوتی تھی مگر اب اسے ٹریفک کے لیے بند کردیا گیا ہے لہٰذا ٹیکسی والے نے ایک سرے پر اتار دیا۔ ابھی چند قدم ہی پیدل چلا تھا کہ سڑک پر زاویہ بدلتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ مولا علیؑ کا پرشکوہ روضۂ مبارک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ شام ۴ بجے کا وقت تھا۔ میں نے نمازِ ظہرین بھی ادا نہیں کی تھی۔ روضۂ مبارک کے سامنے کھڑا اپنے آپ کو سنبھالنے اور سمیٹنے لگا کہ مجھ گناہ گار کی یہ قسمت لیکن ہمت نہیں تھی کہ اندر قدم رکھوں پھر باوضو بھی تو نہیں تھا، فوراً بھائی جان اقبال جمانی صاحب کو کراچی فون کرکے اپنی دلی کیفیت بیان کی۔ ہوٹل پہنچ کر اپنا کمرہ لیا، ابھی

قافلے والے نہیں آئے تھے، انہیں براہِ راست نجف ایئرپورٹ پہنچنا تھا۔ میں نے وضو کرکے نمازِ ظہرین ادا کی پھر قافلے والے آگئے جس میں میرے بہنوئی نصارالحسن بھی تھے۔ ہمارا ہوٹل روضۂ علیؑ سے ۵۰ قدم کے فاصلے پر تھا، چنانچہ تھوڑی دیر بعد ساڑھے ۵ بجے ہم سب روضۂ علیؑ پر حاضر تھے۔

سب سے پہلے ہم سب نے نمازیں پڑھیں پھر زیارتِ دخولِ روضہ پڑھنے کے بعد اندر کے حصے میں قدم رکھا۔ امیرِ کارواں کے سوا تمام کے تمام ۱۷ افراد پہلی بار مولا علیؑ کے دربار میں آئے تھے لہٰذا سب کی دلی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔ ہچکیوں کے ساتھ زاروقطار روتے ہوئے ہم اندر جارہے تھے۔ بہت رش تھا اور بہت سے لوگ ضریح سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ شاید دوسری یا تیسری بار آنے والوں کی کیفیت قدرے مختلف ہوتی ہوگی لیکن ہم چونکہ پہلی بار آئے تھے لہٰذا بے ساختگی کے ساتھ ہمارا رونا فطری تھا۔

روضۂ مبارک کی ضریح کے احاطے میں دو انبیاءؑ کے مزارِ مبارک بھی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام۔

کسی کو حرم میں نہ موبائل فون لے جانے کی اجازت ہے اور نہ کیمرے کی۔ حضرت علیؑ کے روضۂ مبارک پر حاضری کے بعد میرا دوسرا فون نجف سے کراچی میں میری بڑی بہن کے لیے تھا۔ جب میں نے اپنی بہن کو بتایا کہ میں نے تمہارا نام لے کر تمہارے لیے دُعا کی ہے تو خوب رویا۔ اس دوران میری بہن نے یہ حیرت انگیز بات سنائی کہ اب سے ایک گھنٹہ پہلے مجھے اس کا اندازہ ہوگیا تھا کیونکہ پھولوں کی مہک کے ساتھ ایک خوشگوار جھونکا میرے وجود کو چھو کر گزرا تھا۔ یہ یقینی طور پر وہی وقت تھا جب میں مولا علیؑ کے دربار میں اُن کی عرضی پیش کررہا تھا۔

۳ مئی کو ہم نے مسجد حنانہ، مزار کمیل ابن زیاد اور مسجد سہلا کی زیارت کی۔ عربی میں ''حنانہ'' کے لفظی معنی ''رونے'' کے بتائے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ جب حسنینؑ نے حضرت علیؑ کا جنازہ لے جاکر مسجد میں رکھا تو ساری رات یہ مسجد روئی تھی چنانچہ اس کا مینار قدرے جھک گیا تھا اور آج تک جھکا ہوا ہے۔

حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ عالی مقام نے دشمنوں کی نظر سے بچنے کے لیے رات کے وقت تدفین کی تھی اور اس سے قبل جنازہ مسجد حنانہ میں لاکر رکھا تھا۔ حضرت علیؑ کا روضۂ مبارک ایک ویران سی جگہ بنایا گیا تھا اور بڑے عرصے بعد یہ راز کھلا کہ آپ کا روضۂ مبارک یہاں ہے۔ ماضی کا یہ ویرانہ آج ہر وقت رونق سے جگمگاتا رہتا ہے۔

کمیل ابنِ زیاد کا شمار حضرت علیؑ کے وفادار ساتھیوں میں ہوتا تھا اور ان کے نام سے منسوب ''دُعائے کمیل'' ہر مومن کے گھر میں پڑھی جاتی ہے۔ تاریخ میں جناب کمیل ابنِ زیادہ اور میثم تمار کی وفاداری مسلمہ اور مثالی ہے۔ حضرت علیؑ سے وفاداری پر ان دونوں کی زبانیں گدی سے کھینچ لی گئی تھیں۔ مسجد سہلا کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاءؑ نے نمازیں پڑھیں اور یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت امام مہدیؑ کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ ہر بدھ کو آپ یہاں کسی نہ کسی شکل میں آتے ہیں اور زواروں کو اپنی زیارت کراتے ہیں۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ہم جس وقت مسجد میں گئے، وہ بدھ کی شب اور مغربین کا وقت ہی تھا۔

یہاں مقامِ ابراہیمؑ مقامِ ادریسؑ مقامِ خضرؑ مقامِ انبیاءؑ مقامِ امام صادقؑ مقام زین العابدینؑ اور مقامِ صاحب الزماں ہر شخص کی توجہ کا مرکز رہتے ہیں۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ مسجد سہلا کے بعد ایران کے شہر قم میں مسجدِ جمکران کے بارے میں بھی ایسی ہی روایت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ یہاں حضرت امام مہدیؑ ہر بدھ کی رات تشریف لاتے ہیں۔

۴ مئی کو ہم نے حضرت امام حسنؑ عالی مقام کے پوتے حضرت ابراہیم مسنہؒ کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت ابراہیم مسنہؒ کے بھائی حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کا مزار کلفٹن' کراچی میں موجود ہے جس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کے بعد مولا علیؑ کے جانثار ساتھی میثم تمار کے مزار پر گئے پھر مقام امامِ زین العابدینؑ اور مقام صفی صفہؒ کی زیارت کی۔



نجف اشرف میں حضرت علیؑ کے روضۂ مبارک کا بیرونی منظر

حضرت صفی صفہ بھی مولا علیؑ کے وفادار ساتھیوں میں سے تھے۔ شاہراہِ طوسی کے قریب وادیٔ سلام میں دو انبیاء حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے مزارات ساتھ ساتھ ہیں۔ روایت ہے کہ جو شخص وادیٔ سلام میں مدفون ہوگا' وہ قبر کے سوال جواب سے بری الذمہ ہو جائے گا۔ اُسی دن شام کو عصر کے وقت ہم مسجد کوفہ گئے جس کے ساتھ ہی مولا علیؑ کا گھر ہے اور وہ کنواں دیکھا جسے امیر المومنین نے کھدوایا تھا چونکہ اس کنویں کا پانی شفا کے لیے بھی عقیدت کے ساتھ پیا جاتا ہے لہٰذا ہم نے بھی اس کا پانی پینے کا شرف حاصل کیا۔ امام عالی مقام حضرت حسینؑ کی بہن حضرت خدیجہؑ بنت علیؑ کا مزارِ مبارک بھی مسجد کوفہ کے ساتھ ہے لہٰذا اس پر حاضری دی۔ اُسی روز دو علمائے دین شیخ فیاض اور شیخ بشیر سے ملاقات ہوئی جن سے ہم نے دینی اور شرعی موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔

مسجد کوفہ کے تمام اعمال (دو رکعت نفل' زیارت اور دُعائیں) بھی کیے یعنی جو خاص مقامات ہیں' اُن پر حاضری دی مثلاً باب ساباں' مقام حضرت ابراہیمؑ' مقام حضرت خضرؑ عدالتِ مولا علیؑ' معجزہ امیر المومنینؑ' مقام حضرت نوحؑ' معراج النبیؐ کا مقام' مقام آدمؑ (وہ جگہ جہاں حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی۔)' مقام حضرت جبرائیلؑ' مقام زین العابدینؑ محراب نفلا امیر المومنین (وہ جگہ جہاں حضرت علیؑ نماز نفل پڑھتے تھے۔)' مقام امام صادقؑ (مدرسہ امام صادقؑ)' مسلم بن عقیل (سفیر حضرت امام حسینؑ)' ہانی بن اروا (مسلم بن عقیل کے دوست) اور مختار ثقفی۔

۵ مئی کو ہم قافلے والوں نے آیت اللہ سیستانی سے ملاقات کی اور پھر کربلا کے لیے روانہ ہوئے جو نجف اشرف سے ۹۰ کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔

کربلا میں روایت کے مطابق سب سے پہلے ہم حرم حضرت عباسؑ گئے پھر حرم حضرت امام حسینؑ پر حاضری دی۔ اس کے بعد ہماری منزل امام عالی مقامؑ کے دوست اور رفیق جناب بن مظاہرؑ کا روضہ تھا پھر گنج شہیداں پر سلام عقیدت پیش کیا جہاں شہدائے کربلا اجتماعی مدفون ہیں۔ حضرت ابراہیم مجابؒ کے روضے پر جو حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے داماد تھے' حاضری دینے کے بعد ہم قتل گاہِ مولا حسینؑ پر پہنچے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں امام عالی مقامؑ نے ذوالجناح سے اتر کر آخری سجدہ کیا تھا۔

۶ مئی کو ہم حضرت غازی عباسؑ کے دسترخوان پر حاضر تھے۔ اس کے بعد مقام کفِ عباسؑ کے نام سے موسوم اس جگہ کی زیارت کی جہاں حضرت عباس علمدارؑ کا دایاں بازو قلم ہوا تھا' اس کے بعد مقام کف عباسؑ ہی کے نام سے موسوم اُس جگہ کی زیارت کی جہاں حضرت عباسؑ کا بایاں بازو قلم ہوا تھا جس کے بعد ہم مقام شیر فضہ گئے پھر قائم گاہ کے نام سے موسوم اُس جگہ کی زیارت کو گئے جہاں مولا ابوالفضل کے جانور باندھے گئے تھے۔ ہمیں اُس مقام کی زیارت کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا جہاں حضرت سکینہؑ ۱۰ محرم الحرام کو ذوالجناح کے قدموں سے لپٹ گئی تھیں اور اپنے بابا کو مقتل میں جانے سے روکا تھا۔ حضرت امام حسینؑ کی تلوار کے علاوہ تلہ زینبیہ کے نام سے موسوم اُس جگہ کو بھی سلام پیش کیا جہاں سے حضرت زینبؑ نے اپنے بھائی کو شہید ہوتے دیکھا تھا۔ ۷ مئی کو ہم سب اہلِ قافلہ موسیٰ ابن جعفرؑ اور مقام امام حسینؑ نے عمر بن سعدؒ سے ملاقات کی تھی اور اسے جنگ نہ کرنے اور راستہ دینے کو کہا تھا پھر نہرِ فرات کی زیارت کی جو کربلا کے پیاسے شہیدوں کو پانی پلانے کے لیے ترستی رہی۔ مقام امام صادقؑ اور مقام شہادتِ علی اکبرؑ اور مقام شہادت علی اصغرؑ پر حاضری دی۔

۸ مئی کو حضرت عونؑ کے روضے پر حاضری دی جو حضرت زینبؑ کے فرزند تھے پھر اولادِ مسلم یعنی محمد اور ابراہیم کے روضوں پر حاضری دی اور حضرت حُر کے روضے پر حاضر ہوئے اور اُن کی صداقت اور بہادری کو سلام پیش کیا۔

۹ مئی کو ہماری منزل سامارا تھی جہاں امام علی نقیؑ امام حسن عسکریؑ حکیمہ خاتون' نرجس خاتون' سرداب امام زمانہ اور سید محمد کے روضوں پر حاضری دی۔

۱۰ مئی کو کاظمین میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقی جوادؑ کے روضوں پر حاضری دے کر اور اختتامی دُعا کے بعد پاکستان روانہ ہوئے۔

نجف اشرف اور کربلا جیسا کہ دیگر زائرین بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ روشنیوں' رونقوں اور وسیع و عریض سڑکوں و اونچی عمارتوں کے باوجود من کے اندر کا احساس صدیوں پرانا ہوتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جسے حاضری دینے والا مظلوم شاہوں اور شہزادوں کو اپنے سامنے محسوس کرتے ہوئے دل سے رونے لگتا ہے۔

کربلا اور نجف اشرف میں زائرین کا اژدہام اور جوق در جوق آمد کا سلسلہ تمام سال جاری رہتا ہے۔ دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں اور گلدستہ خانوادۂ رسولؐ کے پھولوں سے اپنے دل کو معطر کرتے ہیں مگر اُن ظالم و جابر حکمرانوں کا نام ونشان نہیں ملتا جنھوں نے برسوں حکمرانی کی۔ ایک اُن کی سلطنتیں تھیں جن کا نام ونشان تک مٹ گیا اور ایک یہ سلطنت ہے جو تاقیامت لاکھوں' کروڑوں دلوں پر حکمرانی کرتی رہے گی۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میری کہانی میری زبانی

سچی کہانیاں کے لکھاری اور قارئین کی کہانی لفظوں کی زبانی

نازلی سحر خان

زندگی لکھ رہی ہوں

فرحت عباس شاہ کا خیال

میری نگاہ میں حدِ نگاہ منزل ہے
میرے سفر میں کہیں سنگِ میل نہیں

زیست سے جڑی ہماری اپنی لکھاری کے حوصلوں، امنگوں کی کہانی کا آخری حصہ

میں پہلے بتا چکی ہوں کہ ہمارا گھر انڈس ہائی وے کے بالکل ساتھ River Indus سڑک کے کنارے دوسری طرف ہے۔ ہمیں یہاں رہائش اختیار کیے بیس سال ہو گئے مگر کبھی یہاں سیلاب نہ آیا تھا گو کہ موسمِ گرما کی طوفانی بارشوں میں وہاں طغیانی آ جاتی تھی۔ جب ابو زندہ تھے تو میں اُن دنوں اکثر ایسے خواب دیکھتی تھی کہ سیلاب آ رہا ہے' لوگ چیخ پکار کر رہے ہیں کہ گھر خالی کرو' بھاگو دوڑو اور سب گاڑیوں میں سوار ہو رہے ہیں۔ میں اکثر سوچتی کہ یہ بار بار سیلاب والے خواب دیکھنے کا آخر مطلب کیا ہے؟ کیا واقعی کبھی اس پُروقار اور سُبک خرام دریا میں سیلاب کی سی کیفیت آئے گی جبکہ گزشتہ کئی سالوں سے اس نے اپنا پاٹ بھی تبدیل کر لیا ہے' کبھی یہ ہمارے گھروں کے بالکل سامنے انڈس ہائی وے کو چھوتے ہوئے گزرتا تھا اور پھر

میرے یہاں سے [illegible] شروع ہوتے ہیں نہ یہ وہاں سے ذرا دور بہنے لگا تھا۔ میں نے کئی بار خواب میں دیکھا کہ میرے ابو بستر پہ بیمار لیٹے ہیں اور کوئی پکارتا ہوا چلا آیا کہ سیلاب آ رہا ہے۔ یہ آواز سن کر ابو مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں کہ جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''اب میں کیا کروں؟ میں تو چل بھی نہیں سکتا۔'' جبکہ مجھے کوئی کھینچ رہا ہے کہ...... ''چلو' وین میں بیٹھو' دریا چڑھ رہا ہے' پانی آ رہا ہے۔''

میں کہتی۔ ''اور ابو؟ ابو کیسے جائیں گے؟''

جواب ملتا ہے' جگہ نہیں ہے' آپ کے ابو کو بستر سمیت گاڑی میں نہیں بٹھایا جا سکتا ہے' انہیں یہیں رہنا ہو گا۔'' میں چیختی' روتی چلاتی کہ میں ابو کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی' میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔'' مگر کوئی مجھے بازو سے پکڑ کر لے جاتا پھر یکایک منظر بدلتا'

ں وہیں اپنی جگہ ہوتی' پیروں تلے زمین یوں گیلی محسوس ہوتی جیسے پانی یہاں سے ہو کر گزر گیا ہو جبکہ ابو کی چارپائی خالی ہوتی۔ ... نہ ہوتے' مجھے شدید صدمہ ہوتا مگر مجھے سمجھ نہ آتی کہ ابو کہاں گئے؟ وہ خود کہیں چلے گئے یا انہیں پانی لے گیا؟ میں ابو کو نہ پا کر رونے لگتی اور پھر میری آنکھ کھل جاتی۔ میں فوراً ابو کے بستر پہ انہیں دیکھنے دوڑتی' وہ یوں ہی گہری نیند میں ہوتے۔ میں انہیں چھوئے بغیر کچھ دیر ان کے پاس ٹھہر کر انہیں غور سے دیکھتی' ان کی سانس بے حد دھیمی چل رہی ہوتی' پتہ نہیں کیوں ہر دفعہ مجھے ایسا لگتا کہ...... جیسے اب بھی وہ کچھ مانگ رہے ہیں' کوئی کمی ہے جو وہ پوری کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ مجھے سمجھ نہ آتی۔ خیر' جب مجھے اطمینان ہو جاتا کہ وہ آرام سے ہیں تو میں پُرسکون ہو کر اپنے کمرے میں لوٹ آتی اور شکر ادا کرتی کہ یہ صرف ایک بہت بھیانک خواب تھا۔

مجھے جب بھی ایسا خواب نظر آتا تو میں امی سے کہتی کہ...... ''یہاں اگر سچ مچ سیلاب آئے گا تو ہم لوگ کدھر جائیں گے؟''

میرے ابو نے ۲۲ جون کو جب ۷۰ سال کی عمر میں وفات پائی تھی تو ویسے تو شدید گرمی تھی۔ جون سے جولائی آ گیا تھا...... ابو کی یاد میں میری آنکھوں سے بہنے والے آنسو اب تھم گئے تھے مگر آسمان تھا کہ برس برس کر رو رہا تھا' خاموش ہی نہ ہوتا تھا۔ افواہ اڑی کہ ریکارڈ طوفانی بارشوں کے سبب ڈیم بھر رہا ہے۔ دریا میں سیلاب کا خطرہ ہے۔ میں شام کو بھائی کے ہمراہ ہائی وے پہ گئی۔ گہرے بادل اور لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اندھیرا تھا' زیادہ تر ماہی گیر اپنی جھونپڑیاں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ایک جھونپڑی میں کچھ لوگ موجود تھے۔ دریا کا پانی کنارے سے اُگی گھاس پر چڑھ آیا تھا اور بند کے بالکل آخری پتھروں کو چھو رہا تھا۔

''بھائی! پانی کا زور کچھ زیادہ نہیں ہو رہا؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہاں لیکن صبح کو تو پانی کنارے کے اوپر بھی نہیں تھا البتہ سنا ہے کہ دریا کے مشرق میں پنجاب اور کچے کے علاقوں میں سیلاب کا شدید خطرہ ہے۔''

''اگر یہاں سیلاب آ گیا تو یہ جھونپڑی تو ڈوب جائے گی۔ یہ لوگ جاتے کیوں نہیں؟'' بھائی کی بات کے جواب میں' میں نے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

''اللہ کرے' ایسا نہ ہو' اگر یہاں دریا چڑھ آیا تو پھر شہر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا لیکن ایسا پچھلے تیس سال میں کبھی نہیں ہوا ہے۔'' بھائی دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے اور میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بار عب دریا کی پُرہیبت روانی دیکھ رہی تھی' تب میں جھونپڑی والوں کو ایک راہ چلتے راہ گیر نے سیلاب سے بچنے کی تلقین کی تھی مگر وہ ٹی وی لگائے پانی میں چارپائیاں ڈالے سکون سے ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔

''ارے بھائی......! تو ہماری فکر میں مر نہیں۔ نہیں آتا سیلاب۔ اس دریا میں اس سے زیادہ پانی کبھی نہیں آیا ہے۔'' ایک ماہی گیر نے ہنستے ہوئے کہا تھا...... اس وقت جھونپڑی کے کنارے لگے واحد بلب کی روشنی کا ہالہ نیچے پانی میں چمک رہا تھا' لرز رہا تھا۔

میں بھائی کے ساتھ گھر چلی آئی تھی۔ رات کو سارا علاقہ ہی تشویش کے عالم میں رہا۔ اس رات کو میں سوئی تو خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ...... میں بارہ' تیرہ سالہ بچی کے روپ میں سفید کپڑے پہنے ایک گلی میں بھاگ رہی ہوں کہ...... سامنے سے انڈس ہائی وے کے دوسری طرف سے دریا کسی سونامی کی طرح امڈ کر ہماری بستی کی طرف آنے لگتا ہے' میں گھبرا کر الٹے قدموں بھاگتی ہوں اور گھر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قریب ہی رہنے والی ایک دوست کے گھر کے اندر جانے لگتی ہوں، اس وقت مجھے گلی میں چند بچے سیلاب کی صورت آنے والی خطرناک موجوں سے بے نیاز کھیلتے نظر آتے ہیں، میں چیخ کر کہتی ہوں۔

''بچو......! چھتوں پہ چڑھ جاؤ، سیلاب آ رہا ہے۔''

مگر میرا گلا بیٹھ جاتا ہے، میں بات نہیں کر پاتی پھر یکبارگی منظر بدلتا ہے تو میں دیکھتی ہوں کہ پانی جا چکا ہے یعنی اتر گیا ہے۔

صبح میری آنکھ بہت دیر سے کھلی، میرے دانت میں کچھ تکلیف ہو رہی تھی، ڈاکٹر کے پاس جانا تھا، اِس مقصد کی خاطر بھائی کے ہمراہ گھر سے نکل کر سڑک پہ آئی تو دنگ رہ گئی۔ ''یہ کیا......؟ اتنا پانی؟......کل تو ایسا کچھ نہ تھا، درخت، جھونپڑیاں، سب اونچی نیچی جگہیں پانی میں غرق تھیں، دریا کسی پانی بھرے پرات کی طرح لگ رہا تھا جو زیادہ حجم ہونے کے باعث چھلکنے لگتی ہے۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ کل رات کے خواب کا منظر میرے سامنے تھا البتہ پانی ابھی سڑک سے تقریباً آٹھ فٹ نیچے تھا۔ پانی کی رفتار تیز ترین تھی اور آواز بہت خوفناک تھی، ہمارے گھر سے کچھ دور یہ دریا بل کھاتی سڑک کے ساتھ پنجاب کی طرف مڑ جاتا ہے۔ دریا کے پاٹ میں بل دار گولائی کے سبب بھنور بن رہے تھے۔ میں نے آج تک اِس دریا میں اتنا پانی نہیں دیکھا تھا۔ بے اختیار مجھے ابو جی کی یاد آ گئی تھی۔

''ابو......! یہ وہی دریا ہے جس میں آپ کے کندھے پہ بیٹھ کر نہاتی تھی، جس میں آپ نے دو بچوں کی جان بچائی تھی؟ آج یہ آپ کا اور میرا دریا نہیں ہے، آج یہ کوئی عذاب ہے، آزمائش ہے، عفریت ہے جو سامنے آنے والی ہر چیز کو اپنے اندر اتار رہی ہے، مٹا رہی ہے۔''

پانی کی شدت اور اونچائی میں ایک ایک فٹ کے حساب سے اضافہ ہو رہا تھا۔ پورے شہر کی خصوصاً ہمارے علاقے کے لوگوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ خبر آئی تھی کہ آس پاس کے سب نواحی علاقے شدید سیلاب کی زد میں آ گئے ہیں، لوگ اُن علاقوں کو چھوڑ کر یہاں آ رہے تھے۔ مقامی حکومت نے ان کو اسکولوں کی عمارتوں میں شفٹ کر دیا تھا۔ پورا شہر ان سیلاب زدگان کی مدد کے لیے اپنی بھرپور کوشش کر رہا تھا، چندہ اکٹھا کیا جا رہا تھا، کھانے کا انتظام کیا جا رہا تھا، روز بیسیوں دیگیں پکائی جا رہی تھیں اور یہ اخراجات مخیّر حضرات کے ساتھ عام لوگ بھی اٹھا رہے تھے کیونکہ حکومت کی طرف سے کوئی امداد نہیں آ رہی تھی اور پھر نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ شہر کے نواحی علاقوں میں سیلاب کا پانی اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کا باقی علاقوں سے رابطہ مکمل طور پر کٹ گیا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پہ بار بار ایسے پروگرام آ رہے تھے جن میں اپنے بچاؤ کے اقدامات کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ میں نے بھی گھر کے اندر موجود سب ضروری ڈاکومنٹس، اسناد، چیک بک، آئی ڈی کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ پلاسٹک کور میں پن اپ کر کے بہت اونچی جگہ پہ رکھ دیئے تھے۔ اب خطرہ ہمارے سروں پہ منڈلا رہا تھا مگر ہم بے بس تھے۔ قریب ہی موجود فوجی چھاؤنی کے جوان ہائی وے پہ بڑی مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی لانچیں بھی وہاں کھڑی کر دی تھیں تاکہ اچانک خطرے کا سامنا کیا جا سکے۔

بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا......ڈی آئی خان میں ریکارڈ بارش ہوئی تھی۔ شہر سے رشتے دار اور دوسرے جاننے والے فون کر کے دریا کی صورتِ حال پوچھتے اور ہم الٹا اُن کو تسلیاں دیتے۔ پانی کی سرکشی میں اضافہ ہوتا رہا، اس کے باعث ہونے

والے نقصانات کی خبریں آتی رہیں۔ کبھی ہنڈولے میں کوئی بچہ آ رہا ہے تو کبھی کوئی لاش تیر رہی ہے، کبھی کسی کے مویشی پانی کی ظالم موجوں میں شور مچاتے بہتے چلے جا رہے تھے۔ لوگ اَب خوف کی حالت میں گھروں سے باہر ہی رہنے لگے تھے اور دریا کے کنارے لوگوں کا ہجوم سا تھا۔ حیرت کی بات تھی، ہماری تو مجبوری تھی، باقی لوگوں کو جانے کیا ہو گیا تھا؟ جہاں کا خطرہ تھا، وہیں کا رخ کر رہے تھے۔

ایک روز مجھ سے رہا نہ گیا، پڑوس کے بچے کو ساتھ لے کر میں ہائی وے پہ آ گئی۔ پانی کی اونچائی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ کسی بھی بری صورتِ حال سے مقابلے کے لیے تیار لوگوں کے گروپ، ماہی گیروں کے شور مچاتے بچے، کچھ فاصلے پہ فوجی چوکی اور پہرہ دیتے ہوئے مستعد فوجی جوان، دریا کے بالکل سامنے ہاسپٹل میں سیلاب زدگان کے لیے فری کیمپس......''یہ سب کیا ہو رہا ہے اللہ میاں؟ کیا ہمارا شہر ڈوب جائے گا؟'' میں نے تشویش سے سوچا۔ ''اگر پانی چڑھ آیا تو ہم کہاں جائیں گے؟'' مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا......گھر آئی تو اللہ کے حضور رو رو کر سب کے لیے خیر کی دُعائیں مانگیں، اسے اس کے حبیبؐ اور اس کے گھر کے واسطے دیئے اور پھر جیسے ہمارے شہر پہ اللہ کا خاص کرم ہوا، بارشوں کا زور ٹوٹ گیا، کالے سیاہ بادلوں کی گھن گرج ختم ہو گئی اور بپھرا ہوا سیلاب ہمارے شہر کی کنی کو چھوتے گزر گیا، دریا یوں اتر گیا جیسے کبھی چڑھا نہ ہو اور پھر جیسے ہی یہ خطرہ ٹلا تو مجھے بے اختیار ابو کی یاد آ گئی۔ میں اُس جگہ بیٹھ کر انہیں نم آنکھوں کے ساتھ یاد کرتی رہی جہاں اُن کا بستر لگا ہوتا تھا۔ اب وہ جگہ خالی تھی نہ وہ بستر تھا اور نہ ابو جی جنہوں نے تین سال اُس بستر پہ خاموشی سے گزارے تھے۔

......

حضور ﷺ نے فرمایا

سیدنا تمیم الداریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''دین خلوص اور خیر خواہی کا نام ہے۔'' ہم نے کہا کہ کس کی خیر خواہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ کی، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کے حاکموں کی اور سب مسلمانوں کی۔ (یعنی ہر مسلمان، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اپنے حاکم کی فرماں برداری کرے اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے حقوق ادا کرے)

میں اور ابو......اب ہماری کہانی کا اختتام ہو چکا ہے، شاید آپ قارئین ''سچی کہانیاں'' کو یہ باتیں خودنمائی یا افسانوی باتیں لگیں مگر جہاں قدرت اللہ شہاب اپنی والدہ پہ پوری کتاب ''ماں جی!'' لکھ سکتے ہیں تو میں اپنے ابو جی پہ ایک کہانی نہیں لکھ سکتی کیا؟ قدرت اللہ شہاب کی ''ماں جی!'' بھی تو بالکل میرے ''ابو جی'' کی جیسی ہی ایک عام سی، سیدھی سادی انسان تھیں اور پھر سچی بات تو یہ بھی ہے کہ......میں نے اِس کہانی کی صورت اپنے ابو سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں سچی کہانیاں لکھا کروں......سر ناصر رضا، میرے ابو جی کے بعد وہ واحد انسان ہیں جنہوں نے میری تحریروں کی حوصلہ افزائی کی، مجھے ایک رائٹر کی حیثیت سے متعارف کرایا، جب سے اُن کی شاگردی میں آئی ہوں تو ماشاء اللہ، قلم میں رَوانی آ گئی ہے اور زورِ قلم اُن کی تربیت اور دُعاؤں کی وجہ سے دن بدن زیادہ ہو رہا ہے۔ میری شاعری کی بیل بھی اَب بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے۔ میں اپنی شاعری کو یکجا کر کے مجموعے کی شکل دینا چاہتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ دو طویل ناول بھی شروع کرنے والی ہوں۔ ان کو بھی کتابی شکل دینی ہے۔ قلم اور قرطاس کی اس خوبصورت دنیا میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ میرے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ سر ناصر رَضا کی طرح میں بھی بابا جی (اشفاق احمد) کو اپنا رُوحانی استاد سمجھتی تھی، اُن کی سوچ اور اسلوب مجھے بہت پسند ہیں، جب اُن کا انتقال ہوا تھا تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے ''رُوحانی بابا'' فوت ہو گئے ہوں۔ اُن سے مجھے بہت دلی لگاؤ تھا۔ مجھے شاعری میں علامہ اقبالؒ، ناصر کاظمی، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض اور احمد فراز بہت زیادہ پسند ہیں، خصوصاً علامہ اقبالؒ سے بے حد متاثر ہوں۔ اُن جیسا شاعر، مفکر میری ذاتی رائے میں اس پوری دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے انگلش ادب میں ماسٹرز کیا ہے اس لیے مغربی رائٹرز بھی بہت پسند ہیں۔

Milton اور Keats، Shelley، St.coleridge، T.S Eliot میرے پسندیدہ poets ہیں۔ شیکسپیئر کے dramas بہت پسند ہیں۔ ناول نگاروں میں Virginia wolf بہت پسند ہیں۔ ارادہ ہے کہ انگریزی ادب کا اردو میں ترجمہ کروں۔ اگر سر ناصر رَضا نے حوصلہ افزائی کی تو میں جلد ہی انگریزی ماخوذ کہانی تحریر کروں گی۔ کتابوں کے حوالے سے رُوحانیت، تصوف اور مذہب میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ تصوف پہ مبنی بہت سی کتابیں پڑھ چکی ہوں۔ نورالہدیٰ (سلطان باہوؒ)، کشف المحجوب، کلامِ باہوؒ، کلام بھلے شاہؒ، کلامِ بابا فریدؒ میری پسندیدہ تصانیف ہیں اور ابھی پیاس اور بھی ہے۔ تصوف اور رُوحانیت کی دنیا کو explore کرکے ''حقیقت'' اور ''طریقت'' کی اِس خوبصورت سمندر کی اتھاہ گہرائی میں اترنے کی خواہش ہے۔ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے سر ناصر رَضا کے علاوہ ''دوشیزہ'' کی ایڈیٹر انچارج غزالہ رشید آپی سے بھی میرا قلمی رابطہ ہے اور ایک تحریر کی صورت ماہنامہ ''دوشیزہ'' سے قلمی سفر بھی شروع ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ......

میرے ابو جی مجھے جو بنانا چاہتے تھے، مکمل طور پر نہ سہی، کم و بیش اُس ٹارگٹ کو achieve کر چکی ہوں۔ میں اِن دنوں ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچنگ کر رہی ہوں مگر میرا سفر ابھی جاری ہے کہ......

ستاروں سے آگے اور جہاں تسخیر کرنے اور عشق کے نئے امتحانوں سے گزرنے کو تیار ہوں۔ بقول اقبالؒ، عشق ایک جذبہ، شوق و جدوجہد ہے۔ اگر یہ شوق انسان میں ہو تو وہ سب کچھ پا سکتا ہے، خودی اور خود شناسی ہو جائے تو انسان خدا شناسی اور خدا کی ہر مخلوق کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے اور خدا شناسی انسان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ میں علامہ اقبالؒ کے اِس قول سے...... ''عشق زندگی کے ہر میدان، ہر شعبے کے لیے ضروری ہے۔'' مکمل اتفاق کرتی ہوں......

اور میرا عشق اپنے ابو جی اور قلم کاری سے ہے۔ میرے خیال میں اولاد کی زندگی پہ ماں باپ کی شخصیتوں کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ کبھی کسی نے بتایا تھا کہ اگر والدین کی محبتوں کا حق ادا کرنا چاہتے ہو تو اُن کے لیے زیادہ سے زیادہ دُعا کرو کیونکہ اللہ کی رَضا ماں باپ کی رَضا میں پنہاں ہے اور اولاد کے حق میں ماں باپ کی اور ماں باپ کے حق میں صرف اولاد کی دُعا ہی اثر لاتی ہے۔ آج ابو جی بظاہر میرے پاس نہیں ہیں مگر وہ میری دُعاؤں میں زندہ ہیں۔ میں نے اپنا ہر عمل، ہر ذکر، ہر نفل کا اَجر اپنے ابو جی کے نام کر دیا ہے۔ میری کوشش ہے کہ اُن کو زیادہ سے زیادہ ایصالِ ثواب بھیجوں تاکہ اُن کی قبر میں روشنی ہو اور کبھی اندھیرا نہ آئے۔ یہی اولاد کا فرض ہے۔ بس یہی ہے میری کہانی!



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہِ ذوالقعدہ

عزیزو......!

ذوالقعدہ کا مہینہ بھی حرمت والے مہینوں میں سے ہے کہ جن میں جدال وقتال حرام ہے لیکن اسلام کے نام پر قائم کیے گئے اِس پاک وطن میں آج کیا ہو رہا ہے؟

عزیزو......! اپنے لیے اور اپنے تمام جاننے والوں کے لیے بلکہ تمام انسانیت کے لیے دُعا کریں۔

اللہ ہم سب کو اپنی اَمان میں رکھے۔ دل دکھ سے بھرا ہوا ہے۔ یقیناً وہ لوگ بہت خوش نصیب تھے جو اپنے پیاروں اور اپنی زمین کو خون میں رنگا نہ دیکھ سکے۔ میری نازک اور رحمتوں والی بچیاں بھی اب خون میں نہا رہی ہیں۔ یہ بہت کڑا اور امتحان کا وقت ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔ (آمین!)

عــزیـزو......! اللہ تمام پاکستانیوں اور تمام سلمانوں پر اپنا خصوصی کرم فرمائے۔ ہماری وتاہیوں کو معاف کردے اور ہم سب کو اپنے متعین لردہ راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بس ماری یہی دُعا ہونی چاہیے۔ آج کل ڈینگی وائرس نے پورے ملک میں تباہی مچائی ہوئی ہے' تقریباً ہر ہر میں لوگ اپنے پیاروں کو لحد میں اتار رہے ہیں۔ للہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ میں اپنے بچوں کو یحت کروں گا کہ کھانے میں پپیتے کا استعمال ضرور ھیں۔ پپیتے کے پتے توڑ کر اچھی طرح صاف کر کے پانی میں ابالیں۔ تین چار بار جوش آنے پر اتار کر ٹھنڈا کر کے یہ پانی تمام گھر والے استعمال کریں۔ دوا کے ساتھ دُعا بھی ضروری ہے لہٰذا ہرے رنگ کا دھاگہ لیں اور 7 بار سورۃ یٰسین پڑھیں' گرہ لگائیں پھر دوسری بار پھر تیسری بار۔ اس طرح سات بار کریں اور یہ دھاگہ بچوں کے اور بڑوں کے گلے میں پہنا دیں۔ انشاء اللہ' ہر قسم کے وبائی امراض سے حفاظت ہوگی۔ نماز کی پابندی اور بکثرت توبہ استغفار بہت ضروری ہے۔

انسان ہر شے کو معمولی سمجھتا ہے مگر وہ یہ بھول گیا ہے کہ سب سے کم تر وہ خود ہے ورنہ مچھر جیسا معمولی حشرہ نمرود اور سکندرِ اعظم کی ہلاکت کا باعث نہ بنتا۔ اپنے رَب کی بارگاہ میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ معافی کے طلب گار رہوں کہ شاید پھر موقع ملے نہ ملے۔

□ رضوانہ کریم' پنڈی۔

○ باباجی! میں بہت پریشان ہوں۔ میرے مالی حالات بہت خراب ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں۔ کئی ضروریات ہوتی ہیں جو پوری نہیں کرپاتے۔ میرے شوہر بہت محنت کرتے ہیں' دو دو نوکریاں کرتے ہیں پھر بھی ہم بہت پریشان رہتے ہیں۔ بڑوں کی تو خیر ہے مگر جب بچوں کو ترستا دیکھتی ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے روزی میں بہت برکت عطا ہو۔

☆ بیٹی رضوانہ......! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ یقیناً مہنگائی بہت ہے مگر بیٹی......! زندہ تو رہنا ہے۔ پریشان ہونے سے اب تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ معاملات خراب ہی ہوتے ہیں۔ اپنی ضروریات کو محدود کرو۔ نماز کی پابندی رکھو۔ بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ واقعہ پڑھو اور دُعا کرو۔ وقتاً فوقتاً ترجمہ بھی ضرور پڑھا کرو۔ اس کے علاوہ یارزاق کا بہت وِرد کرو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ یاد رکھو' اللہ تبارک وتعالیٰ کو مایوس لوگ پسند نہیں۔

□ شبانہ ناز۔ Hyd-

☆ بیٹی شبانہ......! اپنی والدہ کا کہا مان لو' وہ درست سوچ رہی ہیں۔ اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے گا۔

□ سلمٰی احمد' لاہور۔

○ بابا سائیں......! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ تین چار ماہ قبل آپ سے اپنے بیٹے کے بارے میں وظیفہ لیا تھا۔ وہ بہت سوچتا ہے اور منفی باتیں اس کے ذہن میں مہینوں گردش کرتی رہتی ہیں۔ اُس کے اِس رویئے کی وجہ سے ہمارے گھر کا ماحول بہت خراب رہتا ہے۔ آپ نے وظیفہ دیا تھا مگر بابا سائیں......! سچی بات ہے' میں پابندی سے نہیں کرسکی۔ خاندان بھر میں بیٹے کا مذاق بنا رہتا ہے' کوئی ترس کھا رہا ہوتا ہے' کوئی مجھے اور اس کے ابو کو الزام دے رہا ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کی تو پروا نہیں مگر بیٹے کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ آپ تعویذ دیتے ہیں' مجھے بھی عنایت کریں' میں آپ کو بہت دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی سلمٰی......! تعویذ کے لیے مجھے براہ راست خط لکھو۔ بیٹے کی تاریخِ پیدائش اور مکمل نام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرور ارسال کرو۔

□ شازیہ ملک' اٹک۔

o بابا جی......! میں نے آپ کو کئی بار خط لکھے مگر صرف ایک بار جواب ملا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ آپ رسالے میں جواب دیں کیونکہ رسالہ میں ہر ماہ لیتی ہوں۔ بابا جی! میں ایک لڑکے سے بہت محبت کرتی ہوں مگر وہ شادی شدہ ہے۔ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔ ہم لوگ چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ بابا جی......! مجھے ایسا تعویذ دیں کہ وہ مجھ سے دوسری شادی کر لے۔ میں وعدہ کرتی ہوں' میں اس کی بیوی کو تنگ نہیں کروں گی۔ وہ پشاور کا رہنے والا ہے اور نوکری کے سلسلے میں اٹک میں ہے۔ میرے بھائیوں کی اس سے بہت اچھی سلام دُعا ہے۔ بابا جی......! پلیز' میری مدد کریں' میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔

☆ بیٹی شازیہ......! اللہ تمہیں عقل دے۔ ہر وقت باوضو رہا کرو۔ پابندی سے نماز ادا کرو اور کثرت سے استغفار پڑھا کرو۔ تم پر شیطان مسلط ہے لہٰذا سمجھانا بے کار ہے۔ اگر چاہتی ہو' دنیا میں بھی عزت ملے اور آخرت میں اچھا مقام عطا ہو تو اللہ سے خوب گڑگڑا کر معافی مانگو اور والدین کی خدمت کو اپنا شعار بنالو۔ بے شک وہ مہربان ہے اور معافی طلب کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

□ طاہر خان' پشاور۔

o بابا جی......! کچھ عرصہ قبل اتفاق سے سچی کہانیاں دیکھا' آپ کا کالم پڑھا' بہت اچھا لگا۔ ہم لوگوں کی بدقسمتی یہی ہے کہ قرآن مجید گھروں میں موجود ہے مگر پڑھنے کا وقت نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو سمجھتے نہیں۔ بابا جی......! میں نے چھ ماہ قبل صرف شک کی بنیاد پر اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ وہ پاؤں پکڑ کر اپنی صفائیاں دیتی رہی اور میں نے ایک نہ سنی۔ 15 دن قبل مجھے پتہ چلا کہ یہ ساری سازش میری ماں اور بہنوں کی تھی مگر اس وقت میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ اب جب سے مجھے حقیقت پتہ چلی ہے' میرا دل بہت بے چین ہے' کسی پل سکون نہیں' دل چاہتا ہے' سب کو مار دوں۔ اب بتایئے' میں کیا کروں؟

☆ بیٹے طاہر! ایک غلطی کر چکے ہو' اب مزید غلطیاں مت کرنا۔ کوئی کسی کو نہیں تباہ کرتا جب تک وہ شخص خود نہ چاہے۔ تم نے ماں بہنوں کی باتیں سچ مان کر اپنا نقصان کیا۔ اللہ نے تمہیں آنکھیں دی تھیں' عقل دی تھی مگر تم نے استعمال نہیں کی۔ بہرحال ایک بات یاد رکھنا' ہر رشتے کی ایک حد ہے' جب وہ حد پار ہوتی ہے تو زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ کاظم رضا' لاہور۔

o باباجان! میری والدہ آپ سے رابطہ میں رہتی ہیں۔ وہ آج کل امریکا بڑے بھائی کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ میرے بڑے بھائی بہت پریشان ہیں' ان پر کچھ چھوٹے کیسز ان کے پارٹنر نے بنا دیئے ہیں اس لیے ہم سب بہت پریشان ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ خاص دُعا کا اہتمام کیجیے۔

☆ بیٹے کاظم......! اللہ تم لوگوں کو اس مشکل سے خیروعافیت سے نکالے۔ والدہ سے کہو' ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں بیٹے پر ضرور دم کریں۔ نیت کرلیں کہ مشکل حل ہونے کے بعد حسبِ استطاعت رقم خیرات کریں گی۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھیں۔ چلتے پھرتے یاسلامُ کا بہت ورد کریں اور یہ ورد گھر کے تمام افراد کریں تو بہت اچھا ہے۔ تم نے جو تفصیل بھیجی ہے' اس حساب سے کاغذی کارروائی میں بھائی سے چوک ہوگئی ہے اس لیے کیس خلاف جا رہا ہے۔ وکیل ٹھیک ہے' دھوکا نہیں دے گا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔ میں بھی دُعا کا اہتمام کر رہا ہوں۔

□ پروین اسلم' پنڈی۔

o باباجان! میری عمر اس وقت 35 سال ہے۔ چار سال قبل جاننے والوں میں شادی ہوئی تھی۔ اولاد نہ ہوئی اس لیے ساس نے میکے بھجوا دیا۔ یہ میرے شوہر کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی کو بیٹیاں ہوئیں اس لیے اس کو چھوڑ دیا۔ باباجان......! ڈاکٹر کے مطابق اللہ کی طرف سے دیر ہے' بس اب ایک سال سے مجھے ماں باپ کے گھر چھوڑا ہوا ہے۔ بنا کسی غلطی کے میں گناہ گار بنا دی گئی۔ شوہر کوئی رابطہ نہیں کرتے۔ میرے گھر والے بھی مجھے واپس بھیجنے کو تیار نہیں مگر میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ پلیز' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی پروین! تمہارا شوہر انتہائی نامعقول انسان ہے۔ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں' جس شخص نے اللہ کی رحمت کی قدر نہیں کی' وہ زندگی میں کبھی سکون نہیں پائے گا۔ تم اللہ سے دُعا کرو کہ وہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح پڑھو۔

ایاک نعبدوایاک نستعین

مدت ایک ماہ ہے۔

□ شاہد شاہ' لاڑکانہ۔

o باباسائیں......! اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔ آپ کی وجہ سے آج میں نماز کا پابند ہوں۔ بہت شوق سے آپ کا کالم پڑھتا ہوں۔ باباسائیں......! میری بہن کی شادی کو 3 سال ہو گئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہے' بس کمی ہے تو صرف اولاد کی...... میری بہن' میری بیوی کی نند ہے اس لیے بات خاندان کی ہے۔ میرے ہاں دوسرے بچے کی آمد ہے اور بہن کی شادی میری شادی کے ساتھ ہوئی تھی اور وہ اب تک بے اولاد ہے۔ یہ بات سب بہت محسوس کر رہے ہیں۔ آپ بہن کے لیے تعویذ تیار کر دیں تاکہ وہ اپنے گھر میں آباد رہے۔

☆ بیٹے شاہد! بہن کا مکمل نام' شوہر کا نام اور دونوں کی تاریخِ پیدائش ارسال کرو' میں تعویذ تیار کر دوں گا۔ اب جو خط لکھو' وہ جوابی لفافے کے ہمراہ لکھو تاکہ تعویذ کی بابت تمہیں تفصیل بتائی جا سکے۔

□ رقیہ' کرک۔

☆ بیٹی رقیہ......! تمہارا مسئلہ ناقابلِ اشاعت ہے۔ اپنی سوچ درست کرلو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔ یاد رکھو' اللہ بندے کو بار بار موقع نہیں دیتا کہ وہ گناہ کرے اور معافی مانگ لے۔ گناہ پر شرمندہ ہونا ہی معافی کی اصل روح ہے۔ انسان' انسان کو تو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کو دھوکہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

□ جمیلہ رزاق' کوئٹہ۔

o بہت عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کا سوچ رہی تھی مگر کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے رہ جاتی تھی۔ میرا اصل مسئلہ میرے والدین اور سسرال والوں کے درمیان ناچاقی کا ہے جس میں' میں بری طرح پس رہی ہوں۔ میرے شوہر تو مکمل طور پر اپنے والدین کا ساتھ دیتے ہیں مگر میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ غلطی کس کی ہے' یہ ایک لمبی بحث ہے۔ بابا جی! آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ غلطی دونوں فریقوں کی ہی ہوتی ہے۔ اب سب اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں اور شامت ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت میری آتی ہے۔ زندگی میں سکون نہیں ہے' کیا کروں؟

☆ بیٹی جمیلہ! تمہارا مسئلہ پریشان کن ضرور ہے مگر اتنا تکلیف دہ نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ اس معاملے میں بہت حساسیت مت دکھاؤ' یقیناً والدین کو برا کہا جائے تو دکھ ہوتا ہے مگر یہ یاد رکھو کہ جب تمہارے والدین یا تم خود شوہر کے گھر والوں کو برا بھلا کہتے ہو تو وہ بھی مناسب نہیں' فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سن نہیں پاتے مگر یقین رکھو' سمجھتے ضرور ہیں۔ تم پیٹھ پیچھے برائی کرنا اور سننا چھوڑ دو' جواباً تم بھی برا نہیں سنو گی۔ یہ بہت آسان سا اصول ہے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ بڑوں کی خدمت اور عزت کرو۔ تمہارا دل سکون سے بھر جائے گا اور زندگی بہت سہل ہو جائے گی۔

□ صنم' D.G.K.-

o بابا جی! مجھے یقین ہے کہ آپ میرے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالیں گے۔ میں جب 16 سال کی تھی' تب ہمارے پڑوس میں ایک فیملی رہتی تھی جن کا بیٹا مجھ سے 6 یا 7 سال بڑا تھا' ہماری آپس میں دوستی ہو گئی اور ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ شادی کسی اور سے نہیں کریں گے۔ اس وقت میری عمر 23 سال ہے۔ 3 ماہ قبل میری شادی میرے چچا زاد سے ہو گئی مگر میرا دل اب بھی اسی میں ہے۔ اس کے گھر والے اس کے لیے لڑکی دیکھ رہے ہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے اپنے بیٹے کی شادی کریں۔ وہ تو کہتا ہے مگر اس کے گھر والے نہیں مانیں گے۔ میں اس کی خاطر اپنے شوہر کو چھوڑنے کو تیار ہوں۔ آپ مجھے اتنا جلالی وظیفہ دیں کہ وہ لوگ اندھے ہو جائیں اور انہیں بہو کے طور پر صرف میں نظر آؤں۔

☆ بیٹی صنم......! یاد رکھو' کلامِ الٰہی عقل کے اندھوں کو بھی روشنی عطا کرتا ہے نا کہ بینا کو نابینا بنا دے۔ تمہارا کوئی مسئلہ نہیں ہے' صرف دماغی خلل ہے۔ ہر وقت باوضو رہا کرو اور اپنے گناہوں پر اللہ سے معافی کی طلب گار رہو۔ اس وقت تم امانت میں خیانت کی مرتکب ہو رہی ہو' اس کا انجام بہت بھیانک ہے لہٰذا بکثرت استغفار پڑھو اور اپنے والدین کے گھر آنا کم کر دو۔ شوہر کے گھر دل لگاؤ' خوش رہو گی۔

□ ساجد علی' کراچی۔

o بابا جی......! پچھلے 3 سال سے امتحانوں میں ناکام ہو رہا ہوں۔ پڑھنے کی کتنی کوشش کروں' کامیابی نہیں ملتی۔ اتنی نیند آتی ہے کہ بس اور کتاب بند کرتے ہی نیند غائب ہو جاتی ہے۔ اب تو چھوٹے بہن بھائی بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ مجھے اپنے پاپا کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ مجھے کوئی تو ایسا تعویذ دے دیں جس کی برکت سے میں کامیاب ہو جاؤں۔

☆ بیٹے ساجد......! نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو۔ چلتے پھرتے جب جب یاد آئے' الحمد شریف ضرور پڑھا کرو۔ تمہیں اپنے آپ سے وعدہ کرنا ہو گا کہ اس بار خوب محنت کرو گے۔ بیٹے......! یہ امتحان تو بہت معمولی ہوتے ہیں' اصل امتحان تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب تعلیم سے فارغ ہو کر عملی زندگی شروع کی جاتی ہے۔ اس وقت ہر دن ایک نیا امتحان ہوتا ہے۔ اگر ان امتحانوں سے ڈر گئے تو زندگی میں کامیابی کا زینہ کیسے چڑھو گے؟ بس اپنے میں یقین رکھو' اللہ ایسے ہی لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ مجھے نتائج سے ضرور آگاہ کرنا۔

□ رضوانہ' شکارپور۔

☆ بیٹی رضوانہ! اولادِ نرینہ کے لیے میں تعویذ تیار کر دوں گا۔ تم مجھے تفصیل ارسال کرو۔

□ اختر احمد' گجرات۔

o بابا جی! شدید مالی پریشانی کا شکار ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ گھر والے گاؤں میں ہیں اور میں اسلام آباد میں نوکری کرتا ہوں۔ پوری کی پوری تنخواہ گھر بھجواتا ہوں مگر پورا نہیں پڑتا۔ بابا جی! کھانا بھی دو وقت کھاتا ہوں۔ اکثر ناشتہ نہیں کرتا تاکہ پیسے بچا سکوں۔ مجھے ایک عرصے سے جگر میں تکلیف ہے مگر علاج نہیں کروا پا رہا ہوں۔ اس مسئلے پر جتنا سوچتا ہوں' دماغ ماؤف ہوتا جاتا ہے۔

☆ بیٹے اختر! تمہارا مسئلہ اب شاید ہر جائز کمائی کرنے والے کا ہے۔ ہر شخص پریشان ہے اس لیے معاشرے میں بھی افراتفری ہے۔ بیٹے! تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ اللہ سے خوب گڑگڑا کر دُعا کرو کہ وہ تمہیں ثابت قدم رکھے تاکہ تم اسی طرح اپنے بچوں کو حلال کمائی پر پال سکو۔ بیوی سے کہو' وہ روزانہ چڑیوں کو دانہ پانی ضرور دے۔

□ مہوش' لاہور۔

o بابا جان! میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں' اپنا کلینک چلاتی ہوں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد علیحدگی ہو گئی تھی' وہ بھی ڈاکٹر تھے۔ اب جس شخص سے میری بات چیت چل رہی ہے' وہ بھی ڈاکٹر ہے' شادی شدہ ہے' دو بچوں کا باپ ہے' اپنی بیوی کی رضامندی کے بغیر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں ایک بار دکھ اٹھا چکی ہوں' بار بار نہیں اٹھانا چاہتی۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ بتائیے کیا کروں؟

☆ بیٹی مہوش! اسلام میں بے شک مردوں کو چار شادیوں کی اجازت ہے مگر اس طرح نہیں کہ بیوی کو دھوکہ دیا جائے۔ جب وہ تمہارے لیے اپنے بچوں کی ماں کو دھوکہ دے سکتا ہے تو کل کسی کے لیے تمہیں بھی دھوکہ دے سکتا ہے۔ محبت تو وہ اپنے بچوں سے بھی کرتا ہے اور یقیناً تم سے بہت زیادہ کرتا ہے مگر ان پر سوتیلی ماں مسلط کر رہا ہے' انہیں دھوکہ دے رہا ہے' وہ تمہارا کبھی نہیں ہو گا۔ اگر یہ بات سمجھ لو گی تو کبھی دکھ نہیں اٹھاؤ گی۔

□ صباحت نوید' U.K.-

o بابا جی! اس سے پہلے بھی آپ سے رابطہ کیا تھا' میں شوہر سے علیحدگی چاہتی تھی۔ آپ نے منع کیا تھا مگر بابا جی! میں اور برداشت نہیں کر سکتی۔ میری عمر 38 سال ہے۔ برٹش نیشنل ہوں' اچھی جاب پر بھی ہوں۔ میرے شوہر اپنا علاج کرانے کو تیار نہیں' سارا دن کاؤچ پر لیٹے ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں یا کمپیوٹر میں لگے رہتے ہیں۔ میں بہت ذہنی اذیت میں رہتی ہوں۔ آپ تو سب جانتے ہیں' میں آپ کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی۔ ایک شخص ہے جو ہماری برادری کا ہے اور یہاں U.K. ہی میں ہے' وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ نام بھیج رہی ہوں' مشورہ دیں۔

☆ بیٹی صباحت! میرا جواب اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ علیحدگی کا فیصلہ غلط ہے۔ فرض کرو' تم بیمار ہو جاؤ اور بستر سے اٹھ بھی نہ سکو' ایسے میں تمہارا شوہر تمہیں چھوڑ کر کسی کم عمر لڑکی سے شادی کر لے تو کیسا لگے گا؟ بیٹی! ایسے رویوں اور فیصلوں سے بہت دکھ ہوتا ہے اور جو اللہ کے بندوں کو دکھ دیتا ہے' وہ خود بھی کبھی سکھی نہیں رہتا۔ میں تمہیں آیندہ زندگی میں دکھوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ نماز پڑھا کرو تاکہ شیطان مردود دور رہے۔ شوہر کا علاج کراؤ' سب ٹھیک ہو گا۔

□ تمثیل' بہاولپور۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

○ بابا جی! میں بڑی بدنصیب عورت ہوں۔ شوہر میری ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ اولاد بھی ہے۔ پڑھی لکھی بھی ہوں' اچھے خاندان سے بھی تعلق ہے مگر میرے شوہر مجھ سے ہر وقت اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ صرف شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں چاہے میرا پکایا ہوا کھانا ہو یا میری کہی ہوئی کوئی بات ہو۔ نوکروں سے میرے بارے میں پوچھتے ہیں۔ بابا جی! اس سے زیادہ ذلت کی کیا بات ہوگی۔ میں اپنی نظروں میں خود چور بن جاتی ہوں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں' وہ کیا سوچیں گے؟ سوئی سے لے کر بڑی سے بڑی چیز بھی خود لے کر آتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں ایک روپیہ بھی نہیں رکھتے۔ معمولی ضرورتوں کے لیے بھی ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل جاؤں۔

☆ بیٹی تمثیل! ایسے رویے یقیناً بہت دکھ دیتے ہیں لیکن کیا تم جانتی ہو کہ شک تو ذہنی بیماری ہے' ایسے شخص کا تو علاج ہونا چاہیے۔ وہ تو خود قابل رحم ہے۔ بیٹی! ہمت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ اللہ سے مدد مانگو۔ فرار ناکامی ہے۔ ڈٹی رہو۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ بعد نمازِ فجر سورۃ فتح ترجمہ کے ساتھ پڑھو۔ تمہیں کلامِ الٰہی سے ہی اپنے مسائل کا حل ملے گا' انشاء اللہ۔ مجھے 3 ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ ریحان ظہیر' حیدر آباد۔

○ بابا جی! میرا مسئلہ ویسے تو بہت عام سا ہے مگر مجھے کسی کے مخلصانہ مشورے کی شدید ضرورت ہے۔ میری بیوی اور میری والدہ کی بالکل نہیں بنتی۔ سمجھ نہیں آتا' کیا کروں۔ کام سے واپس آتا ہوں تو گھر قیامت کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ ماں کو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بیوی کو سمجھاتا ہوں تو قیامت آ جاتی ہے۔ خدارا' اس مسئلے کا کوئی حل بتائیے۔

☆ بیٹے ریحان! زندگی میں جس معاملے کو بہت اہمیت دو گے' وہ پریشان کرے گا۔ اپنے معاملے اللہ کے سپرد کر دو۔ وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ سب گھر والوں کو ایک بات کہہ دو کہ جب تم گھر میں ہو تو تمہیں مکمل سکون چاہیے۔ کسی کی بات پر دھیان مت دو' کسی کی شکایت مت سنو۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بکثرت یا غفورُ کا وِرد کرو۔ وہ مہربان ہے۔

□ تفضّل عمران' جنگ شاہی۔

○ بابا جان! چار سال قبل جاننے والے کے توسط سے اٹلی آ گیا تھا۔ بہت محنت کی' بے تحاشہ تکلیفیں پردیس میں اٹھائیں' اتنا کمایا کہ گاؤں میں گھر پکا کروا لیا۔ 4 سال سے بیوی بچے کو نہیں دیکھا۔ اب واپس آنا چاہتا ہوں مگر والدہ بضد ہیں کہ پہلے بہن کا جہیز جمع ہو جائے پھر میں واپس آؤں۔ بابا جان! میں واحد کمانے والا ہوں مگر اب گھر والوں کی خاطر بیوی بچے کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا۔ اتنی ذہنی اذیت میں رہتا ہوں کہ بس' بیوی کے کہنے پر ہی آپ سے رابطہ کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی میری مشکل حل فرمائیں۔

☆ بیٹے تفضّل......! گھر بنا لیا' بہت بڑا کام ہو گیا۔ زندگی میں یہ رشتے اور ہر معاملے میں توازن ضروری ہے۔ تمہاری بیوی اور بچے کے ساتھ بہت ظلم ہو چکا' چار سال شوہر سے دور رہنا اور باپ سے اولاد کا اتنا طویل عرصہ دور رہنا نہایت تکلیف دہ عمل ہے۔ واپس لوٹ آؤ' تم یہاں رہ کر بھی بہن کو اچھے سے رخصت کر سکتے ہو۔ بہت بہت پڑھو۔

ربنا اتنافی الدنیا

اللہ سب اچھا کرے گا۔

□ رابعہ جمیل۔ خوشاب۔

○ بابا جی! میں نے رسالے میں پڑھا کہ آپ اولاد کے لیے تعویذ دیتے ہیں۔ میری شادی کو بھی 4 سال ہو گئے ہیں۔ یہ میرے شوہر کی دوسری شادی ہے۔ پہلی بیوی سے بھی کوئی اولاد نہیں۔ بابا جی! میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ میری چھوٹی بہن کے ہاں دو بچے ہیں اور اس کی شادی بھی میرے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ بابا جی! میں ہر وقت روتی رہتی ہوں۔ میری ساس کہتی ہیں کہ اگر تمہارے ہاں بچہ نہ ہوا تو وہ اپنے بیٹے کی تیسری شادی کروا دیں گی۔ پلیز بابا جی! میری مدد کریں۔

☆ بیٹی رابعہ......! اللہ پر بھروسا رکھو۔ مجھے اپنے مکمل کوائف ارسال کرو۔ میں تعویذ تیار کر دوں گا۔ اپنے شوہر اور اس کی والدہ کا نام ضرور تحریر کرنا۔ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمت رکھو اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ بہت خوش رہو گی۔

□ راجا انور علی۔ بٹ گرام۔

○ بابا جی! بڑی مشکل سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ڈاک کا نظام بہت اچھا نہیں ہے۔ آپ مجھے کالم میں جواب دیں۔ مالی حالات بہت خراب ہیں۔ میرے گھر میں صرف بوڑھی ماں اور معذور بہن بچے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر میں کہیں جا بھی نہیں جا سکتا۔ اَب تو کھانے کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ کوئی ایسا عمل بتائیے کہ روزی وافر ہو جائے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

☆ بیٹے انور......! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بے شک حالات بہت تکلیف دہ ہیں مگر ہمت اور صبر سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 7 تسبیح پڑھو یاغنیُ یامُغنیُ اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ فریال۔ کراچی۔

☆ بیٹی فریال! تمہاری والدہ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ اِس طرح مجھے بھی حالات کا اندازہ رہتا ہے۔ تم اور تمہاری دوست یہی وظیفہ مزید ایک ماہ کرو' ضرور کرم ہوگا۔ اگر تعویذ کی ضرورت ہوئی تو بنا دوں گا۔

□ سعدیہ۔ ٹنڈو آدم۔

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! امید ہے' اللہ کے فضل و کرم سے آپ خیریت سے ہوں گے اور آپ کے درجات میں اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے۔ (آمین!) بابا جی! میں نے پہلے بھی آپ سے وظیفے منگوائے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے میں نے آپ سے وظیفہ منگوایا تھا کہ وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے اور ضدی بہت ہیں۔ بابا جی! آپ نے مجھے ایک ماہ تک ہر نماز کے بعد چاروں قُل پڑھ کر دَم کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے ایک ماہ تک یہ وظیفہ بھی کیا۔ پورا ماہ وظیفہ کرنے کے دوران کچھ فرق پڑا لیکن اَب پھر ویسے ہی بدتمیز ہیں اور پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے اور بڑوں کی بات بھی نہیں مانتے۔ اُس کے بعد دوسرا وظیفہ کسی اور نے بچوں کے لیے وظیفہ بتایا کہ سورۃ فتح صبح کو پانی پر دَم کر کے پلاؤ اور سورۃ مومن کی آخری آیت ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھ کر دُعا کرتی ہوں۔ تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے یہ وظیفہ پڑھتے ہوئے' لیکن پھر بھی کچھ فرق نہیں پڑا۔ بابا جی! میں اپنے بچوں پر پوری توجہ دیتی ہوں اور اُن کا پورا خیال رکھتی ہوں لیکن پھر بھی وہ نہ میری بات مانتے ہیں اور نہ ہی پڑھائی پر توجہ دیتے ہیں۔

☆ بیٹی سعدیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ جاری رکھو۔ انشاء اللہ' رفتہ رفتہ سب خیر ہوگی۔ مدت 41 دن ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

انمول خزانہ

حسد کیا ہے......؟

☆فرمانِ نبویؐ ہے۔
''حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ، لکڑی کو۔''

☆حسد ایک ایسی آگ ہے جس میں جل کر انسان خود ہی راکھ ہوجاتا ہے۔

☆حسد انتہائی برا جذبہ اور احمقوں کا وطیرہ ہے۔

☆حسد کی صورت یہ ہے کہ کسی کی نعمت دیکھ کر تمنا کرنا کہ کاش' اس سے یہ نعمت چھن کر مجھے حاصل ہوجائے۔

☆کسی کی شہرت یا عزت سے نفرت کا جذبہ رکھتے ہوئے خواہش کرنا کہ وہ کسی طرح ذلیل ہوجائے اور اس کی جگہ مجھے عزت کا مقام حاصل ہو جائے۔

☆اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہمیں حسد جیسی بدترین بیماری سے نجات عطا فرمائے۔ (آمین!)

مراسلہ نگار: ثمینہ سلیم چا کی'لیاری' کراچی۔

باتوں سے خوشبو آئے

☆نیک نیتی اور محنت کے ساتھ بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆ذہن ناکام ہوسکتا ہے' محنتی کبھی ناکام نہیں ہوتا ہے۔

☆عقل مند سوچ کر بولتا ہے' بے وقوف بول کر سوچتا ہے۔

☆مثبت سوچ زندگی کو پرسکون بناتی ہے۔

☆بہادر وہ ہے جو اپنی خواہشات پر قابو پائے۔

☆ہمارے ایمان دار ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے بے ایمان ہیں۔

☆اگر دنیا میں فلاح چاہتے ہو تو والدین کی عزت کرو۔

مراسلہ نگار: جمال ناصر' کوئٹہ۔

عقل کی باتیں

☆ارادے کی طاقت' پیسے کی طاقت سے زیادہ ہے۔ پیسا اگر پاور ہے تو ارادہ سپر پاور ہے۔

☆جو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے' وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

☆حسد کی بجائے رشک کرو۔

☆کچھ مانگنا ہو تو صرف خدا سے مانگو کیونکہ تمام دنیا کو وہی سب کچھ دیتا ہے۔

☆ہاتھ سے کمانے والا کبھی محتاج نہیں ہوتا۔

مراسلہ نگار: شاہ بانو' سانگھڑ۔

علم کی روشنی

☆علم ایسا سفر ہے جو زندگی میں کبھی ختم نہیں ہوتا۔

☆علم ایسی شمع ہے جو جتنی زیادہ جلتی ہے' اتنی

ہی زیادہ روشنی دیتی ہے۔

☆علم ایسی کنجی ہے جس سے کامیابی کے تمام دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔

☆علم ایسا پودا ہے جسے کوئی ایک شخص لگاتا ہے لیکن اس کا پھل بہت سے لوگ کھاتے ہیں۔

☆علم ایسا خزانہ ہے جسے محفوظ کرنے کے لیے کسی بنک لاکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ خزانہ انسان کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔

☆علم ایسی دولت ہے جسے خاندان میں اگر کوئی ایک شخص بھی حاصل کرلے تو پھر یہ دولت نسل در نسل تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

☆علم ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنے مستقبل کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔

☆علم سے انکسار' اور دولت سے غرور پیدا ہوتا ہے۔

☆علم اکثر مقامات پر تلوار سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔

☆علم ایک ایسا پھول ہے جو جتنا زیادہ کھلتا ہے' اتنی ہی زیادہ خوشبو دیتا ہے۔

مراسلہ نگار: حنا خان' کراچی۔

ذرا مسکرایئے

سوال

ایک امیدوار ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ بورڈ کے ممبر نے اُس سے پوچھا۔ ''تم کسی جنگل میں ہو' اچانک تمہارے سامنے شیر آجاتا ہے۔ بتاؤ' اُس وقت تم کیا کرو گے؟''

امیدوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ ممبر نے اپنا سوال دہرایا' وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس پر وہ تلخی سے بولا۔ ''جواب کیوں نہیں دیتے؟''

امیدوار نے جواب دیا۔ ''میں بھلا کیا کروں گا' جو کچھ کرنا ہے' وہ تو شیر کرلے گا۔''

آمدنی

لندن میں ایک پلمبر نے اپنے بریف کیس میں سے چند اوزار نکال کر ذرا سی دیر میں وکیل صاحب کے گھر کا نل درست کیا اور اپنا بل انہیں تھما دیا۔ بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہوتے ہوئے بولے۔

''دو سو ڈالرز فی گھنٹہ؟ میں تو دن بھر میں بھی اتنی رقم نہیں کما پاتا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' پلمبر نے پورے خلوص سے تائید کی۔ ''وکالت کے پیشے میں میری آمدنی کا بھی یہی حال تھا۔''

بری چیز

جج نے شراب پینے کے الزام میں لائے جانے والے شخص سے کہا۔ ''تمہیں پولیس یہاں یقیناً شراب نوشی کی وجہ سے لائی ہے؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے جناب......!''

شرابی نے جواب دیا۔ ''شراب انتہائی بری چیز ہے' نشے میں بہت سے نقصانات ہیں' آدمی بکنے جھکنے لگتا ہے' دوستوں سے بے وجہ الجھ جاتا ہے' یہاں تک کہ کوئی اپنی بیوی پر گولی چلائے تو نشانہ بھی خطا جاتا ہے۔ میں خود دس بار یہ کوشش کرچکا ہوں۔''

بحث

• ایک گاؤں میں پڑوسی رحیمو سے گدھا مانگنے آیا۔ رحیمو نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''گدھا تو صبح سے نتھو لے گیا ہے۔''

اسی دوران اندر سے گدھے کی آواز آئی۔ ہمسائے نے کہا۔ ''رحیمو' تم یہ کیا کہہ رہے ہو جبکہ تمہارا گدھا تو اندر سے بول رہا ہے؟''

رحیمو نے نہایت غصے سے جواب دیا۔ ''میں ایسے شخص سے ہرگز بحث نہیں کرنا چاہتا جو میری بات کی بجائے گدھے کی بات پر یقین کرتا ہو۔''

بیویاں

امریکا کے ایک شہر کے میئر کو پتا چلا کہ اس کے علاقے میں رہنے والا ریڈ انڈین چھ عدد بیویوں کا شوہر ہے تو فوراً وہ اس کے گھر پہنچا۔

''دیکھو مسٹر......!'' میئر نے ریڈانڈین سے کہا۔

''ہمارا قانون ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ قانون کا احترام کرو، سیدھے گھر جاؤ اور اپنی پانچوں بیویوں کو بتاؤ کہ آج سے وہ تمہاری بیویاں نہیں رہیں۔"

ریڈ انڈین نے چند لمحوں تک میئر کے مشورے پر غور کیا، اور اچانک وہ اس طرح کانپنے لگا جیسے اس پر جاڑا چڑھ گیا ہو پھر وہ ہاتھ جوڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میری بیویوں کو یہ بات آپ ہی بتائیں، دوسری صورت میں صبح کے اخبار میں میری تصویر شائع ہوگی اور نیچے لکھا ہوگا۔

"وہ ریڈ انڈین جو پانچ بیویوں کے ہاتھوں مارا گیا۔"

بزم آرائی:

☆

ہمارے حال پہ یاروں کے تبصرے نہ گئے
مگر یہ ہم کہ غمِ دل سے رابطے نہ گئے
کئی کتابیں تھیں دیمک نے جن کو چاٹ لیا
بہت سے لفظ تھے ایسے کہ جو پڑھے نہ گئے
ہزار بار زمانے کے نامے آئے
یہ حوصلہ نہ ہوا اپنے سامنے نہ گئے
کہیں خود اپنے ہی اندر نہ شور برپا ہو
گلی میں کھول کے دروازے دیکھے نہ گئے
خزاں میں ٹوٹتے پتے ہوا کے خالی ہاتھ
ہم اس کے بعد انہیں پکارنے نہ گئے
تمام عمر چراغوں کو دیکھتے ہی رہے
کسی سے خواب کی تعبیر پوچھنے نہ گئے
وہ خوف تھا کہ ہواؤں کی دستکوں پر بھی
ہم اپنے جسم کے اندر چھپے رہے نہ گئے
ہم اپنی آنکھوں کو ملتے رہے کہ نیند میں تھے
اور اس کے بعد جب اٹھے تو رتجگے نہ گئے
اگرچہ بات کچھ ایسی نہ تھی مگر اختر
ستم ظریف عزیزوں کے مشورے نہ گئے

(اختر ہوشیار پوری)

حسن انتخاب: کرن شبیر۔ کراچی

☆

بجز ہوا کوئی جانے نہ سلسلے تیرے
میں اجنبی ہوں، کروں کس سے تذکرے تیرے
یہ کیسا قرب کا موسم ہے اے نگارِ چمن
ہوا میں رنگ نہ خوشبو میں ذائقے تیرے
کہاں سے لاؤں ترا عکس اپنی آنکھوں میں
یہ لوگ دیکھنے آتے ہیں آئینے تیرے
میں ٹھیک سے تری چاہت تجھے جتا نہ سکا
کہ میری راہ میں حائل تھے مسئلے تیرے
یہ درد کم تو نہیں ہے کہ تو ہمیں نہ ملا
یہ اور بات کہ ہم بھی نہ ہو سکے تیرے
گلوں کو زخم، ستاروں کو اپنے اشک کہوں
سناؤں خود کو ترے بعد تبصرے تیرے
ہزار نیند جلاؤں ترے بغیر مگر
میں خواب میں بھی نہ دیکھوں وہ رتجگے تیرے
جدائیوں کا تصور رلا گیا تجھ کو
چراغِ شام سے پہلے ہی بجھ گئے تیرے
ہوائے موسمِ گل کی ہیں لوریاں جیسے
بکھر گئے ہوں فضاؤں میں قہقہے تیرے
کسے خبر کہ ہمیں اب بھی یاد ہیں محسن
وہ کروٹیں شبِ غم کی، وہ حوصلے تیرے

(محسن نقوی)

حسن انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی

☆

کیسے بتائیں تم کو صنم بام کے بغیر
میرا نام ہے ادھورا تیرے نام کے بغیر
دیکھا نظر ملا کے کسی نے ہمیں نہیں
آئے ہیں میکدے سے مگر جام کے بغیر
دیکھو کبھی تو ہم کو بھی الفت سے چاہ سے
ہم نے تو دل دیا ہے تمہیں دام کے بغیر
کرتے ہیں انتظار تڑپتے ہیں رات دن
آیا کرو کبھی تو یونہی کام کے بغیر
حسرت ہے میری کب سے پوچھے تو حالِ دل
باتیں کرے دلوں کی تو سلام کے بغیر
کب تک سناؤں تجھ کو میں شعروں میں حالِ دل
سچے ہیں میرے جذبے یہ کلام کے بغیر
جب سے گیا ہے چھوڑ کے منان انجمن
میری شام بھی اداس تری شام کے بغیر

(منان قدیر منان)

حسن انتخاب: قرۃ العین زینب۔ ملتان

اندیشہ ہائے دور دراز

تری خواہش نے کسی تشکیک کا ملبوس پہنا ہے
تری بابت کسی سے پوچھنے میں خوف آتا ہے
وہ جانے کیا کہے؟
ترے بارے میں کوئی بات بھی کرتا ہوں تو
ڈرتا ہوں
جانے گفتگو کیا رنگ پکڑے
تری بابت کسی سے کوئی بھی رائے طلب
کرتے لرزتا ہوں
وہ جانے تجھ کو کیسا نام دے
مرے احساس کو کس شک نے جکڑا ہے
یہی کیوں سوچتا ہوں؟
اب تو پہلے سا نہیں ہے
اب ترے بارے میں لوگوں کا وہ پہلا سا
تصور بھی نہیں ہے!

(ڈاکٹر ریاض مجید)

حسن انتخاب: عاکشہ سحر ایمان۔ کراچی

محبت ایسا نغمہ ہے

محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہو "لے" میں
تو سُر قائم نہیں رہتا
محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدھم نہیں ہوتا
محبت ایسا رشتہ ہے
کہ جس میں بندھنے والوں کے
دلوں میں غم نہیں ہوتا
محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا
محبت ایسا رستہ ہے
اگر پیروں میں لرزش ہو
تو یہ محرم نہیں ہوتا
محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

(امجد اسلام امجد)

حسن انتخاب: عینی خان۔ کراچی

محبت

محبت رقص کی صورت
کبھی اک عکس کی صورت
محبت دل سے دل کے رابطے کی آخری منزل
محبت تجربہ ہے اک
حسیں لمحوں کو بننے کا
محبت نارسائی ہے
محبت ایک رستہ ہے
جو اپنے راہگیروں کو کوئی انجام دیتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محبت انتظارِ یار میں بھٹکا ہوا لمحہ
محبت جستجو بھی ہے
کسی کی آشنائی کو انوکھا موڑ دینے کی
محبت روٹھ جائے تو سدا کا روگ بن جائے
یہ ایسا سوگ بن جائے کہ بازی ہارنے والے
خود اپنے آپ کو ہاریں
خود اپنے آپ کو ماریں
کسی فنکار کی خاطر
محبت ایک تخلیقی صلاحیت ہے
جس سے وہ نئے شہکار کی تصویر بنتا ہے
محبت اک علامت ہے
کسی کے زندہ ہونے کی
کسی کے زندہ رہنے کی

(ڈاکٹر ابرار عمر)

حسن انتخاب: ثمینہ احمد۔ گجرات

اگر تم آئینہ دیکھو

اگر تم آئینہ دیکھو
تو اپنے آپ سے نظریں چرا لینا
کہ اکثر بے وفا لوگوں کو
جب وہ آئینہ دیکھیں
تو آنکھیں چور لگتی ہیں

(محسن نقوی)

حسن انتخاب: شعیب محی الدین۔ لاہور

جب اداس ہوتی ہو

تم بھی کیا عجیب سی لڑکی ہو
بات بھی نہیں ہوتی
اور روٹھ جاتی ہو
گہری گہری آنکھوں سے
تم جو حرف بنتی ہو
دل پہ لکھ بھی دیتی ہو
اور سنہری زلفوں کو
جبیں پر بکھرا کر تم جب اداس ہوتی ہو
ہے قسم تیری جاناں، مجھ کو مار دیتی ہو

(ثناء اللہ شاہ)

حسن انتخاب: ام مناہل۔ ایبٹ آباد

گئے لمحات

گئے لمحو! کبھی تو لوٹ آؤ
وہ دلکش ساعتیں بھی ساتھ لاؤ
جو میری عمر رفتہ کے
کسی پُرکیف گوشے میں
نشاط وصل کی رعنائیوں کو چھوڑ آئی ہیں
وہ سہمی سہمی سی کچھ ان کہی باتیں
وہ راتیں، وہ ملاقاتیں
وہ زیرلب تبسم

یا فقط اک دوسرے کو تکتے رہنا
کبھی خاموشیوں کی رو میں بہنا
کبھی آنکھوں کا کچھ آنکھوں سے کہنا
وہ لمحے اِک سہانی زندگی کے
رگوں میں دھیمی دھیمی آنچ سے پگھلے ہوئے جذبے
حیا کی سرخیوں میں نوبہار حسن کے جلوے
سبھی پرکیف لمحے اب تو اک خوابِ پریشاں ہیں
وہ جلوے جتنے تھے نقش و نگار طاق نسیاں ہیں
کہاں وہ عہد پیماں ہیں
کوئی شعلہ سا میری روح کو سُلگا رہا ہے
یہ تنہائی کا غم کب تک سہوں میں
کسی سے کیا کہوں میں
گئے لمحو! کبھی تو لوٹ آؤ

(سیما سراج)

حسن انتخاب: روبینہ خان۔ بھکر

سہمی مائیں

ام عادل۔ کراچی

روشنیوں کے شہر کراچی کو دشمنوں کی نظر اور اپنوں کی غداری کھا گئی ہے۔ ہر شخص، زن و مرد، بڑا چھوٹا سہما ہوا ہے۔ خصوصاً ماؤں کے دل بجھ سے گئے ہیں۔ ہر وقت کی بے چینی بے کلی گویا دل کسی نے مٹھی میں دبوچ رکھا ہے۔ دن ہو یا رات کسی پل قرار نہیں بچوں کا خصوصاً نوجوان بچوں کا لمحہ بھر گھر سے اور نظروں سے دور ہونا ماؤں کے دلوں پر گراں گزرتا ہے۔ بچوں کو پروان چڑھاتے وقت مائیں اپنی آنکھوں میں مستقبل کے کتنے سنہرے سپنے سجاتی ہیں۔ میرا بیٹا بڑا ہو کر فلاں عہدے پر ہوگا اس کا مستقبل روشن اور خوشیوں بھرا ہوگا۔ اس کے سر پر سہرا سجے گا۔ ماؤں نے خود ہی اپنی آنکھوں سے تمام سنہرے سپنے نوچ ڈالے ہیں۔ اب نوجوان بچوں کا گھر اور نظروں سے ایک پل کے لیے دور جانا ماؤں کو دہلا دیتا ہے۔ مائیں جو بچوں کے مستقبل روشن بنانے کے لیے اپنے تن من سے دن رات کوشاں رہتی ہیں مگر آج کی ماں گھر اور علاقے سے دور بیٹے کی کسی بھی اچھی جاب کی سب سے زیادہ مخالفت کرتی ہے۔ ممتا کی آرزو ہوتی ہے بچہ اپنے گھر کے نزدیک آس پاس نظروں کے سامنے رہے۔ چاہے کوئی چھوٹی موٹی دکانداری ہی کر لے کیونکہ ماں کے لیے بچے کی زندگی و سلامتی کے سامنے ساری دنیا کی ڈگریاں اعلیٰ عہدے بلکہ دنیا کی تمام دولت ہیچ ہیں۔ ماں جانتی ہے کہ آج کل حالات ایسے ہیں کہ "جو گھر پہنچ گیا سکندر جو نہ پہنچ سکا بوری کے اندر" خداوند کریم کے حضور ایک ماں کی سب ماؤں کی طرف سے دل کی گہرائیوں سے دعا ہے اے رب رحیم ہمارے حالوں پر رحم فرما۔ ہمارے دلوں میں سب کے لیے مہر و محبت پیدا فرما دے۔ قوم کے ہر فرد کو اپنے ہی جیسے دوسرے افراد سے سلامتی دے، آمین۔

وعدہ

ممتاز احمد سندھو

وعدہ نام ہے ایک اعتبار کا، ایک آس کا، وعدہ نام ہے ایک تسلی کا جو زبانی بھی ہو سکتی ہے اور تحریری بھی۔ یہ تسلی جھوٹی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے ہر حال میں پوری کرنا چاہیے۔ وعدہ نام ہے یقین دلانے کا کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا۔ وعدہ نام ہے ایک عہد کا...... شریعت کہتی ہے کہ جو عہد کا پاسدار نہیں اس کا ایمان نہیں۔ منافق کی نشانیوں میں ایک نشانی وعدے کا پورا نہ کرنا بھی ہے۔ شریعت میں منافق کو بدترین الفاظ میں پکارا جاتا ہے۔ وعدہ ایک قرض ہے اور قرض کو چکانا ہی وعدے کی تکمیل کا نام ہے۔ کوئی عزت دار، خوددار، انا رکھنے والا اور غیور انسان جب کسی سے وعدہ کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی عزت وقار اور اپنی ساکھ دوسرے شخص کے ہاتھ گروی رکھ دیتا ہے۔ وعدہ ایک ایسے پل کی مانند ہے جس پر سے گزر کر ہم کسی کے دل میں جگہ بناتے ہیں۔ ہماری شخصیت کا دارومدار وعدے کی تکمیل کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس سے ہماری شخصیت نکھرتی ہے اور عدم تکمیل ہماری شخصیت کو بگاڑتی ہے۔ ہم دوسروں کا اعتماد کھو دیتے ہیں اگر ہم وعدے کی تکمیل کو اپنا شعار بنا لیں تو یقین جانیے کہ اس عمل سے ہمیں وہ عزت و احترام ملے گا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایک بہت عمدہ وصف ہے۔ انسان اپنے اعمال کا جوابدہ تو رب العزت کی بارگاہ میں ہے۔ ظاہری طور پر اس کے اچھے برے اعمال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی کونظر آئیں یا نہ آئیں مگر وعدے کی تکمیل کا پابند ہوگا تو معاشرہ اس کوقدر کی نگاہ سے ضرور دیکھے گا۔ وعدے کا پورا نہ کرنا دھوکہ دینے کے زمرے میں آتا ہے اور دھوکے باز شخص کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ ہمیں چاہیے کہ جب بھی ہم کسی سے وعدہ کریں تو سوچ سمجھ کر کریں۔ آیا ہم جو وعدہ کرنے جا رہے ہیں اسے نبھا بھی سکیں گے یا نہیں...... ایک بار کوئی وعدہ کر لیں تو پھر اسے ہر حال میں پورا بھی کریں۔ یاد رہے کبھی بھی خوشی کی حالت میں کوئی وعدہ نہ کریں اور غصے کی حالت میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اللہ پاک ہمیں اپنے وعدوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

ہزاروں خواہشیں ایسی......!

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

خواہش ایک ایسے بے لگام گھوڑے کی طرح ہوتی ہے جو منزل کا تعین کیے بغیر سرپٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یہ خودرو پودے کی طرح دل میں پیدا ہوتی ہے اور نفس کی آبیاری سے پھل پھول کر تناور درخت بن جاتی ہے۔ اس کی جڑیں خون میں شامل ہو کر پورے جسم کو جکڑ لیتی ہیں۔ خواہش ایک ایسے ضدی بچے کی طرح ہوتی ہے جو اپنی من مانی کے لیے ہر وقت مچلتا رہتا ہے۔ سیلاب کے اس بپھرے ہوئے پانی کی طرح ہے جس کے آگے بند باندھنا ناممکن ہوتا ہے۔ بنیادی خواہشات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ فطری اور نفسانی۔ فطری خواہشات وہ ہوتی ہیں جو فطری تقاضوں کے مطابق اپنے وقت پر پوری ہوتی چلی جاتی ہیں جب کہ نفسانی یا دنیاوی خواہشات نفس کے زیرِ نگرانی دل میں پلتی ہیں۔ اگر انہیں بے جا لاڈ پیار سے پالا جائے تو یہ بگڑ کر انسان کے اپنے لیے وبال جان بن جاتی ہیں۔ نیک خواہشات، دعا کی شکل میں اپنے پیاروں کو تحفتاً پیش کی جاتی ہیں جب کہ بری یا بد خواہشات ہوس بن کر ایمان کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ بے جا خواہشات اس اندھے کنویں کی طرح ہوتی ہیں جس میں اگر کوئی انسان گر جائے تو اس کا بچ نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ خواہش اگر پوری ہو جائے تو دل کو تشکر اور ممنونیت جیسے خوب صورت اور نایاب جذبات سے روشناس کراتی ہے۔ اگر پوری نہ ہو تو حسرت بن کر ہمیشہ دل کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ کبھی کبھی خواہش کسی کو پا لینے کی آرزو بن کر دل میں مچلتی رہتی ہے تو کبھی تمنا بن کر کسی کی چاہت کو دل میں جگائے رکھتی ہے اور کبھی دلی مراد بن کر امید کا دامن تھامے رکھتی ہے۔ کبھی خواہش دعا بن کر ہمارے ایمان اور یقین کو دوام بخشتی ہے تو کبھی شکوہ بن کر انسان کو مایوسی اور ناامیدی جیسے گناہوں کے نزدیک تر لے جاتی ہے۔

مقدر کی سیاہی

ثانیہ بھٹی۔ سیالکوٹ

کچھ لوگ پیدائشی بدنصیب ہوتے ہیں۔ ان کے نصیب میں دکھوں، پریشانیوں، ذلتوں، رسوائیوں، تنہائیوں اور محرومیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے مقدر کی کالی سیاہی موت تک ان کے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔ ایسے لوگ سونے کو بھی ہاتھ لگائیں تو مٹی بن جاتا ہے۔ قسمت کی دیوی کبھی ان پر مہربان نہیں ہوتی۔ خوشیاں ان سے دور بھاگتی ہیں۔ تنہائی ہی ان کی واحد ساتھی ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ لٹا کر بھی تہی دامن رہ جاتے ہیں۔ منزل کی تلاش میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کی تلاش ان کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ بدقسمت لوگ حسرتیں، خواہشیں لیے ایک دن فنا ہو جاتے ہیں۔

معلوم افراد؟

محمد بلال فیاض۔ ملتان

قتل و غارت گری، چوری چکاری، زیادتی اور اس طرح دیگر ہولناک خبروں سے اخبارات بھرے تے ہیں مگر توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر جرائم کا سہرا نامعلوم افراد کے سر ہوتا ہے۔ ان معلوم'' افراد کے بارے میں پولیس اور حکومت کی بے خبری کی مثال نہیں ملتی۔ یہ افراد تا حیات علوم ہی رہتے ہیں۔ پولیس کی کارکردگی سے تو عوام پہلے ہی مطمئن نہیں سونے پہ سہاگہ پولیس اور بجرز کے حالیہ '' کارنامے'' ہیں جن کی وجہ سے قاتل اور محافظ کا فرق اب مٹتا جا رہا ہے۔ ذرا غور کیجیے تو لوم ہوگا جیسے ''مسلمان مارو مکاؤ'' مہم چل رہی ہے۔ مرد، عورتیں حتیٰ کہ کم سن معصوم بچے بھی محفوظ یں۔ مرنے والوں کو اپنے جرم کا پتا نہیں ہوتا۔ چن چن کر حق، سچ بات کہنے والوں کو موت کے گھاٹ ار جا رہا ہے۔ مارنے والے کون ہیں؟ ''نامعلوم۔'' خواتین کی عزت گھر کی چار دیواری میں بھی فوظ نہیں، لوٹنے والے کون ہیں؟ ''نامعلوم افراد'' راہ چلتے لوگ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے یں۔ یہ قاتل کون ہیں؟ ''نامعلوم افراد'' حتیٰ کہ ''نامعلوم افراد'' کے شر سے صحافی بھی محفوظ نہیں! کیا قعی یہ افراد نامعلوم ہیں......؟؟

کربِ انتظار

سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

انتظار...... بظاہر ایک چھوٹا سا چھ حرفی لفظ ہے لیکن انتظار نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ عربی زبان یں ایک محاورہ ہے جس کا ترجمہ ہے کہ انتظار موت سے بھی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ ہم انتظار کی شدت کا ندازہ کر سکتے ہیں۔ انتظار وہ کرتا ہے جس کو کوئی امید ہوتی ہے کسی کام کے ہو جانے کی یا کسی کے آنے کی لیکن پھر بھی انتظار کسی عذاب سے کم نہیں۔ انتظار کرنے والے انسان پل پل جیتے اور مرتے ہیں۔ انتظار بہت کٹھن اور دردناک ہوتا ہے۔ کسی پل چین نہیں آتا۔ وہ شخص کتنے کرب اور مصیبت میں مبتلا ہوگا جو کسی عام شخص یا چیز کا نہیں بلکہ موت کا انتظار کر رہا ہو جسے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہو کہ تمہارا مرض قابل علاج نہیں ہے۔ کسی بھی لمحے تمہیں موت آ سکتی ہے۔ ایسا شخص زندگی سے مایوس اس وقت کا انتظار کرتا ہے کہ کب وہ گھڑی آئے اور اس کی روح کو بدن کے پنجرے سے آزاد کر دیا جائے ایسے شخص کو موت کا انتظار موت سے زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے جلدی سے موت آ جائے تاکہ موت کے انتظار میں پل پل نہ مرنا پڑے ایسے لوگ بھی اس دنیا میں ہیں جو زندگی سے مایوس ہو کر موت کا انتظار کرتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی کے لوٹ آنے کا انتظار کرتے ہیں اگر کوئی کہہ دے کہ میں تم سے فلاں دن یا فلاں ٹائم پر ملنے آؤں گا تو اس کے انتظار میں ایک ایک منٹ ایک ایک سیکنڈ گن کر گزارنا پڑتا ہے انتظار ایسی اذیت ناک شے ہے کہ اللہ کسی دشمن کو بھی اس سے آشنا نہ کرے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں انتظار کرنا اچھا لگتا ہے کسی کے ملنے کا انتظار، کسی کام کے ہونے کا انتظار انہیں ایک خاص لذت سے آشنا کرتا ہے مگر کچھ لوگ کسی کے انتظار میں، کسی کام کے تکمیل کے لیے مر مر کے جیتے ہیں مگر ان کا انتظار ختم نہیں ہوتا۔ وہ مایوس ہو جاتے ہیں مگر انتظار ختم نہیں ہوتا اور ایک دن زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نئے لہجے اور روشن امکانات کا شاعر

احمد نواز

عکاشہ سحر

موجودہ شعروادب میں علامتی اسلوب بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ علامتی اسلوب میں لکھنے والے کے تمام خارجی تجربے اس کے داخلی آئینہ خانے سے گزر کر تازہ Images میں ظاہر ہوتے ہیں اس لیے علامتی تحریر میں ایک طرف تازگی اور اثر پذیری بڑھ جاتی ہے...... تو دوسری طرف لفظوں کی مصنوعی سطح اپنی وسعتوں اور اپنے پھیلاؤ میں گہرائی پیدا کرلیتی ہے۔

علامتی شعروادب کو پڑھتے وقت خود قاری بھی ایک طرح کے تخلیقی عمل میں شریک ہوجاتا ہے کہ اسے خود بھی علامت کی معنویت تک پہنچنے کے لیے لفظوں کی باطنی صداقت تک سفر کرنا پڑتا ہے۔ ہماری زندگی جن نئے تجربوں سے گزر کر آئی ہے انہیں ہماری شاعری کا کلاسیکی ہیت کا نظام برابر اپنے اظہار میں لاتا رہا ہے۔ جدید ہونا یا حرف تازہ لکھنا تو ہر عہد کی شناخت رہا ہے لیکن جدید حسیت کا رشتہ...... ان تغیرات اور ان عذاب وثواب سے جڑا ہے جو نئے آدم اور نئی دنیا کی تقدیر میں لکھے گئے ہیں اور جن کی شکست و ریخت اور ادھورا پن ہمیں اور ہمارے عہد کو زخمی کیے ہوئے ہے۔

ہم زندگی کی نئی تبدیلیوں کے روبرو کھڑے ہیں۔ ہماری الجھنیں اور محرومیاں بہت بڑی ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مسائل ہر زمانے میں رہتے ہیں۔ میرتقی میر مغلیہ تہذیب کے زوال میں کھڑے تھے، غالب نے فرنگیوں کے حوالے سے دلی کے گلی کوچوں میں کشت وخون کا سیلاب دیکھا تھا، اقبال نے عہد غلامی کا کرب سہا تھا...... اگر ہم اپنے پابندی نظام ہیت کو حرف مکرر کی طرح مٹا بھی ڈالیں تو کیا جدید نظم، نثری نظم یا کوئی اور آزاد شعری صنف میں ہمارے عہد کی آگ کو اظہار میں لانے کی وسعت اور قوت پیدا ہوجائے گی؟...... اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہر عہد اپنی ایک سائیکی لے کر آتا ہے۔ پچاس برس پہلے جن چیزوں کو مشکل یا انہونی سمجھا جاتا تھا وہ ہمارے

آئینہ ہوگئی ہیں۔ ہم نثری نظم لکھیں (کہیں) بر نظم یا پھر غزل دونوں میں ہمیں اپنے عصری ل کی آگہی کو، اپنے عہد کے شعری محاسن کو اور داخلی وخارجی حسیت کو لمحہ لمحہ سامنے رکھنا ہوگا۔ میر نے حرف تازہ کی تلاش کو زندگی اور فن کا ار بنایا تھا۔ ہمیں بھی اپنے شعروادب میں اس اثر ری اور اس سچائی کو اور اس تازہ حرف کو تلاش کر تخلیقی وژن کی پہچان بنانا ہوگا...... اور اس حرف ہ کی تلاش کا سامنا ''اشک گویا'' کے خالق احمد ز کو بھی ہے۔ احمد نواز چونکہ زندگی کی ہمہ گیر ئیوں کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کا گہرا شعور ادراک رکھتا ہے۔ اس لیے اس کے ہاں ذاتی و ماعی صداقتوں کا بیان نظم وغزل دونوں میں فکرو ساس کی آنچ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ وہ نقد وشعر ے روایتی پیمانوں کا محتاج نہیں۔ وہ رائج الوقت کے عدوں اور پرانے موضوعات کے افکار وتخیلات کی ریوزہ گری بھی نہیں کرتا۔ اس نے اپنی پہچان، بستانی یا مقامی و علاقائی حوالوں سے بھی نہیں کرائی۔ اس نے اپنی شناخت کا سفر ''اشک گویا'' کی ورت میں مکمل کیا ہے۔ احمد نواز کی غزل ایک منفرد رز احساس کے ساتھ جذبہ واحساس کے نئے نئے مکانات دریافت کرتی ہے۔ روایت و جدت کے متزاج، لہجے کے رچاؤ اور خیال ونظر کے منفرد انداز نے اس کی غزل کو ایک ایسا آہنگ عطا کیا ہے کہ لوں میں درد کی ہلکی ہلکی کسک کے ساتھ ایک گہرا احساس سرائیت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

احمد نواز...... توانا لہجے اور اجلے من کا شاعر ہے۔ اس نے جہاں غزل جیسی دل پذیر صنف کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے وہاں نظم کی نرماہٹ اور جلترنگ کا بھی بھرپور احاطہ کیا ہے۔ اس کی نظموں کے مضامین میں دل نشینی کے علاوہ موسقیت بھی رچی بسی ہے۔ نظم کے ساتھ اس کی غزل جہاں اس کی فنی ریاضت اور پختگی کا پتہ دیتی ہے وہاں اس کے باشعور شاعر ہونے کا احساس بھی دلاتی ہے۔

☆

آنکھ بھر دیکھا نہ مفلس کو کسی نے عمر بھر
قبر میں رکھنے سے پہلے قد کی پیمائش ہوئی

☆

لامکاں کا خیال الجھن ہے
اس کو دل سے نکال گزریں گے

☆

ایک آئینہ توڑ کر دیکھو
ایک شیشے سے سامنا ہوگا

احمد نواز کے اشعار اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں، اس نے ایک ایک لفظ کا کشٹ جھیلا ہے۔ لفظوں کو خود پر طاری کیا ہے۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہورہی ہے کہ احمد نواز کے ہاں بہت کم عمری میں ہی وہ بات نظر آرہی ہے جس کے لیے دشت نوردی کرنا پڑتی ہے۔ آنکھیں رہن رکھنا پڑتی ہیں تب کہیں جا کے لفظ روشن ہوتے ہیں بینائی ملتی ہے۔

☆

عجب کٹھ پتلیاں رقصاں تھیں ہر سو
کسی پوشاک میں پیکر نہیں تھا

عہد حاضر کی جدید حسیات اُس کی شاعری میں سانس لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ حسیات روح عصر سے کسبِ فیض کر کے اس کی شاعری کے خدوخال متعین کرتی ہیں اور یہی وہ شعری صلاحیت ہے جس کے ذریعے شاعر اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆

اپنی آنکھوں میں چھپانا چاہتا ہوں
میں تجھے آنسو بنانا چاہتا ہوں
دل نوازی کا ہنر مجھ کو عطا ہو
غم کے ماروں کو ہنسانا چاہتا ہوں

احمد نواز اچھا شعر کہنے کے ہنر سے آشنا ہے بلکہ اس کے پاس تازہ مضامین کی فراوانی بھی موجود ہے۔ وہ پرانی زمینوں کی زرخیزی میں اضافہ کرکے اس میں نئے شگوفے کھلانے کے ہنر سے بھی واقف ہے۔

☆

سوچ کو لفظ ملے، لفظ کو تحریر ملے
تب کہیں میرے تصور کو بھی تصویر ملے!
ایک صورت ہے کہ بچ جائے یہ دنیا احمد
خواب ہر آنکھ کو، پھر خواب کو تعبیر ملے

''اشک گویا'' کی شاعری ایک حساس اور درد مند دل کی ترجمان ہے۔ جو اپنے گرد و پیش کے واقعات وحادثات کا بھرپور اثر قبول کرتا ہے۔ اظہار فکر وخیال کی ذمہ داریوں سے بہ طریق احسن عہدہ برآ ہونے والا احمد نواز اپنے مشاہدات و تجربات کی قوت بروئے کار لاتا ہے۔

☆

میں جب تک بے اماں، بے زر نہیں تھا
کوئی الزام میرے سر نہیں تھا
بالآخر میں نے آنکھیں بند کرلیں
کہ باہر کوئی بھی منظر نہیں تھا
لگے ایسا، تجھے صدیوں سے جانوں
کہیں تو تھا، جب یاں پر نہیں تھا!
رہا ہے کارواں منزل سے محروم
کہ رستہ تھا مگر رہبر نہیں تھا

احمد نواز دشت بے کنار کا مسافر ہے۔ جو کبھی وصل، کبھی ہجر کی وادی میں پڑاؤ کرتا ہے۔ کبھی خواہشوں کی بارش میں بھیگنے لگتا ہے اور کبھی آنکھوں میں محبت کے سندیسے لے کر تلاش محبوب میں سرگرداں ہوتا ہے۔

☆

میں تو نکلا تھا زندگی کی طرف
زندگی لے گئی اسی کی طرف
شامل حال تھی تری چاہت
جب بڑھا تھا میں بے خودی کی طرف
آنکھ میں ڈوبتے جزیرے ہیں
صرف دیکھو نہ تم، ہنسی کی طرف

احمد نواز کی نظم کا مزاج بہتے پانی جیسا ہے۔ ردھم اور روانی لاجواب، تخیل کی فراوانی، باکمال ہے...... سفید پوشی، تسلسل، غرقاب، آدھا پن، تسکین، فنا وبقا، سوالی، وقت، کسک اور اشک گویا مضامین اور کرافٹنگ کے حوالے سے بہت خوب صورت نظمیں ہیں۔ اس کی نظم اشک گویا سے ایک اقتباس

''مجھ میں آدم کے لہو کی
ایسی ارزانی مسلسل
دیکھنے کی تاب مولا
اب نہیں اور......''

نواسہ رسولؐ مقبول حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت کی میدان کربلا میں شہادت نے اسلامی تہذیب وثقافت اور نظام فکر وخیال پر جوانمٹ نقوش چھوڑے ہیں اس سے کون واقف نہیں، اردو زبان کے شعری ونثری افق پر پوری آب وتاب سے چمکنے والے استعاروں کے ستارے بھی سرزمین کربلا کی دین ہیں...... احمد نواز کی بھی کربلا سے قلبی وفکری نسبت ہے۔ اس معاملے میں اس کی محبت عقیدت کا

رکرگئی ہے۔

☆

ںؓ کی جیت کا نشاں ہیں
اکھڑے خیمے، وہ اُجڑے ڈیرے!

☆

ینہ چھوڑ کر جو آگئی تھی
زینبؓ شام کو تنہا گئی تھی
یں والوں کی ایسی استقامت!
ظر افلاک کی پتھرا گئی تھی

مد نواز کے رومانوی اشعار بھی اپنے اندر ایک حیرت سمیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

☆

تجھ کو طے کر کے خود کو پایا ہے
مجھ سے مجھ تک کا فاصلہ تو ہے

☆

میں نے مٹی سے گفتگو کی تھی
خود کو پانے کی جستجو کی تھی
چشمِ نمناک سے تجھے دیکھا
یہ عبادت تھی باوضو کی تھی
آسماں رکھ دیا ترے در پر
تو نے تارے کی آرزو کی تھی

احمد نواز کے باطن میں طرح طرح کی کہکشائیں اور ضیائیں نور بکھیر رہی ہیں جس کا پرتو 'اشک گویا'' میں جا بجا نظر آتا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ احمد نواز اپنے سینے میں موم جیسا دل رکھتا ہے۔ موم جیسا دل سوزِ عشق میں گداز ہو کر دل گراختہ ہو جائے تو شمع سخن کا فروغ حسن سے دور نہیں۔

☆

ہم کو جس ہار نے اغیار بنا رکھا ہے
اس کو محورِ افکار بنا رکھا ہے

مجھ میں اک خوف رسیدہ سا ہے بندہ جس نے
میرے ہر کام کو دشوار بنا رکھا ہے
دیکھ دیوانے کا تو شوق کہ جس نے دلبر!
تیری ہر یاد کو تہوار بنا رکھا ہے
اس سے کہہ دو کہ کیا، ان کہا ہو سکتا ہے
جس کو پچھتاوے نے بیمار بنا رکھا ہے
جب سے کم مائیگی لفظ کھلی ہے مجھ پر
تب سے خاموشی کو گفتار بنا رکھا ہے

☆

احمد نواز کے کلام میں سادگی و پرکاری ہے گویا ایک جہانِ نو ہے جہاں گزرے ہوئے زمانے کی آہٹوں اور دستک نے آنے والی ساعتوں کے دریچے کھول دیے ہیں۔

☆

میرا ہونا مرے گماں تک ہے
یہ کہانی فقط بیاں تک ہے

احمد نواز نے شہر خیال میں یک رنگی اور ہم آہنگی کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اظہارِ بیان میں سادگی اور روانی ہے۔

☆

صبحِ روشن کی آس باقی ہے
شب کے دامن میں اک سویرا ہے

احمد نواز تم ہو اور آنے والا وقت تمہارا ہے...... خدائے حرف وقلم احمد نواز کو مزید دولتِ سخن سے نوازے۔ ''اشک گویا'' کی اشاعت اس کے جینئس ہونے کی جانب اشارہ کناں ہے۔

☆☆☆



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پسند اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار، ادبی ذوق کے آئینہ دار

حسرت موہانی...... عامر بھٹی، منچن آباد
دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا
اور یوں تو میں فانی ہوں، فنا میرے لیے ہے

محسن نقوی...... صدرہ انور علی، جھنگ صدر
آپ نے انداز محبت دیکھا ہے، انداز وفا نہیں محسن
پنجرے کھول بھی دو تو کچھ پنچھی جایا نہیں کرتے

محسن نقوی...... صفیہ سلطانہ، جیکب آباد
کچھ اندھیرا بھی ضروری ہے غم یار کے ساتھ
اب دیا کوئی نہ رکھے میری دیوار کے ساتھ
ہم یوسف تو نہیں بازارِ سخن میں محسن
یوں ہی چل پڑتے ہیں ہر ایک خریدار کے ساتھ

داغ...... علی انصاری، منچن آباد
جو بھلے ہیں، وہ بروں کو بھی بھلا کہتے ہیں
نہ برا سنتے ہیں اچھے نہ برا کہتے ہیں

منصورہ احمد...... حسین خواجہ
میں سلطاں کے درِ دولت پہ دستک تو دے لوں
مگر اس ہاتھ کو ذوقِ گدائی کون دے گا؟

سلیم کوثر...... رضوانہ کوثر، لاہور
جو تیرے سائے ہی کے مماثل ہو آج تک
کب لا سکے مثال، مثال آشنا کوئی
مجھ کو عہد کے خواب دکھاتا مرا سلیم
لمحہ گزر گیا ہے زوال آشنا کوئی

ضیاء حسین ضیاء...... شعبان کھوسہ، کوئٹہ
کچھ آئینے سے بھی اب خوف کھانے والا ہے
یہ کون ہے جو حقیقت بدلنے والا ہے
اتر رہی ہے کہانی سبو کی گردن سے
نشے کا آخری کردار مرنے والا ہے

آسناتھ کنول...... مریم کنول، جہلم
کاغذ، قلم، دوات کے اندر رک جاتا ہے
جو لمحہ اس ذات کے اندر رک جاتا ہے
پہلے سانس جما دیتا ہے ہونٹوں پر
پھر وہ اپنی گھات کے اندر رک جاتا ہے

واجد امیر...... عمر العطاس، کراچی
دعائیں دل سے لبوں تک تو کھینچ لاؤں میں
بلا سے پھر مری تیروں کہ ڈوب جاؤں میں
کسی منڈیر سے دو وقت ابتلا کی اذاں
جو شہر سویا پڑا ہے، اسے جگاؤں میں

ماہ طلعت زاہدی...... کوثر سعید، لاہور
میرے خوابوں کے زیرِ اثر آ گیا
اُس کو بھی ہمرہی کا ہنر آ گیا
روشنی بھی وہی اور پروانہ بھی
آئینہ بن کے آئینہ گر آ گیا

بہزاد برہم...... ایم سعید انور سعید، لاہور
اندھیر سا ہے نیند میں، ہر ایک خواب گم ہوا
دھواں اگل رہے ہیں لب، ہنسی کہیں چلی گئی

ندیم ہاشمی...... صبیحہ امتیاز، سیالکوٹ
اپنے خوابوں کی زندگی ہے ابھی
دیکھ سپنوں سے دوستی ہے ابھی
خوشبوؤں کا وقار ہے قائل
پھول تیری بھی آگہی ہے ابھی

شمع افروز...... مسرت آغا، حویلیاں
اپنی لہروں میں ڈوب جاتا ہے
دل سمندر کا کیا ٹھکانہ ہے
یاں زمانے کو کیا غرض اس سے
کیا حقیقت ہے، کیا فسانہ ہے

شبیر نازش...... صباحت علی، میاں چنوں
ہیں بظاہر جو مست، مست نہیں
آنکھ رکھتے ہیں ہر ستارے پر

ضیاء حسین ضیاء...... کوثر اسلم، راولپنڈی
آنکھ میں بام و در اتارنے دے
مجھ کو اپنی نظر اتارنے دے
تو بچھڑ ہی گیا تو مر بھی گیا
خود پہ اتری خبر اتارنے دے

مبشر سعید...... زرافشاں پروین، حیدر آباد
انکار کی لذت سے نہ اقرارِ جنوں سے
یہ ہجر کھلا مجھ پہ کسی اور فسوں سے

شبیر نازش...... غیاث الدین، پشاور
میری روداد ہے کہ آئینہ
یہ کوئی یاد ہے کہ آئینہ
ایک مدت سے کچھ نہیں دیکھا
دل کی فریاد ہے کہ آئینہ

جسارت خیالی...... عاصم خان نیازی، میانوالی
جب تلک بینا نظر ہوتی نہیں
معرفت سے باخبر ہوتی نہیں

کاشی چوہان...... رفعت بانو، صادق آباد
ایک بس تیری چاہ میں ہم نے
سارے جگ سے بگاڑ رکھی ہے

ماہ طلعت زاہدی...... زرینہ جہاں، ملتان
جی کی لگن نے ہونٹ سے شکوہ کیوں مانگا
دل دریا تھا، آنکھ سے قطرہ کیوں مانگا
کیوں مانگا اَن دیکھے لمحوں کا جادو
دیکھے ہوئے منظر کو دوبارہ کیوں مانگا

سید انصر...... ممتاز علی، کھاریاں
بس یہی یاد دلانے کے لیے بیٹھے ہیں
خود سے فرصت ہو تو ہم پر بھی نظر کرنی ہے

رضیہ ناز...... جبار خان، دینہ
شب کو اختر شمار کرتے ہیں
ہم ترا انتظار کرتے ہیں
جب سے بچھڑا ہے تو مرے خالد
دل کے ٹکڑے ہزار کرتے ہیں

منظر عارفی...... عامر مہیسر، لاڑکانہ
میں اس لیے رکھتا ہوں توجہ تری جانب
کب چشمۂ صافی تری تنقید سے نکلے
میں اُن کو برتنے کا ہنر سیکھ رہا ہوں
موتی جو غلافی تری تنقید سے نکلے

سرفراز شاہد...... شاہ نواز بلوچ، دادو
آسماں کو چھوا اور اگلے پل
اپنے قدموں کے بیچ آن رہے

مبشر سعید...... شبانہ زمان، سکھر
دل کی دنیا پہ حکومت ہے پرانی دل کی
ہر محبت کی کہانی ہے کہانی دل کی

جسارت خیالی...... واصف نبی خان، کراچی
روز و شب شہر میں مرے یارو
ایک خوف و ہراس رہتا ہے

کاشی چوہان...... کاشف نبی خان، کراچی
اس کی بلا سے ڈوبنے والا کوئی بھی ہو
دریا کو تو بس اپنی روانی سے کام ہے

سہیل اختر...... ناظمہ ارشد، انڈیا
پہلے وہ اشک کو تنویر بنا دیتے ہیں
پھر اسے پیار کی جاگیر بنا دیتے ہیں
کربِ تنہائی کو اشعار کی لے میں بھر کر
ہم اسے نالۂ شب گیر بنا دیتے ہیں

عرفان صادق...... نصرت سلطانہ، ٹنڈو آدم
قدم قدم پہ ستارے بچھانے والا ہوں
میں آسماں کو زمیں سے ملانے والا ہوں
مرے عدو تجھے اس بات کی خبر ہی نہیں
میں اپنے پاؤں ہوا پہ جمانے والا ہوں

سرفراز زاہد...... فاخرہ بیگم، چناب
وہاں ہم غیر نکلے اپنی خاطر
جہاں پر غیر بھی اپنے نکلے

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔ شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



سلسلے وار پراسرار کہانی — اس کہانی کو آپ کبھی نہیں بھولیں گے

حنیف سحر

گھائل آتما

احسن سلیم کا خیال

بے کار ہے غم، دشت میں اچھا ہوں اکیلا
کیا کم ہے مجھے تو بھی تصور میں یہیں ہے

اسرار کی دنیا سے کشید کیا گیا، دلچسپ اور عجیب سلسلہ، قسط نمبر 18

خلاصہ

رجنی کے لیے یہ بات ایک بڑے اچنبھے سے کم نہ تھی کہ پریموداسے کنال کی سپاہ اور یہاں کے معاملات کی خبر لانے کو جو چاند سنگھ نامی شخص اس کا بھائی بن کے ملنے آیا تھا اور رجنی نے اسے بڑی ہوشیاری سے پریموداسے ملنے کا موقع دیا اور چھپ کر ان دونوں کی ساری باتیں سنیں۔ پریمودا نے چاند سنگھ کو وہی بتایا جو اسے رجنی نے بتانے کو کہا تھا۔ چاند سنگھ رخصت ہو گیا تو رجنی نے چاند سنگھ کے گھوڑے کو اوجھل ہونے تک دیکھنا چاہا اور یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی کہ چاند سنگھ کو کچھ سپاہی جو کنال کی سپاہ کے ہی تھے' پکڑ کر لے گئے۔ رجنی نے جلدی سے اس بھید کو جاننا چاہا وہ یہ دیکھ کر مزید متعجب ہوئی کہ چاند سنگھ سے خفیہ انداز اور بے حد دوستانہ ماحول میں متر شنگ نے ملاقات کی۔ رجنی کا ماتھا ٹھنکا کہ آخر متر شنگ کو چاند سنگھ کے بارے میں کیسے پتا چلا اور دونوں میں اس قدر دوستانہ ماحول میں ملاقات کا کیا مطلب ہے۔ اپنے طور پر وہ الجھتی رہی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی پھر کنال نے ایک محفل آراستہ کی جس میں پہلی بار متر شنگ نے شرکت نہیں کی جسے رجنی نے خصوصیت سے محسوس کیا۔ کرن جب اس مجلس سے فارغ ہو کر متر شنگ کے خیمے میں گیا تو وہاں اس نے متر شنگ اور خیمہ دونوں کی حالت میں ایک خاص تبدیلی محسوس کی۔ کرن کے پوچھنے پر متر شنگ نے مجلس میں شرکت نہ کرنے کی وجہ طبیعت کی خرابی کو بتایا اور کرن نے متر شنگ کو یہ بتایا کہ وہ مہاراج کنال کے کہنے پر اس کی خبر گیری کو آیا تھا مگر اس وقت کرن کی حیرت دوچند ہو گئی جب متر شنگ نے اسے اس وقت پاٹلی پتر جانے کا آدیش دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ پاٹلی پتر جا کے کنال کے استقبال کی تیاریوں کو اس کے شایان شان بنانے اور تمام انتظامات کا خود جائزہ لے۔ کرن نے جانے سے پہلے کنال یا رجنی کو اطلاع دینے کی اجازت مانگی تو متر شنگ نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ وہ خود یوراج کنال کو بتا دیں گے یوں ناچار کرن کو اسی وقت جانا پڑا۔ رجنی کسی نہ معلوم خوف کی وجہ سے پریموداسے گفتگو میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مصروف تھی، وہ پریمودا کی وفاداری اور کنال سے اس کی لگاوٹ کو جانچ رہی تھی کہ رات کے اس پہر اسے گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ و
ترنت خیمے سے نکلی اور گھوڑے کی سمت دوڑ پڑی۔ کچھ دور جا کے اس نے گھڑسوار کو پہچان کے آوازیں دیں اور جب کرن نے اسے بتایا کہ وہ مترشنگ
کی کہنے پر پاٹلی پتر جا رہا ہے تو رجنی انجانے وسوسوں میں گھر گئی اور اس نے اپنی سمجھ سے کرن کو اپنے بھائی ارجن اور باپو کے پاس بھیج دیا اور کرن کو
سمجھا دیا کہ جس سمے پاٹلی پتر میں کنال مہاراج کا قافلہ پہنچے تو کرن عین اس وقت وہاں ظاہر ہو اور یہ بتائے جیسے وہ انتظامات میں ہی جتا ہو
تھا۔ کرن روانہ ہو گیا۔ اگلے دن مترشنگ، کنال سے ملنے آیا۔ کنال نے گلہ کیا تو اس نے طبیعت کا عذر پیش کیا اور یوں کرن کے بارے میں بھی
مترشنگ نے یہ بتایا کہ اسے استقبالی تیاریوں کے لیے پاٹلی پتر بھیج دیا ہے، تب ہی خیمے میں اچانک کرشن یعنی رجنی آئی اور اس نے کہا کہ مجھے بھی پاٹلی
پتر استقبال کے لیے جانا چاہیے قافلے سے پہلے۔ مترشنگ کے چہرے پر جیسے ایک رنگ آیا اور آ کے گزر گیا۔

اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔

مترشنگ نے ایک ان دیکھی گھبراہٹ سے رجنی کی طرف دیکھا اور پھر جلد ہی خود پر قابو پا کر بولا۔ ''اب یہ ممکن نہیں۔'' اس نے کنال کی طرف بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ''اب آپ صرف کرشن نہیں، ہماری ہونے والی رانی ہیں۔''

رجنی نے کرشن کے روپ میں ایک ہلکی سی جھینپ ظاہر کی پھر بولی۔ ''ہاں مگر سیناپتی، یہ بات صرف میں اور آپ جانتے ہیں، نہ کشتا رانی جانتی ہیں نہ باقی دیش کی جنتا جانتی ہے۔ ان سب کے لیے تو ہم ایک مدت سے کرشن ہیں اور کرشن ایک سینک کا نام ہے جس کا دھرم اپنے راجہ اور اپنی جنتا، اپنے دیش کی حفاظت کرنا اور ان کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دینا ہے۔''

''مگر دیوی جی......''

''سیناپتی سے ہماری بنتی ہے کہ وہ ہمیں راجکمار کے راجہ بننے تک کرشن کہہ کر ہی بلائیں۔ آپ کی بات روکنے کے لیے ہم گھنی معافی چاہتے ہیں۔''

''آپ کچھ بھی کہیں، اب یہ ناممکن ہے کیونکہ اب خود یوراج اس کی آگیا نہ دیں گے۔ کیوں کنال، ہم نے کچھ غلط کہا؟'' مترشنگ نے بڑی ہوشیاری سے معاملہ کنال کی عدالت میں ڈال دیا۔

''صحیح کہتے ہیں سیناپتی، ہم اپنے دوست، اپنے مترشنگ سے یہی امید رکھتے تھے۔''

رجنی کو لگا کہ اس وقت مترشنگ کی اس بات سے اختلاف کر کے اپنی بات منوا لینا ٹھیک نہیں ہو گا لہٰذا وہ بات بدل کر بولی۔ ''سیناپتی نے کرن کو اس سمے ہم سے جدا کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ یوراج کے سواگت کو تو شاہی محل کی سینا اور ہزاروں خدام اور دیش کی بے شمار رعایا بہت کافی تھی، آپ نے کرن گرو کو بھیج کر ان ساری تپسیاؤں اور جفاکشی کو اور ہماری سنگھت کو کچھ ادھورا سا کر دیا۔ یہ ہم رجنی کے روپ میں آپ سے کہنے کی جسارت کر رہے ہیں۔'' رجنی نے تبسم سے کہا۔

''میں رجنی دیوی کے جذبات سمجھتا ہوں مگر کنال کی عزت، مان سمان کے لیے ہمیں کوئی بھی بلی دینی پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔''

ایک مرتبہ پھر رجنی کو لگا کہ اس کی بات بے وزن ہو گئی اور رجنی نے پھر بات بدلی۔ ''آپ کی یوراج سے محبت کا کوئی بدل نہیں ہے۔''

بے کواکب کچھ

☆ برٹرینڈ رسل ریاضی اور فلسفے میں اپنے اعلیٰ کارناموں کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھا۔ اس کی تصنیف ''اصول ریاضی''، کو ریاضی کی منطق کے موضوع پر کلاسیک کا درجہ حاصل ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ 1950ء میں جب اسے نوبل انعام دیا گیا تو یہ ''ادب'' پر تھا۔

☆ میکسم گورکی کو اشتراکی ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے اشتراکی ادب کا نمایاں ترین ناول ''ماں'' دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار ملک امریکا کی ریاست نیویارک میں الزبتھ ٹاؤن میں بیٹھ کر لکھا تھا۔

☆ انگریزی کے مشہور شاعر جان ملٹن کا خیال تھا کہ شاعری سے سیاسی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اسی خیال سے وہ شاعری کرتا رہا لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ یہ ناممکن ہے تو وہ نثر میں انقلابی منشور لکھنے لگا اور کئی سال تک وہ یہی کام کرتا رہا۔ بعد میں جب یہ مشغلہ بھی بیکار ثابت ہوا تو وہ دوبارہ شاعری کی طرف رجوع ہوا اور ''جنت گم گشتہ''، تخلیق کی۔

فیصل دین پوری۔ خان پور

''بے شک ہمیں اپنے بچپن کے ساتھی پر پورا وشواس ہے۔ مترشنگ ہمارے لیے کبھی کم نہیں سوچ سکتے۔'' کنال
ے اس کا فخریہ اظہار کیا جس کی توقع کنال سے رجنی کو بھی تھی۔ کچھ دیر تک باہمی دلچسپی اور استقبال کے حوالے سے
ی گفتگو کے بعد مترشنگ کو کنال نے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور وہ خوش اسلوبی سے رخصت ہوئے۔
طویل اور گہری خاموشی کے درمیان جیسے فضا میں بڑا تکلیف دہ حبس تھا جسے دو بے قرار دل محسوس نہ کر سکے اور ایسا
جیسے سمے کی رفتار تھم سی گئی ہو۔ پرش کے باگھیہ میں سب سے انہونی چیز یہی ہے کہ جب وہ چاہے کہ سمے تھم جائے
وقت کی ساعتیں اس کی مرضی ومنشا سے آگے پیچھے ہوں تو وہ پلک جھپکتے گزر جاتا ہے اور جب وہ سمے کے گزرنے
باٹ دیکھتا ہے تو لگتا ہے، سمے کی ساعتوں نے اپنا سفر روک لیا ہے، وہ گزرنا بھول گئی ہیں، کچھ ایسا ہی ان وسوسوں
ے بھرے لمحوں میں بھی تھا جب کنال کی محویت تو غضب کی تھی کہ وہ بے خبر تھا مگر رجنی کا ہردے بھاری ہو رہا تھا، وہ
ں ودماغ کی آہٹ میں کچھ ایسا سننے کی کوشش کر رہی تھی جو اسے پوری طرح دکھائی دے اور سمجھ میں بھی آئے۔
''آج ہماری رجنی کسی بھاری سمسیا میں ہے۔'' خمار اور محویت سے لدی ہوئی آواز رجنی نے سنی اور بڑی
ی سنکھٹ سے بھری آنکھیں کنال کے بے پناہ مردانہ وجاہت کے شاہکار چہرے پر مرکوز کر دیں۔
''ہم نے تمہیں ایک کنواری کنیا کی اچھا کے انوسار کچھ بھی ایسا نہیں دیا جو تمہارا حق تھا اور جنگوں کی دھول اور لہو
ے سیندور تمہاری مانگ میں بھر دیئے، بھلا ہم خود کو کیسے اطمینان دلائیں، یہ کیسا پریم ہے جو تمہیں دو گھڑی کی خوشی بھی
ے سکا؟'' کنال نے توقف کیا۔ رجنی بدستور اسے گہری دلربا خلاؤں جیسی بسیط نگاہوں سے دیکھا کی۔
''کیا ہمارے پریم کی کتھا جاننے کے بعد کوئی کسی ہمارے جیسے منش سے پریم کر سکے گا اسی لیے ہم بڑی بے
اری سے سمے کے گزرنے کا انتظار کرتے ہیں تاکہ جلد سے جلد اپنی رجنی کو ان سب مصیبتوں سے نجات دلا
ں جو ہمارے پریم نے ایک کومل اور پھولوں جیسی ناری کے دامن میں بھر دی ہیں۔'' کنال عین اس کے چہرے
ے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔
دبیز اور پرکیف رسیلی آواز رجنی کے لبوں سے نکلی۔ ''کنال، آپ ایسا سوچتے ہیں۔ پریم تو جیون مرن کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنجوگ ہوتا ہے۔ اس میں نہ کوئی ناری ہوتی ہے نہ منش' یہ تو دو بتوں میں دوڑتی مچلتی ایک آتما کا بھاگیہ ہے۔ ہم جنگ لڑتے سمے بھی پریم کی پرچھائیں تھے اور جیون کی ہر گھڑی' ہر روپ میں یہی رہیں گے۔ پریم کی پجارن سنسار کی منوکامناؤں اور اچھاؤں سے نہیں کھڑی رہتی' اسے تو بس اپنے پریمی کی پوجا سے غرض ہے پھر چاہے کھردری زمین ہو' کانٹوں کی سیج یا نرم پھولوں جیسا بستر' کیا فرق ہے ان سب میں۔ آپ ہمارے لیے بالکل بھی پریشان مت ہوں' ہمیں آپ کے دیدار سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے اور ایشور نے ہمیں یہ دولت خوب دی جتنا اس کا پرنام کریں' کم ہے' بس ایک ہی چنتا ہے؟''

''چنتا......'' کنال نے بے دھیانی سے کہا۔ ''وہ کیا رجنی' پرنتو تمہارے وچار اس سارے سنسار اور سنسار سے باہر کیسے دلفریب اور انوکھے ہیں جو سنے' دنگ رہ جائے۔ کیسی انجانے دیسوں سے اتری ہوئی پریوں جیسی کوملتا سے بیان کرتی ہو تم' جانے ایسی دل کو چھو لینے والی باتیں کہاں سے سیکھیں تم نے؟''

''لگتا ہے' کنال کو یاد نہیں کہ وہ ہندوستان کے ہونے والے راجہ ہیں؟'' رجنی اس کی مخموریت میں ڈوبنے سے خود کو بچاتے ہوئے بولی۔ کنال نے نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے رجنی کی طرف دیکھا۔

''ایک بات چنتا کی طرح ہردے کے دوار پر دستک دے رہی ہے۔ سوچتی تھی' آپ سے کہہ کر آپ کو پریشانی میں نہ ڈالوں مگر......''

''مگر کیا رجنی' ابھی ابھی تو تم نے کہا کہ پریمی دو بتوں اور ایک آتما سمان ہوتے ہیں پھر کوئی بھی چنتا تمہارے اکیلے کے پاس کیوں رہے؟'' کنال نے اسے گرم لوہے کی چوٹ کی طرح پگھلا کے توڑ دیا۔

''مجھے لگتا ہے' پاٹلی پتر میں ہمارے پریم کو خطرہ ہے آپ کی اور میری اور ہمارے کسی بھی سنگی ساتھی کی جان محفوظ نہیں ہے۔'' رجنی نے بڑی دقت سے یہ بات بالآخر کہہ دی جس کے لیے وہ خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔

''تم نے یہ کیسے جانا اور مترشنگ کے سامنے کیوں اپنی چنتا' اپنے وسوسے کا اظہار نہیں کیا؟'' کنال نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔

''یہی وہ سب سے مشکل اور ناقابل یقین مرحلہ ہے یوراج میرے مہاراج جہاں ذہنی سنتولن کے قابو سے نکلنے کا احساس مجھے سب سے زیادہ پریشان کر رہا ہے۔'' رجنی نے گمبھیرتا سے کہا۔ اس کے لہجے کی اداسی کنال کو بھی محسوس ہوئی۔

''مطلب؟''

''آپ ٹھیک سمجھے' مجھے لگتا ہے مترشنگ' اب پہلے والے مترشنگ نہیں رہے' اب وہ آپ کے دوست نہیں' دشمن......''

''بس' بس رجنی' کچھ دیر کو ٹھہر جاؤ۔'' کنال شدت غم اور غضب کی حیرت سے لڑکھڑا کے نشست پر جا بیٹھے۔ ''تمہارے علاوہ کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی تو ہم اس کی جان لے لیتے۔ پتہ نہیں یہ تم سے کس نے کہا ہے؟'' کنال اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''یقین تو میں بھی کرنا نہیں چاہتی اور میں جانتی تھی مترشنگ مجھے کرن کی طرح پاٹلی پتر جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ انہیں بھی یہ ڈر ہے کہ میرے ساتھ دیوتاؤں کی شکتی چلتی ہے' اگر میں وہاں گئی تو ان کا پورا کھیل اور منصوبہ میرے علم میں آ جائے گا لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ میں اپنے ہر سنگی ساتھی کی حفاظت کرنے کو پوری طرح چوکنی ہوں اسی لیے میں نے کرن کو پاٹلی پتر نہیں جانے دیا جہاں کرن کی جان اب تک جا چکی ہوتی۔'' اس بار

رجنی کے لہجے میں ایک عجیب سا عزم تھا۔ کنال نے بھاری تحیر سے رجنی کو دیکھا۔

''کرن پاٹلی پتر نہیں گئے تو پھر کہاں ہیں؟''

تب رجنی نے چاند سنگھ سے لے کر صبح کے بعد ہونے والی اس ملاقات تک تمام روداد کنال کو سناتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتی یوراج کہ سچ کیا ہے مگر پاٹلی پتر میں آپ کی اور آپ کے سب قریبی سنگی ساتھیوں کی جان کو شدید خطرہ ہے' ایسا میں محسوس کرتی ہوں۔''

''مترشنگ بے وفا ہو سکتا ہے تو دھرتی اور گگن کو آپس میں ٹکرا جانا چاہیے تھا۔ یہ بات ہم پوری طرح راون ہو جائیں' تب بھی نہیں سوچ سکتے' وہ بات حقیقت کا روپ دھارن کر چکی ہے۔ ہمیں یقین نہیں ہوتا رجنی' بالکل نہیں' بالکل نہیں۔''

کنال کی حالت پل کے پل میں مخبوط الحواس انسانوں جیسی ہو گئی۔ اسے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ رجنی دیر تک خاموش رہی۔ ''بھگوان کرے' یہ سب کچھ محض رجنی کا وہم ہو۔''

''اور جو یہ سب رجنی کا وہم ہی ثابت ہوا تو کرن کے پاٹلی پتر میں نہ پہنچنے کو مترشنگ کو کیسے شانت کرو گی؟ وہ اپنی اس بے عزتی پر بڑے غم ناک ہوں گے رجنی۔'' شہزادے کے لہجے میں آس کا ایک دیپک جلتے ہوئے رجنی نے محسوس کیا۔

''یہ معاملہ تو ہم بگڑنے سے بچا لیں گے مہاراج' اصل مدا تو یہ ہے کہ جو وہ ہوا جس کی آہٹ ہمیں سنائی دیتی ہے' تب اس سے بچنے اور محفوظ رہنے کا کیا اپائے ہے ہمارے پاس؟''

کنال کی خوبصورت آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ خیمے میں دیر تک سکوت برستا رہا پھر کنال اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ''آپ کی سب باتیں پوری طرح ایسی الجھی ہوئی سمسیا ہیں کہ اب موت کا سامنا کرنے کے علاوہ کوئی اور اپائے ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔''

''جو میں کچھ عرض کروں تو مہاراج میری بات مان لیں گے؟'' رجنی نے اسی گہری اور دبیز لہجے والی آواز میں کہا۔ کنال نے چونک کر بھاری تعجب سے رجنی کی طرف دیکھا۔

''کیا ہماری دیوی سمان رجنی ایسی کٹھن مصیبت سے بھی نمٹ لینے کی شکتی رکھتی ہیں؟''

''مہاراج' مجھے آپ کے دیئے ہوئے حوصلے کی ضرورت ہے؟ یہ سمے یوں اوشواس سے مضحکہ اڑانے کا نہیں۔'' رجنی نے دھیمے لہجے میں شکوہ کیا۔

''بھگوان کرے' ہماری جیبھ (زبان) نہ رہے جو ہم اپنی رجنی کا مذاق اڑانے کا سوچیں بھی' بس یوں ہے کہ مترشنگ کی بے وفائی کے بعد ہمیں لگتا ہے' مرتیو ہمارا نصیب ہے۔ اب یہ فیصلہ ہمیں اور تمہیں دونوں کو کرنا ہے کہ ہم لڑتے ہوئے جان دیں یا مترشنگ کی بے وفائی کے غم میں عین کسی مردہ انسان کی طرح اسے کے حوالے کر دیں خود کو؟ اس ناقابل یقین منظر میں بھلا کیا اپائے ہو سکتا ہے' دونوں طرف گہری کھائی اور دلدل ہے۔''

''آپ مانیں گے جو ہم کچھ کہیں؟''

''کیا ہماری رجنی ہم سے یہ توقع بھی رکھ سکتی ہے کہ ہم اس کی کسی بات کو نہ ماننے کی گستاخی کر سکتے ہیں؟'' بڑی لجاجت اور پیار تھا کنال کے لہجے میں۔ رجنی جیسے فدا ہی تو ہو گئی۔

''معاملہ اگر مترشنگ یا آپ کے بچپن کے ساتھی کا نہ ہوتا تو ہم کبھی اس طرح پوچھتے بھی نہیں۔'' کنال نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اشتیاق سے رجنی کی آنکھوں میں دیکھا۔ رجنی مزید دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ ''اگر آپ آج کے آج مترشنگ کو بھی پاٹلی پتر استقبال کے لیے بھیج دیں تو یہ بہت آسان ہے کہ ہم کسی بھی گپت چال سے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو سرکشت رکھ سکیں۔ ہمیں دو دن بعد پاٹلی پتر پہنچنا ہے۔ آج مترشنگ رات میں کسی سمے دارالخلافہ تک پہنچیں گے۔ کل رات یہاں سے ایک قاصد ہم پاٹلی پتر مترشنگ کے پاس بھیجیں اور آپ کی طبیعت بھگوان نہ کرے ناساز ہونے کا عذر کر کے دو دن بعد پاٹلی پتر پہنچنے کا سندیسہ بھیج دیں اور مترشنگ کی غیر موجودگی میں یہاں کی سپاہ کی کمان آپ میرے یعنی کرشن کے ہاتھوں میں دے دیں اور سپاہ سے خطاب کر کے یہ باور کرا دیں کہ پاٹلی پتر شہر میں بھی سپاہ کو کرشن کی ہی کمان میں رہنا ہے جب تک کہ آپ خود اپنے کسی دوسرے حکم سے سپاہ کو سینا پتی بدلنے کی اجازت نہ دیں، وہ کرشن کا ہی حکم مانیں خواہ کسی کے بھی خلاف تلوار اٹھانی پڑے سوائے مہاراج کنال کے۔'' یہ کہہ کر رجنی نے دیکھا کہ کنال کے چہرے پر حیرتوں کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ کنال کچھ بولے، رجنی نے پھر کہنا شروع کیا۔

''اس طرح اگر مترشنگ نے پاٹلی پتر میں کوئی سازش بُنی ہے تو اس کا مقابلہ بڑی سہولت اور شکتی سے ممکن ہے جو سازش نہ ہوئی تو سمجھو کہ کوئی بات نہیں۔''

رجنی چپ ہوئی تو کنال نے دیر تک سکوت کیا اور بولا۔ ''بڑی اچھی اور گیانی دھیانی تجویز ہے مگر رجنی، اس معاملے میں بھی دو بڑے پتھر ہیں۔''

''وہ کیا مہاراج؟''

''پہلا تو یہ کہ جیسے ہی مترشنگ پاٹلی پتر پہنچے گا، اسے یہ خبر ہو جائے گی کہ وہاں کرن نہیں پہنچا، تب وہ نردئی ہوا تو ہوشیار ہو جائے گا کہ ہم نے اس کی چال کو بھانپ لیا ہے، اس کی ہوشیاری کی ہمیں رتی بھر پرواہ نہیں لیکن اگر وہ سازشی نہ ہوا تو سوچو، ہم کیسے اس کے شکوے سے خود کو بچا سکیں گے؟''

کنال کی بات سن کر رجنی پھر مشکل میں پڑ گئی اور خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے نئی الجھی ہوئی پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگی اور کچھ سمے بعد بولی۔ ''تو پھر بس ایک اور اپائے دیتی ہوں، اس میں مترشنگ دشمن ہوئے یا دوست، خطرہ نہیں ہے۔''...... کنال کی بڑی بڑی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ اس نے ایک انجان پنے سے رجنی کی طرف دیکھا۔

''وہ یہ ہے کہ آپ مجھے پاٹلی پتر جانے کی آ گیا دیں، میں رستے سے کرن گرو کو بھی لے جاتی ہوں اور ہم دونوں وہاں پہنچ کر دونوں صورتوں میں آپ کی رکھشا کا بندوبست کریں گے، آپ طبیعت کی ناسازی کو جواز بنا کر اپنے پہنچنے کا دن بدل دیں اور دو سے تین دن تاخیر کر دیں اور اس بارے میں مترشنگ کو صرف کچھ لمحے پہلے بتائیں کہ آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی پھر تین بعد وہاں پہنچیں۔ اس طرح کچھ بھی ایسا نہ ہوگا جو مترشنگ کے لیے اچنبھے کا باعث ہو۔ کرن بھی وہاں موجود ہوگا۔ میرے بارے میں کہہ دیجیے گا کہ آپ نے میری خواہش کی وجہ سے اجازت دی ہے۔ مترشنگ ترنت وہاں اپنا ہرکارہ بھیجیں گے تاکہ معلوم کر سکیں کہ ہمیں کیا کچھ معلوم ہوا ہے اور ہم نے کیا انتظام کیا ہے کیونکہ ان کی اچھا کے انوسار تو اب تک کرن گرو کو بندی بنا لیا ہو گا یا موت ان کے مقدر میں لکھی جا چکی ہو گی مگر کسی بھی وجہ سے پاٹلی پتر سے قاصد کا کرن کے بارے میں اطلاع لے کر نہ آنا مترشنگ جی کی بڑی غضب کی پریشانی ہے جسے وہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے۔ طبیعت کی خرابی کے دوران آپ مترشنگ کو زیادہ سے زیادہ اپنے خیمے میں مصروف رکھیں تاکہ وہ بروقت ہماری کوششوں سے باخبر نہ ہو سکیں۔''

کنال نے بڑی غضب کی دلچسپی سے یہ سب سنا اور نہایت افسردگی سے بولا۔ ''اس اپائے میں بچیں گے یا نہیں، یہ تو صرف بھگوان کو ہی خبر ہے مگر جس طرح ہماری رجنی کی جان خطرے میں رہے گی، تم کیا سمجھتی ہو، یہ ہمیں چین سے رہنے دے گا؟ اندوہناک تصور اور سمے کی سب ساعتوں میں آتی جاتی سانسوں میں چکرویو کی طرح ڈولتا وسوسہ، نہیں رجنی، نہیں، موت جب آئے گی، سو آئے گی مگر اس طرح تو ہم چار دن پہلے ہی مر جائیں گے اور ہماری حالت بڑی قابل رحم ہو رہے گی۔ یہ اپائے ہمیں منظور نہیں ہے، ہم سے نہیں ہو گا یہ سب۔''

رجنی کو یکایک اپنے کنال پر ڈھیروں پیار آ گیا، وہ دیر تک کنال کی طرف دیکھتی رہی پھر لپک کر کنال سے چمٹ گئی۔ کچھ ساعتیں دونوں کے وجود محبت اور پریم میں ایسا کھوئے کہ وہ جیسے دو روح، دو بت سے ایک بت، ایک روح میں بدل گئے ہوں۔ دنیا سنسار کی کوئی پرواہ دونوں کو نہ رہی، ان سب لمحوں میں بار بار رجنی کے دل سے ایک ایسی بات تھی جو نکل جانا چاہتی تھی۔ حلق تک آتی مگر وہ اسے ادا نہ کر پاتی اور وہ بات یہ تھی کہ چلو کنال، سب سنسار سے دور کہیں ایسی جگہ بھاگ چلیں جہاں ہمیں صرف اپنے لیے جینا ہو، نہ تم مہاراج کنال ہو اور نہ میں ایسی کم حیثیت رجنی۔'' مگر کوئی بندش، کوئی رکاوٹ ایسی تھی جو اسے کہنے نہ دیتی تھی۔ کنال کو محسوس ہوا کہ اس کی رجنی رو رہی ہے، وہ تڑپ گیا اور اس نے رجنی کو اور زور سے اپنے سینے میں بھینچتے ہوئے کہا۔

''رجنی...... یہ آنسو ہماری توہین اور شرمندگی کا سبب ہیں۔ بھگوان کے لیے انہیں روک لو نہیں تو ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ بھی رو دے گا۔ کنال کو نیر بہانا زیب دیتا ہے مگر ہندوستان کے ہونے والے بادشاہ کی آنکھوں سے کسی نے یہ پتہ چلا لیا کہ یہ آنکھیں رو بھی سکتی ہیں تو یہ بڑے غضب کی مایوسی والا سمے ہو گا۔ ہمیں اس کشمکش میں نہ ڈالو، کنال کی جان تم پہ قربان۔'' ایک دم ہی وہ رو دیا اور رجنی گھبرا گئی۔ اس نے کنال کا ایک بھی آنسو دھرتی کی چھاتی پر گرنے نہ دیا اور اپنی گداز ہتھیلیوں میں انہیں سمیٹ کر بولی۔

''لیجیے، ہم نہیں روتے، اب آپ بھی ان ہیرے جیسے موتیوں کو روک لیجیے۔'' پھر وہ آپ ہی آپ ہنس دی اور بولی۔ ''کنال، پریم بڑی عجیب شکتی ہے، یوں کمزور پڑ گئی تو دنیا میں کبھی کوئی کسی سے پریم نہیں کرے گا۔ لوگ پریم کو ڈر اور خوف کے نام سے پہچانا کریں گے۔ کیا اتہاس ہمیں دو ایسے پریمیوں کے طور پر یاد کرنے والا ہے جو اپنے پریم کی اس مشکل گھڑی میں بے بسی سے روتے رہے۔ آپ حوصلہ مت چھوڑیں مہاراج، ہمیں یہ آخری کوشش کر لینی ہو گی اور فیصلہ بھگوان پر چھوڑ کر پریکشا کی اس اگنی میں کودنا ہی ہو گا۔''

کنال نے خود کو سنبھالا اور اژدہے کی مانند پھنکار کے بولا۔ ''اتنی گنجان مصیبتوں کے بجائے سوچتا ہوں، ابھی کے ابھی مترشنگ کو حراست میں لے کر یہ ساری دویدا ایک ہی جھٹکے میں ختم کر دوں اور پاٹلی پتر سپاہ کی کمان میں خود کر کے پہنچوں جو ہو اس کا سامنا کروں اور ہر قسم کے حالات سے نمٹوں۔''

''انسان اگر اس طرح آزاد ہوتا اپنے فیصلوں میں تو سنسار کے سب تار و پود کب کے بکھر چکے ہوتے۔ اتہاس آپ کو ایسا کرنے کے لیے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ مترشنگ دوشی نہ ہوا، تب بھی اور ہوا تب بھی اتہاس آپ کو ہمیشہ ''دوست مار'' کے طور پر یاد رکھے گا۔ مترشنگ کی حراست سے کشتارانی کے منصوبوں کو بھی شکتی ملے گی اور ممکن ہے وہ لوگ بھی آپ کی حمایت کرنے سے ہچکچائیں جو اب تک بھی آپ کو ہی اپنا مہاراج دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔'' رجنی نے ماحول کو رنجیدگی سے نکال کر پھر سوچ و بچار کے بیچ لا کھڑا کیا تھا۔

''کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ تم جیسی ایک بے نیاز گاتی ناچتی کنیا راج پاٹ کے ان الجھیڑوں کو کیسے اتنی جان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاری سے بیان کرنے سے قاصر ہوئی؟'' کنال نے بغور دیکھتے ہوئے رجنی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ باپو بادشاہ کے محل کا مطبخ تھا اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو محل میں ہو اور باپو مجھ سے نہ کرتا ہو اور جب آپ سے دل لگ گیا تو میں نے آپ کو راج نیتی کی الجھنوں میں پھنسے ہوئے دیکھا۔ بھگوان سے پرارتھنا کی کہ وہ مجھے اس قابل کر دے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔ کرن گرو سے لڑائی کے داؤ پیچ سیکھتے سمے میں محسوس کرتی تھی کہ دیوتا میری مدد کر رہے ہیں اور مجھے یہ گیان دیا اگنی پریکشا نے مگر یہ نہ جانتی تھی کہ جیون میں ایک سمے ایسا بھی آئے گا جب میں دیوتاؤں کی شکتی سے بھی اس پاتال سے نہ نکل پاؤں گی جو مترشنگ جیسے وفادار کے بدلنے سے پیدا ہوگا' تب ہی آپ سے کہتی ہوں کہ ہمیں دیوتاؤں پر بھروسا کرنا چاہیے جو مجھے اس یدھ میں سرخرو کریں گے اور پاٹلی پتر میں ہونے والی سازش سے میں کرن کے ساتھ خوش اسلوبی نمٹ سکوں گی۔ آپ مجھ سے زیادہ بھگوان پر بھروسہ کریں اور مجھے جانے کی آ گیا دے دیں۔ سمے نکلتا جا رہا ہے' فیصلے میں دیر ہماری تقدیر کو سیاہ کر دے گی۔'' رجنی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کرن کے ہاتھوں کو تھام کر اسے طاقت دینے کی کوشش کی۔

کنال نے بے پناہ محبت سے رجنی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے' ہم تمہاری بات مانے لیتے ہیں۔ ہمیں بھگوان پر تو بھروسہ ہے ہی مگر ہم خود کو اس خوشی اور شانتی سے محروم نہیں کرنا چاہتے کہ ہم نے اپنی رجنی کی بات ایک ایسے سمے میں بھی مانی جب ہمارا دماغ کسی بھی صورت میں تمہیں آگ کے اس ساگر کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جاؤ رجنی' ہم ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہیں۔''

رجنی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی۔ اس نے بے خودی میں کنال کے ماتھے کو چوما پھر آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ''مہاراج کی جے ہو' رجنی اپنے کرتوے کو پوری ہمت اور بہترین صلاحیتوں سے نبھائے گی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی تلوار پر ہاتھ رکھ کے سیدھی کھڑی ہوگئی۔ ایک وفادار اور دلیر سپاہی کی طرح اس نے مہاراج کو تعظیم دی اور جھک کر تکریم بجالائی۔ ''ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے' میں پریمودا کو لے کر ترنت نکل جانا چاہتی ہوں۔'' کنال نے ڈبڈبائی نظروں سے اس پریم دیوانی کو دیکھا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ وہ پوری وارفتگی سے ان بانہوں کے حصار میں سما گئی۔ کنال کے سراپے میں بھی کچھ دیر پہلے والی کسلمندی اور مایوسی کے بڑھتے ہوئے عفریت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے زاری ختم ہوگئی۔

''دیکھو' سنو' اس وقت اصطبل سے گھوڑا مت منگواؤ بلکہ ہمارے خصوصی اصطبل سے ہمارا گھوڑا لے کر جاؤ جس کی خبر مترشنگ کو نہ ہو سکے گی اور ہمارا گھوڑا تمہیں کئی جگہوں پر مدد فراہم کرنے کا سبب بھی بنے گا۔''

رجنی نے دونوں ہاتھ کنال کے ہاتھوں میں دیئے' فرط جذبات سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''اگر میں دشمنوں کے دل کی طرف بڑھ رہی ہوں تو آپ کو یہ سوچنا ہوگا' آپ بھی یہاں تنہا ہیں' ساری طاقت مترشنگ کے حکم پر جمع ہو سکتی ہے۔ آپ کو اپنا خیال رکھنا ہے اور تمام چھوٹے بڑے فوجی سربراہوں سے مل کر انہیں اعتماد میں لے لیجیے' ویسے بھی سپاہی کا دھرم راجہ کی رکھشا کرنا ہے۔''

کنال نے امید سے اثبات کیا اور رجنی برق رفتاری سے خیمے سے نکلی۔ وہ سیدھی اپنے خیمے میں پہنچی۔ پریمودا کو جلدی مگر رازداری سے چلنے کی تیاری کرنے کو کہا اور اس کے چہرے پر برستے بے شمار سوالوں کا جواب بس یہ کہہ کر دیا کہ باقی سب باتیں بعد میں سمجھا دوں گی' سمے بہت نازک ہے۔ یوں رجنی نے عین چلتے وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کنال کے اصطبل سے ایک کے بجائے دو گھوڑے لیے' پہلے اس کا خیال تھا کہ ایک ہی گھوڑے پر پریمودا کو بٹھا کر نکل جائے مگر پھر اسے خیال گزرا کہ ارجن بھائی ساتھ چلنے کی ضد ضرور کریں گے' وہ چلے تو باپو کسی قیمت پر نہیں مانے گا اور یوں ایک گھوڑا کم رہے گا۔ ارجن بھائی باپو کو بٹھالیں گے اور یوں ہم پاٹلی پتر جاسکیں گے۔

رجنی نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے وہاں سے نکلی' چلتے سے اس کا پھر دل چاہا کہ ایک بار اور کنال سے مل آئے مگر وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھ کر اس نے اپنا دل مسوس لیا اور بنا ملے ہی چل پڑی۔ اب حالات مزید سمے لینے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ شام تک وہ باپو اور ارجن بھائی تک پہنچ گئی۔ باپو ندی پر بیٹھا اشنان کرتا تھا۔ رجنی کو دیکھا تو پہلے اسے پہچان نہ سکا پھر اسے گھنی حیرت ہوئی کہ یہ سپاہی اور یہ استری کون ہیں جب رجنی نے خود اتار کے باپو کہہ کر پکارا تو باپو ایک دم ہی دیوانوں کی طرح اسے آفت کہہ کر اس کی طرف لپکا۔ دونوں کی محبت کا ملن دیکھ کر پریمودا کی آنکھیں فرط محرومی سے ڈبڈبا گئیں۔ جب باپو نے اس کے سر پہ بھی ہاتھ رکھا تو وہ بھی بے اختیار ہو کر باپو کہہ کر زور سے چمٹ گئی اور باپو بڑے بھولپن سے بولا۔ ''ارے میری پتری' تو' تو ہے میری بٹیا' یہ تو آفت ہے آفت' کب کی گئی' کب لوٹی ہے۔ تو' تو مجھے چھوڑ کے نہیں جائے گی ناں؟'' باپو نے اسے پھر کلیجے سے لگالیا۔

''من تو یہی کرے باپو کہ تمہیں چھوڑ کے بھگوان کے پاس بھی نہ جاؤں مگر میں اس آفت کی پرچھائیں ہوں' بھلا پرچھائیں بھی کبھی کسی سے جدا ہوسکتی ہے؟'' رجنی نے محبت سے اس کے سر پہ چپت لگائی اور باپو نہال ہو کے بولا۔ ''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی کہ تو بھی آفت ہے اور اب میری دو دو آفتیں ہیں۔''

''باپو' ارجن بھائی کہاں ہیں؟'' رجنی نے جلدی سے اپنا مطلب بیان کیا۔

''وہ کرن کے ساتھ میدان میں کچھ نہ کچھ کھیل رہا ہوگا۔ دونوں ہر وقت کھیلتے ہی رہتے ہیں اور سن' کرن نے تیرے اس سادھو بھیا کو بھی بڑے سپاہیانہ داؤ پیچ سکھا دیئے ہیں۔''

رجنی کو دل میں ذروں کا سکون محسوس ہوا کہ کرن باخیریت ہے اور یہیں ہے۔ اس نے باپو کے ساتھ پریمودا کو گھر بھیج دیا اور خود اس کھلے میدان کی طرف چل دی جہاں کرن اور ارجن مل سکتے تھے۔ دور سے رجنی نے دیکھا کہ ارجن بھائی کی جٹائیں بندھی ہوئی تھیں اور وہ کرن کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے زور آزمائی کررہے تھے۔ رجنی کچھ دیر تک دلچسپی سے دیکھتی رہی پھر چیخ کر بولی۔ ''ارجن بھائی' میرے گرو کو زیر کرنا کوئی آشرم کی کج بحثی جیسا آسان کام نہیں' بڑا جگر چاہیے اس کام میں۔''

دونوں نے بڑی غضب کی چونکنے والی کیفیت سے جو دائیں طرف کو گردنیں گھمائیں تو ان کی مارے حیرت اور خوشی کے جان ہی نکل گئی۔ رجنی دیوانوں کے انداز میں ارجن کی طرف بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

''ارے رجنی دیوی' یہ کیا بلا ہے' آپ اور یہاں؟'' کرن کی کئی دنوں سے اداسی میں ڈوبی قوت گویائی یکلخت ایسے کھلکھلا اٹھی جیسے خزاں میں یکا یک بہار آجائے۔ ارجن بھی کرن کی اس تبدیلی کو محسوس کر کے بے حد خوش ہوا۔

''گھر چلو پھر سب بتاتی ہوں۔''......

کھانے اور ضروری حاجات سے فارغ ہو کر رجنی نے نہ صرف ساری کتھا سنائی بلکہ فوراً ہی کرن سے کہا۔ ''مجھے اور آپ کو ترنت نکلنا ہوگا۔''

کرن نے گہری سی ہوں کی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو باپو' رجنی کو نہ صرف روکنے کی ضد کرتا بلکہ وہ اس کے ساتھ چلنے پر بھی بضد ہوتا مگر رجنی کے منہ سے پوری کہانی سننے کے بعد وہ چپ چپاتے یہ دیکھتا رہا کہ اب آگے کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہونے والا ہے‘ اسے اپنی بیٹی بڑی زبردست مصیبت میں لگی اور اس وقت وہ کوئی ایسی بات نہ کہنا چاہتا تھا جس سے اس کی رجنی کو ہلکی سی بھی تکلیف پہنچے۔ یہ کیا کم تھا کہ بھگوان نے اس کی مایوسی اور خزاں رسیدہ زندگی میں یوں چمتکار کر دیا اور آج کے ڈوبتے دن کے ساتھ اسے اس کی پگلی اور لاڈلی بیٹی کے درشن کرا دیئے۔

”تو کیا صبح تک کا بھی انتظار نہ کرو گی رجنی؟“ ارجن نے کہا۔

”نہیں ارجن بھائی‘ ایک ایک گھڑی میرے مہاراج کی امانت ہے اور میں اس امانت میں کوئی خیانت تو کجا‘ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ رجنی نے حوصلے میں ڈوبی ایک مضبوط آواز میں یہ بات کہی۔

”اچھا تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا‘ ہم تو کرن سے یہ کہہ رہے تھے کہ وہ کنال یوراج کے سواگت میں ہمیں ساتھ لے چلے مگر یہاں تو معاملہ ہی یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ آخری معرکے کا سمے آن لگا ہے اور اس گھڑی تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔“

”تو کیا باپو کو یہاں اس اجنبی سنسار میں اکیلا چھوڑ دو گے بیٹا؟“ نردھن نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

”نہیں باپو‘ ارجن بھائی چلے تو آپ کو بھی اکیلا نہ چھوڑوں گی اور آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔“

رجنی نے یہ کہا تو باپو خوشی سے رو پڑا۔ ”میری جان‘ میری پتری پر قربان‘ بھگوان تیری اور آتی سب مصیبتوں کو میری طرف موڑ دے۔“

”ہوں پگلا باپو......!“ رجنی یہ کہہ کر باپو کے گلے میں جھول گئی۔ حسرت سے دیکھتی پریموداکے سر پہ باپو نے ہاتھ رکھا تو اس کی محبت کا دریا بھی سینے کا بند توڑ کے بہہ نکلا۔ ”اپنی رجنی کی اور بڑھتی سب مصیبتوں کو میں پہلے اپنی چھاتی پر لوں گی باپو‘ بھگوان مجھے بھی ہماری رجنی کے کام آنے کی توفیق دے گا۔“ سب نے خاموشی سے پریموداکے خیالات کو خراج بخشا۔

تیاری کرتے سمے پریمودا نے کہا۔ ”اب مجھے تم سے یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے ہونے والے مہاراج کی مہارانی کون ہے؟“

رسی ہاتھ میں پکڑے پکڑے رجنی نے حیرت اور غور سے پریمودا کی طرف دیکھا‘ پریموداس کے قریب پہنچی اور اس کے جھکے ہوئے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ ”سارے اتہاس میں سیتا میا کے بعد تم وہ استری ہو جس نے استری کے جنم کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ سچ پوچھو تو کنال مہاراج کی رانی بننے کا حق صرف تمہی کو ہے۔ میں تو تمہاری کنیز بھی بن جاؤں تو بڑی بات ہے۔“ رجنی نے جھٹ سے پریمودا کو گلے لگا لیا۔

”میری اچھی سہیلی‘ میری اچھی بہن!“ پریمودا جیسے دیوانی ہی تو ہو گئی۔

یوں پانچ انسانوں کا یہ مختصر سا قافلہ تین گھوڑوں پر سوار پاٹلی پتر کی طرف بڑھا۔ کرن نے ضرورت کا سب سامان اپنے گھوڑے پر لاد لیا۔ اس بار رجنی کے کہنے پر پریمودا ارجن کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھی اور باپو رجنی کے ساتھ بیٹھ جانے پر بھگوان کے قدموں پر ڈھیر ہو گیا جس نے اس کے من کی یہ آشا بھی پوری کی کہ وہ اپنی رجنی کے ساتھ اور کچھ سمے رہ سکے۔ پر اس وقت باپو نے ہلکا سا منہ بنایا جب رجنی نے کہا۔ ”باپو‘ سفر میں بات کرنے کا موقع بہت کم ملے گا‘ میں گھوڑا آندھی طوفان کی طرح بھگاؤں گی۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ہمیں پاٹلی پتر میں داخل ہونا ہے......اور جب رجنی نے گھوڑا اس طرح دوڑایا کہ سب سے آگے وہ پھر ارجن اور اس کے بعد حفاظت کے خیال سے کرن تھا تو باپو کے اوسان خطا ہو گئے‘ وہ اپنی ساری زندگی میں ایسی تیز رفتاری سے کبھی کہیں نہیں گیا تھا۔

”اندھیرا ہے بیٹا‘ سنبھل کے چل رستہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔“ باپو چیخ کر بولا۔

”باپو‘ یہ زندگی کی دوڑ ہے‘ موت اور جیون کا یدھ‘ اس میں ذرا سی بھی دیر اور چوک جانے سے زندگی کو شکست ہو جائے گی۔“ اور باپو چپ چپاتے اپنے دھڑکتے دل سے مسلسل بھگوان سے سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا۔ اسے بڑی شدت سے وہ رات یاد آئی جب وہ اس ظالم راجہ کے محل سے رجنی کو لے کر بھاگا تھا‘ اس وقت بھی اس کا یہی خیال تھا کہ وہ اپنی ساری حیاتی میں کبھی اس سے تیز پیدل نہ دوڑا تھا۔

صبح ہونے سے پہلے وہ سب بخیریت پاٹلی پتر کی سرحد کے قریب پہنچ گئے۔ منصوبے کے عین مطابق کرن نے خیمے لگوانے کے بعد ساز و سامان رجنی کے حوالے کیا اور دو گھڑی کا آرام کیے بنا وہ سپاہی کربھک سے ملنے چل دیا جو یہاں کی سپاہ کے سیناپتی سکھیندر سے ملوائے گا‘ یہی مترشنگ نے اسے سمجھایا تھا اور سکھیندر کے ساتھ مل کر سواگت کی جنگی تمثیل گری کی تیاری کی جائے گی۔ کرن جب کربھک تک پہنچا تو وہ سو رہا تھا۔ جاگنے کے بعد عجیب اجنبی نظروں سے اس نے کرن کو دیکھا‘ کرن نے اسے مرتبے سے آگاہ کیا تو وہ مودب ہو گیا اور خوش دلی سے کھانے پینے کی پیشکش کرنے لگا جسے کرن نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ مجھے ابھی کے ابھی سکھیندر سے ملنا ہے۔ یوں کربھک سپاہی اسے سکھیندر کے پاس لے گیا۔ سکھیندر نے صرف اتنا کہا۔ ”ہماری جان کاری تو یہ تھی کہ آپ دو دن پہلے آنے والے تھے۔“

”ہاں‘ ہونے والے مہاراج کی طبیعت ناساز تھی‘ ممکن ہے‘ ان کی آمد میں بھی تاخیر ہو سکتی ہے۔“ اس جواب پر سکھیندر نے اسے پھر غور سے دیکھا۔ کچھ خاطر مدارات کے بعد سکھیندر نے غیر متوقع بات کہی۔

”آپ کو مہارانی صاحبہ سے ملنا ہوگا؟“

کرن نے چونک کر سکھیندر کو دیکھا۔ ”مجھے سواگت کے کاموں میں حصہ لینا ہے‘ اس کے لیے رانی سے ملنا کیوں ضروری ہے؟“

”ساری دیکھ ریکھ رانی صاحبہ نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے۔ انہی سے پوچھ کر ہر قدم اٹھایا جا رہا ہے۔“ کرن سکھیندر کی یہ بات سن کر چپ رہا۔ سکھیندر کی محل جیسی اس رہائش میں اس وقت سینکڑوں سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ کرن نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ رانی سے مل لے۔

سکھیندر کو اس وقت ایک زور کا جھٹکا پڑا جب ایک مہر لگا سندیس کشتا رانی کے حضور پیش کیا گیا۔ سکھیندر سوچنے لگا کہ کرن تو کشتا رانی سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا پھر اس نے سندیس کیسے اور کیوں دیا؟ اگر سکھیندر کشتا کی تاکید اور حکم کے مطابق کرن کو یہاں نہ لاتا تو کرن کیسے یہ سندیس دیتا؟

سندیس پڑھ کے کشتا نے ایک عجیب سے غیر شاہانہ انداز میں ادا دکھائی اور ترنت شاہانہ انداز سے پلٹیں اور بولیں۔ ”کرن سپاہا کو حراست میں لے لو۔“ کرن نے یہ سن فطری حیرت کا مظاہرہ کیا اور کہا۔ ”یہ بدعہدی کس لیے؟“

”ہم کسی کو جواب دہ نہیں ہیں‘ کم سے کم تمہیں تو بالکل بھی نہیں۔“ کشتا نے مصنوعی بے نیازی سے کہا۔

”رانی کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میں ہونے والے مہاراج کنال اشوکا کا خاص آدمی ہوں اور ہونے والا سیناپتی بھی۔“ کرن پورے اعتماد سے بولا۔

”یہ سب ہم ہونے نہیں دیں گے‘ مت بھولو کہ تمہارا مہاراج اور تم ہونے والے ہو‘ ہوئے نہیں ہوا بھی۔“

کشتا کی دھاڑ سے محل کے در و دیوار گونجنے لگے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’رانی صاحبہ‘ اپنی چند سوافراد کی سپاہ پر اتنا بھروسہ نہ کریں کہ آپ کو پچھتانا پڑے۔‘‘

’’ہم دھمکیوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ لے جاؤ اس ہونے والے سیناپتی کو۔‘‘ کشتا نے اس بار نیچی مگر شاہانہ آواز میں حکم دیا تھا۔

’’مجھے حیرت ہے کہ رانی کس کے بھروسے پر اتنی بڑی غلطی کر رہی ہیں؟‘‘ اور پھر فوراً ہی پلٹ کر کرن دھاڑا۔ ’’کوئی آگے نہ بڑھے‘ میں ہندوستان کا ہونے والا سیناپتی تمہیں حکم دیتا ہوں کہ مجھے گرفتار کرنے کی غلطی کوئی نہ کرے‘ یہ لغزش تم سب کو بہت مہنگی پڑے گی۔‘‘

کرن کی سب طرح کی باتوں کے باوجود اسے گرفتار کرلیا گیا اور یوں وہ سازش بے نقاب ہوگئی جس پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ کشتا رانی‘ مترشنگ کی آشیرواد کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں۔

•......•......•......•

شام سے پہلے جو حالات کنال کے پڑاؤ میں پیش آئے‘ وہ مترشنگ کے لیے چکرا دینے کو کافی تھے جب اس نے دیکھا کہ کنال کی طبیعت ناساز ہے اور کئی وید‘ حکیم اس کی طبیعت کی بحالی میں مصروف ہیں۔ کنال نے مترشنگ سے کہا۔

’’اب تم یہیں ہمارے پاس رک جاؤ مترشنگ‘ ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہے‘ ہم نے تمہارے طعام و قیام کا بندوبست اپنے ہی خیمے میں کرا دیا ہے اور ہاں‘ اب ہم دو دن بعد کوچ کریں گے۔‘‘ مترشنگ کے پیروں تلے زمین نکل گئی کیونکہ وہ تو آج ہی کوچ کا حکم سارے قافلے کو دے چکا تھا اور اب اس کے لیے یہ بتانا یوراج کو‘ دشوار ہو رہا تھا کہ وہ بنا کنال سے پوچھے کوچ کا حکم دے چکا تھا۔

’’اچھا یوراج‘ میں نے جو کوچ کی تیاریاں کی تھیں‘ میں ان کو پھر سے دو دن کے لیے ملتوی کرا آؤں۔ ابھی آتا ہوں اور ہاں‘ کرشن کو بھی بلوا لاتا ہوں۔‘‘

’’ہرگز نہیں‘ ہمیں اس وقت اپنے بچپن کے ساتھی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ تم کہیں نہیں جا رہے‘ باقی التوا کی بابت ہم کسی سپاہی سے کہلوا دیتے ہیں۔‘‘ کنال نے بیمار سی آواز میں کہا اور مترشنگ کی حیرانی دوچند ہوگئی کہ اس قسم کی صورت حال کا تو وہ تصور میں بھی توقع نہیں کر رہا تھا کہ کنال اور رجنی سے زیادہ اس حالت میں اس کی موجودگی کو اہمیت دے گا‘ وہ گہری سوچوں کے جنگل میں بھٹکنے لگا۔

’’یہاں آؤ مترشنگ‘ ہمارے قریب۔‘‘ کنال کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اسے یقین ہوگیا‘ کنال اسے خیمے سے جانے تک نہیں دے رہا۔ ’کہیں اسے کوئی شک تو نہیں ہوگیا‘ شک مگر کیسے اور کیوں؟‘ سوچوں سے الجھتا وہ کنال کے بستر کے قریب پہنچ گیا۔

•......•......•......•

شام اپنا دامن سمیٹ رہی تھی جب ایک گھڑسوار نقاب میں اپنا چہرہ اور سارا لبادہ چھپائے کشتا رانی کے محل کے چوبی دروازے پر طلوع ہوا۔ کشتا کو خبر کی گئی‘ وہ آناً فاناً دیوان خاص میں پہنچی اور نقاب پوش کو دیکھ کر بولی۔

’’جی فرمایئے‘ آپ کو ہم سے کیا کہنا ہے جو خاص خبر آپ کے پاس ہے‘ وہ سننے کو ہم بے چین ہیں۔ نقاب پوش نے اپنا نقاب الٹ دیا اور کشتا پر مارے حیرت کے دورہ سا پڑ گیا۔

(تاریخ سے جڑی اس اسرار بھری
کہانی کے باقی واقعات آیندہ مہینے ملاحظہ کیجیے۔)

WATCH EVERY Fri-Sun AT 9:05PM Love Life اور لاہور

سلسلے وار کہانی / ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی‘ جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

شازلی سعید مغل

تاشون

حزیںؔ صدیقی کا خیال

عالم رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے بہت خاص سلسلے کی نویں کڑی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زلفی کوایسا محسوس ہوا ڈرائنگ روم میں سردی پورے گھر کی نسبت کم تھی۔ وہ سوتی ہوئی ربیعہ کو گود میں لے کر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے بڑی شدت سے صرف تاشون کا انتظار تھا۔

''یہ رانیہ کہاں رہ گئی؟'' وہ کوفت زدہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''رانیہ' کہاں ہو یار؟'' زلفی نے آواز لگائی۔

رانیہ اس وقت اپنے بیڈروم سے ملحقہ اسٹور روم میں موجود تھی' اسے رہ رہ کر اپنی چھوٹی سی بچی ربیعہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اور زلفی تو یہ سردی برداشت کر لیتے لیکن ربیعہ نہیں کر سکتی تھی' چنانچہ اس نے اسٹور روم سے کمبل وغیرہ نکالا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔

''اچھا ہوا تم کمبل وغیرہ لے آئیں۔ یہ دیکھو' ربیعہ کتنی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' زلفی نے بیٹی کو چھوتے ہوئے کہا۔

''تو اس کو لپیٹ لو اس میں۔'' رانیہ نے ایک چھوٹا کمبل زلفی کو دیتے ہوئے کہا۔

زلفی نے رانیہ کو کمبل میں لپیٹ لیا لیکن پھر اچانک ہی زلفی نے محسوس کیا کہ ڈرائنگ روم میں بھی سردی کی شدت لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی ہے۔

''کیا ہوا زلفی' کیا تم بھی وہی محسوس کر رہے ہو جو مجھے محسوس ہو رہا ہے؟'' رانیہ نے زلفی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' زلفی کے منہ سے ایک ٹھٹھرتا ہوا جملہ نکلا۔ وہ دونوں اس صورت حال پر دم بہ خود تھے۔ ''چلو یہاں سے۔'' زلفی نے کمبل میں لپٹی ربیعہ کو گود میں اٹھایا اور رانیہ کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔

''تاشون بھائی کب آئیں گے؟ زلفی پلیز' فون کروان کو۔'' رانیہ روہانسی ہوئی جا رہی تھی۔

''اوہ گاڈ! مجھے پہلے خیال کیوں نہ آیا؟'' زلفی ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا اور پھر وہ لاؤنج میں رکھے فون کی طرف بڑھا۔

''زلفی' لاؤ اسے مجھے دے دو۔'' رانیہ نے ربیعہ کو گود میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیئے۔

زلفی نے ربیعہ کو رانیہ کی گود میں دے دیا اور خود تاشون کا نمبر ملانے لگا۔ اس نے ایک دو مرتبہ نمبر ملایا مگر بے سود...... ''کیا ہو گیا اسے بھی؟'' زلفی ریسیور کو کریڈل پر مارتے ہوئے بولا۔ چند منٹ بعد پھر اٹھایا' نمبر پریس کیا' اب فون مل چکا تھا۔ زلفی کے چہرے پر سکون کی ایک لہر ذرا دیر کے لیے چمکی لیکن پھر اس کا چہرہ ایک دم سُت گیا' بالکل پتھرا گیا اور وہ ریسیور کو کان سے لگا کر ٹھیک عین اپنے سامنے والی دیوار کو گھورنے لگا۔

''زلفی......!'' رانیہ جو زلفی کی تمام حرکات و سکنات دیکھ رہی تھی' دہشت زدہ انداز میں چلائی پھر رانیہ نے زلفی کی نظروں کے تعاقب میں سامنے والی دیوار کی طرف دیکھا تو اس کو وہاں کچھ نظر نہ آیا سوائے دیوار کے۔

''زلفی......! زلفی......!'' رانیہ نے زلفی کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا لیکن زلفی کا سکوت نہ ٹوٹا' وہ پتھرایا ہوا ریسیور کو کان سے لگا کر ایک بے جان پتھر کے بت کی مانند یک ٹک دیوار کو گھورے جا رہا تھا۔

رانیہ نے جھپٹنے کے انداز میں زلفی سے ریسیور چھین لیا اور اپنے کان سے لگایا۔ رانیہ کو یوں لگا کہ کہیں دور سے مندر کی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں' ایسا لگ رہا تھا کہ مندر کی ان گھنٹیوں کو کوئی جنونی انداز میں بجا رہا ہو۔ اب رانیہ کی بھی وہی حالت تھی جو کہ زلفی کی ہو رہی تھی۔ کچھ پل گزرے' زلفی جیسے ٹرانس کی کیفیت سے باہر نکل آیا' اس نے جو یوں رانیہ کو فون کان سے لگائے' بت بنے دیکھا تو اسے یاد آ گیا کہ کس طرح وہ فون پر

اعتذار

محترم قارئین......! شازلی سعید مغل صاحبہ کے تحریر کردہ سلسلے ''تاشون'' میں فراہم کی گئیں معلومات اور اعداد وغیرہ نہایت مصدقہ ہیں لیکن گزشتہ شمارے میں کمپوزنگ اور پروف کی غلطی کے باعث ''ش'' کے بجائے ''س'' کا عدد 3 پرنٹ ہو گیا ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں' مصنفہ نے ''ش'' کا عدد 3 تحریر کیا تھا۔

مندر کی گھنٹیوں کی آوازیں سن کر سکتے کی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ تاشون اور مونگا کو فون کر رہا تھا لیکن فون کہیں ایک مندر میں مل گیا یا ملایا گیا' سب کچھ گڈمڈ تھا' بہت اسرار بھرا۔

اب رانیہ کی بھی وہی کیفیت تھی جو کچھ دیر پہلے زلفی بھگت چکا تھا۔ زلفی نے ٹرانس میں آئی رانیہ کے ہاتھ سے ریسیور چھیننا چاہا کہ رانیہ کے منہ سے نکلے لفظ 'مہانیل' پر اسے ایک حیرت انگیز جھٹکا لگا۔ 'مہانیل' رانیہ نے پھر آہستگی سے کہا۔

''رانیہ' رانیہ' ہوش کرو۔'' زلفی ذرا زور سے چلایا لیکن رانیہ جیسے اپنے آپ میں نہ رہی تھی۔ وہ ایک معمول کے انداز میں مہانیل' مہانیل کی مسلسل گردان کر رہی تھی۔

زلفی نے پہلے ربیعہ کو رانیہ کی گود سے لے کر کاؤچ پر لٹایا اور پھر رانیہ کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ رانیہ کے بازوؤں کو تھامتے ہوئے زلفی کو ایک اور شدید جھٹکا لگا تھا کہ رانیہ کا پورا جسم برف کی سل کی مانند ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ رانیہ کے بازوؤں پر رکھے زلفی کے ہاتھ اس کے بازوؤں سے اس طرح چپک رہے تھے جیسا کہ کوئی برف کی سخت اور ٹھنڈی سل پر اپنے ہاتھ رکھ دے تو وہ برف کی اس سل سے اس کی یخ بستگی کی وجہ سے چپکنے لگتے ہیں۔

زلفی نے تیزی سے اپنے چپکتے ہوئے ہاتھ رانیہ کے کندھوں اور بازوؤں سے ہٹائے تو اس کی ہتھیلیاں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ زلفی کے اعصاب بے حد کشیدہ ہو رہے تھے' اس کی زندگی پے در پے انوکھے پراسرار بلکہ ہیبت ناک حادثوں کی نذر ہو رہی تھی۔ وہ خود کو اس لمحے بہت helpless محسوس کر رہا تھا۔ رانیہ ابھی تک ٹرانس کی کیفیت میں تھی۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے' باہر حبس تھا لیکن زلفی کے گھر میں سردی اپنا جوبن دکھا رہی تھی۔ نامعلوم پراسرار سرسراہٹوں کا عمل جاری تھا۔ زلفی نے اپنی بچی کھچی ہمتیں جمع کیں اور رانیہ کو جیسے تیسے بیڈروم میں لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ وہاں بیڈروم میں بھی سردی کی اتنی شدت تھی کہ زلفی کے دانت بج اٹھے تھے۔ وہ رانیہ کو لٹا کر اپنی بچی ربیعہ کو لینے گیا تھا اور جب ربیعہ کو لے کر دوبارہ بیڈروم کے دروازے تک آیا تھا تو وہاں کے منظر نے جیسے کہ اس کے قدم دروازے پر ہی جما دیئے تھے۔ بیڈروم کے منظر نے اس کے دل تک کو منجمد کر دیا تھا جو سفید سفید سرد بے جان بوجھل دھوئیں کے مرغولوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں دائروں کی شکل میں اس طرح ناچ رہے تھے جیسا کہ کوئی جشن منا رہے ہوں پھر ان مرغولوں کا رخ دروازے پر موجود زلفی کی طرف ہو گیا۔ اب یکے بعد دیگرے یہ دھوئیں کے بے جان سرد اور بوجھل مرغولے زلفی کو چھوتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ زلفی دیوانہ وار ایک ہاتھ سے ان مرغولوں کو ہٹاتا ربیعہ کو سنبھالتا آگے بڑھا۔ سفید سفید مرغولے زلفی کے جسم کو نہایت بے دردی سے چھیلتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ زلفی کے جسم پر اب ایسی خراشیں نمودار ہو رہی تھیں جیسا کہ وہ ببول کی کانٹوں دار جھاڑیوں کے اندر سے نکل کر آیا ہو۔ ان خراشوں سے اب خون بھی رِسنا شروع ہو گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زلفی کے اندر اس وقت اپنا کوئی احساس باقی نہ بچا تھا' اسے اس وقت صرف اور صرف رانیہ کی فکر تھی اور بس۔ اس کا دل کسی نے گویا اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ اعصاب چیخ رہے تھے۔ وہ اپنے تمام حواس مجتمع کر کے ان شیطانی قوتوں سے اکیلا نبرد آزما تھا۔ بالآخر ان دھوئیں کے مرغولوں کے پار اسے وہ منظر نظر آ ہی گیا جس کی امید اسے اس ایک گھنٹے سے جاری وساری شیطانی کھیل سے تھی۔

رانیہ کا آدھا دھڑ بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا' اس کی دہشت زدہ آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں' رانیہ کی مرمریں گردن سوجی ہوئی تھی' پوری گردن کے گرد لال رنگ کا نشان تھا جیسا کہ کوئی چیز گردن کے گرد کسی گئی ہو۔

''رانیہ......!'' زلفی کی آواز جیسے کسی اندھے کنویں سے برآمد ہوئی اور وہ تیورا کر زمین پر گر گیا۔

•......•......•......•

آسمان پر چاند کا سفر حسب معمول جاری وساری تھا۔ وہ ایک عجیب وغریب علاقہ تھا' آبادی سے کوسوں دور جنگلات کا ایک سلسلہ ختم ہونے کے بعد کچھ کھنڈرات تھے اور پھر جنگل' ان ہی کھنڈرات کے سلسلے سے کچھ دور ہٹ کر ایک شکستہ مندر کھنڈر کی صورت موجود تھا جس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اپنی عمر رفتہ کی دہائی دیتی معلوم ہو رہی تھیں۔ ڈھلتے چاند کی زرد روشنی میں یہ کھنڈر بڑا پر ہول اور ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ ٹوٹا پھوٹا پرانا مندر جو اب تقریباً ختم ہو رہا تھا' اس میں دور دور تک کہیں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ جنگلی گھاس پھوس اور جنگلی پھل دار جھاڑیاں جا بجا اگی ہوئی تھیں۔ یہ جنگلی پھل اکثر زہریلے تھے۔ جنگل کے چھوٹے جانور جب کبھی یہاں آ نکلتے اور ان جنگلی جھاڑیوں کے گول نما پھل کھاتے' لوٹ پوٹ کے وہیں ختم ہو جاتے' چنانچہ جگہ جگہ کچھ پرندوں اور چوپایوں کے پنجر بھی پڑے ہوئے تھے۔ مندر کے ٹوٹے پھوٹے احاطے کے اندر اور باہر پیپل اور بڑ کے پرانے درختوں کا ایک سلسلہ تھا۔ پیپل کے درختوں نے مندر کے کھنڈر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ بڑ کے درختوں کی لٹکتی جٹائیں چاند کی پراسرار اور ملگجی روشنی میں بڑا بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں جبکہ مندر کے شکستہ صحن میں خزاں رسیدہ پتے اپنی کم مائیگی اور شکستگی پر نوحہ کناں تھے۔ ان درختوں کے جھنڈ میں ایک کنواں بھی موجود تھا جس کی چرخی میں ایک ڈول اور رسی لٹک رہی تھی۔ مندر کا فرش اور دیواریں اگرچہ شکستہ تھیں مگر مندر کی چھتیں کافی مضبوط ہونے کے باعث صحیح سلامت تھیں' اوپر تک جاتی سیڑھیاں لال اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں' پہلی سیڑھی کے دونوں اطراف دیوی' دیوتاؤں کی مورتیاں نصب تھیں۔ پورے مندر کی اندرونی دیواروں پر جا بجا دھندلے رنگوں سے بنی دیوی دیوتاؤں کی مزید تصویریں اور مورتیاں نصب تھیں۔ اس مندر کی تمام تر شکستگی کے باوجود جو قابل ذکر چیز تھی' وہ تھی مندر کی چھت سے لٹکی لاتعداد چاندی کی چھوٹی بڑی گھنٹیاں' ان کی چمک اور نیا پن کھنڈر ہوتے مندر سے ذرا بھی تال میل نہیں کھا رہا تھا۔ آگے جا کر سیڑھیوں کے عین سامنے مندر میں ایک اونچا چبوترہ موجود تھا جہاں ایک خوفناک مورتی نصب تھی' یہ مکمل طور پر کالی تھی۔ مورتی کی لال لپلپاتی ہوئی زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ یہ کالی دیوی کا مجسمہ تھا' غیض وغضب کی دیوی کالی...... وہ کالی کا مندر تھا' اس کے قدموں میں قربان گاہ بھی موجود تھی جہاں تازہ تازہ خون پھیلا ہوا تھا اور کالی کے قدموں میں ایک معصوم بچے کی سر بریدہ برہنہ لاش پڑی تھی۔

لاش سے ٹپکتے خون کا آخری قطرہ ایک بڑے پیالے میں محفوظ کر کے سیل شیا فاتحانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی اور گھوم کر کالی دیوی کے مجسمے کی پشت پر بنی زیر زمین سیڑھیاں اترنے لگی۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں طے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتی ہوئی تہہ خانے کے اندرونی دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازے پر ایک زنگ آلود تالا پڑا ہوا تھا جس پر ایک کالا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ وہ بہت پرجوش تھی، اُس کے اور اس کے مذموم مقاصد کے درمیان اب صرف یہی ایک دروازہ ہی تو رہ گیا تھا۔ وہ چند لمحے اس بند دروازے پر کھڑی منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتی رہی پھر خون سے بھرے پیالے میں انگلی ڈبو کر اس بند تالے پر بڑے پیار سے تلک لگایا، خون کا تلک لگتے ہی وہ بند تالا ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ سیل شیا نے تالے کو نکال کر دروازے کی کنڈی کھولی اور دروازے کو آہستہ آہستہ اندر کی طرف دھکیل دیا۔ اندر گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا، دروازہ پورا کھول کر سیل شیا دروازے کے وسط میں کھڑی ہوگئی۔ وہ تھوڑی دیر اس طرح دروازے کے درمیان ایستادہ رہی پھر جیسے ہی اس نے اندر آگے قدم بڑھائے، ویسے ہی تہہ خانے کی پتھریلی دیواروں سے انجان سی زرد روشنی پھوٹنے لگی۔ یہ زرد روشنی جیسا کہ سیل شیا کے اس سواگت کا ایک پراسرار حصہ معلوم دیتی تھی جو تہہ خانے کے مکین کی جانب سے ہوا تھا۔ سیل شیا کے چہرے پر ایک خبیث مسکراہٹ تیر گئی۔

اب سیل شیا کے سامنے ہی پانچ کونوں والے ستارے میں ایک صندلی تابوت پڑا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے تابوت کے قریب پہنچ گئی۔ تابوت میں ایک لمبا تڑنگا گندمی رنگت والا بے جان جسم چت پڑا ہوا تھا جس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اس کے جسم پر جو کورا کپڑا موجود تھا، وہ بھی انتہائی صاف ستھرا تھا، ایسا محسوس ہورہا تھا جیسا کہ یہ کپڑا روزانہ بدلا جاتا ہو۔ کہیں میل کچیل کا نشان تک نہ تھا۔ جسمانی حالت بھی بالکل ٹھیک تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے یہ لاش تازہ ہو جبکہ حقیقت کچھ اور تھی۔

سیل شیا نے ایک لمحے کو رک کر تابوت میں پڑے اس بے جان جسم کو دیکھا پھر تابوت کے پیروں کے پاس سے اپنا عمل شروع کیا۔ اب وہ دائرے کی شکل میں تابوت کے اردگرد گھوم رہی تھی۔ وہ اپنا ایک دائرہ پیروں کے پاس ختم کرتی اور پھر اس لاش کے دونوں انگوٹھے پکڑ کر کچھ دیر ٹھہرتی اور پھر اپنا عمل دوبارہ شروع کر دیتی۔ دائرے کی شکل میں گھومتے جاپ کرتے ہوئے وہ مسلسل پیالے میں موجود اس معصوم بچے کے خون میں انگلی ڈبو کر اس بے جان جسم پر چھڑکاؤ کرتی جارہی تھی جس کو اس نے آج کی بھیانک رات اپنے سیاہ مقاصد پورے کرنے کے لیے کالی کے چرنوں میں بھینٹ کیا تھا۔

بے جان جسم وہ خون اپنے اندر جذب کر رہا تھا کیونکہ جیسے جیسے سیل شیا خون کے چھینٹے دیتی جارہی تھی، وہ خون غائب ہوتا جارہا تھا، یوں سیل شیا اپنے عمل کی کامیابی سے مطمئن ہوتی جارہی تھی۔ اسی طرح جب وہ تمام خون تابوت میں لیٹی ہوئی لاش کو دے چکی تو اپنا کام ختم کر کے وہ اس تابوت کے بالکل قریب آ کھڑی ہوئی۔ چند لمحے سانس روکے ساکت آنکھوں سے اس بے جان جسم کی ٹھہری ہوئی پتلیوں کو دیکھتی رہی اور پھر چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک لاش کی پتلیوں سے روشنی کی لہریں پھوٹنے لگیں۔ ان پتلیوں سے روشنی کی لہروں کے پھوٹتے ہی تہہ خانے کی دیواروں سے پھوٹتی زرد روشنی یکا یک تیز ہوگئی اور پھر اس پرانے کھنڈر جیسے مندر کے در و دیوار نے اس رات عقل سے ماورا ایک پراسرار و ہیبت ناک راز آشکار ہوتے دیکھا۔

تابوت میں لیٹے اس ساکت وجود میں ایک حرکت سی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مندر کی تمام گھنٹیاں بج اٹھیں پھر وہ یوں جماہی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا جیسے ایک طویل عرصے سوتے رہنے کے بعد جاگا ہو۔ اس کی بڑی بڑی سرخ خوفناک آنکھوں میں ایک پراسرار چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی جو سیل شیا کو دیکھ کر مزید گہری

ہوتی جارہی تھی۔ اس نے سیل شیا کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا، خوشی سے سرشار سی سیل شیا نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور پھر وہ پراسرار وجود ایک ہی جست میں تابوت سے باہر تھا۔

”سیل شیا...“ ایک سرسراتی ہوئی آواز اس آسیبی وجود سے برآمد ہوئی تھی۔ سیل شیا کے چہرے پر ہزار ہا دیپک جل اٹھے، جواباً اس کے منہ سے جو لفظ نکلا، وہ تھا۔ ”مہانیل......“

•......•......•

بالکل عین یہی وہ گزرا ہوا وقت تھا جب زلفی کو فون پر مندر کی بجتی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ بت بن گیا تھا۔ رانیہ نے فون لیا تھا تو وہ بھی تنویمی کیفیت کا شکار ہوگئی تھی اور اسی لفظ 'مہانیل' کا گردان کر رہی تھی۔ یہی وہ مہانیل تھا جس کو موت کی نیند سے دوبارہ جگانے کے لیے کالی قوتوں کی فرستارہ سیل شیا ہزار ہا جتن کر رہی تھی۔ یہی وہ مہانیل تھا جس کی وجہ سے سیل شیا، رانیہ کے وجود سے زندگی نکال لینا چاہتی تھی۔ اس وقت سیل شیا کی اس دلبرانہ کیفیت کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا شیطانی فرستادہ ہے۔ اس وقت سیل شیا صرف اور صرف ایک عورت تھی، ایک عام سی عورت جو صرف ایک بیوی تھی لیکن اس میں صرف ایک خاص بات تھی، وہ یہ کہ ایک عام سی بیوی نہیں تھی بلکہ ایک شوہر پرست بیوی تھی۔ طاغوتی قوتوں کی پیروکار مگر شوہر پرست وہ سیل شیا تھی، ایک ساحرہ۔

مہانیل، سیل شیا کا محبوب شوہر تھا جو کالی کا ایک زبردست بھگت تھا، اسے طاغوتی قوتوں کا آشیرواد حاصل تھا، اس کی موت کے بعد سیل شیا کی خواہش کے مطابق اور خود مہانیل کی وصیت کے مطابق اسے دفنانے یا جلانے کے بجائے ایک صندل کے تابوت میں رکھ کر کالی کے پرانے مندر کے تہہ خانے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اسے مرے عرصہ ہو رہا تھا لیکن اس کی لاش گلنے سڑنے کے بجائے اپنی اصلی حالت میں آج تک محفوظ تھی لیکن اس کی وجہ لاش پر لگا کوئی ایسا مسالہ نہ تھا جو عام طور پر لاشوں کو لمبے عرصے تک محفوظ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ مہانیل کی لاش کی اصلی حالت میں آج تک موجودگی صرف اور صرف اس لیے تھی کہ اس پر سیل شیا نے لاتعداد عمل کیے تھے، طاغوتی قوتوں کو ہر طرح خوش کیا تھا جبکہ خود مہانیل ایک بڑا ساحر تھا اور کالی طاقتوں کی مدد اسے حاصل تھی۔

رانیہ، مہانیل کو دوبارہ اس دنیا میں لانے کے اس آسیبی سلسلے کی اہم کڑی تھی، خاص اوقات اور خاص ستاروں کی نحس پوزیشنز نے رانیہ کو سیل شیا کا مطلوب بنا دیا تھا۔ وہ ایک آخری کڑی تھی مہانیل جیسی عفریت کو دوبارہ جگانے کے سلسلے میں، چنانچہ آج رات ایک معرکہ تھا کالی قوتوں اور نورانی طاقتوں کے بیچ، حق و باطل کے درمیان وقتی طور پر اگر حق و باطل کے معرکے میں باطل جیتنے بھی لگے تو یہ فیصلہ کن معرکہ نہیں ہوتا بلکہ ان لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے جن کو اللہ رب العزت اس عظیم معرکے کے لیے چن لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ امتحان جتنا سخت ہوتا ہے، اس کا انعام اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ وقتی طور پر اگر باطل قوتوں کی جیت ہو بھی جائے تو ایمان اور ایمانی طاقتوں سے متنفر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو حق کے امتحان کا ایک حصہ ہوتا ہے اور حق کے امتحانات آسان نہیں ہوتے کہ آسانی سے کامیاب ہوا جا سکے۔ راہِ حق کے مسافروں پر خدا کی رحمت سایہ فگن ہوتی ہے جسے عام انسان محسوس نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حق و باطل کے اس معرکے میں آج وقتی طور پر سیل شیا کی جیت ہوئی تھی لیکن صرف اور صرف وقتی، کاتبِ تقدیر نے تو کچھ اور ہی لکھا تھا لوحِ محفوظ پر، بس کاتبِ تقدیر راہِ حق کے مسافروں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عظیم انعام دینا چاہتا تھا چنانچہ امتحان بھی کافی کڑا لیا جا رہا تھا۔ اس وقت تاشون گھر پر نہیں تھا' وہ اور مونگا اپنے کام سے کہیں گئے تھے کہ یہ حادثہ پیش آ گیا اور جب تک وہ دونوں واپس لوٹے' زلفی کی دنیا بدل چکی تھی۔

....

وہ زلفی تھا' اس کے بال پریشان اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سرسوں کے پھول کے مانند زرد ہو رہا تھا۔ زلفی کے پورے وجود میں شدید خوف و کرب کا عالم چھایا ہوا تھا۔ وہ اس وقت وہاں کھڑا ہوا ان لوگوں کی سمت اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ انسان نہیں بلکہ خوفناک بھوت ہوں جو اچانک زلفی کے سامنے آ گئے ہوں۔ وہ اپنے بازوؤں پر رانیہ کو اٹھائے ہوئے تھا جس کے بال اس کے بازوؤں سے نیچے لٹک رہے تھے اور بے جان ٹانگیں جھول رہی تھیں۔ اس کا چہرہ سفید ہو چکا تھا۔ آنکھوں کی نیلی نیلی رگیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ بظاہر اس پر موت کا عالم طاری تھا۔ تاشون نے اشارہ کیا اور زلفی نے رانیہ کو تاشون کی رصدگاہ کی ٹیبل پر لٹا دیا۔

''یہ دیکھو تاشون' یہ...... یہ رانیہ صرف بے ہوش ہوئی ہے ناں؟ اس کو کچھ ہو تو نہیں سکتا؟ کیوں' ٹھیک ہے نا؟ بولو۔'' زلفی نے تاشون کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور دیوانہ وار بس ایک ہی بات دہرا رہا تھا کہ رانیہ صرف بے ہوش ہے اور وہ مردہ نہیں ہو سکتی' طاغوتی طاقتوں نے صرف اس کو صرف بے ہوشی میں مبتلا کر دیا ہے' وہ اسے مار نہیں سکتیں۔

''زلفی' میرے یار' خود کو سنبھالو۔'' اس وقت تاشون کے لیے زلفی کو سنبھالنا مشکل نہیں' ناممکن ہو رہا تھا۔

مونگا نے رانیہ کے بے جان جسم کی طرف دیکھا' اس کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد رانیہ کے سینے پر اپنا ہاتھ دبا کر دیکھا' اس نے بار بار رانیہ کے سینے کو دبا کر تنفس بحال کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود رہی۔

''دل کی حرکت بند ہو چکی ہے تاشون۔'' مونگا نے کہا۔ ''لیکن یہاں دیکھو گردن کی طرف۔'' مونگا نے رانیہ کے بے جان جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تاشون نے مونگا کی نشاندہی پر رانیہ کی گردن کو چیک کیا' گردن سوجی ہوئی تھی اور اس کے ارد گرد جواہر نگار کی ڈوری ٹوٹنے کا باریک لال نشان تھا جو رانیہ کی گردن پھولنے پر اس کی گردن میں پھندے کی طرح کس جانے پر پڑا تھا۔ جواہر نگار کی ڈوری توڑنے کے لیے رانیہ کی گردن کسی ربر کے ٹائر کی طرح پھولی ہوئی تھی۔

''سیل شیا نے اپنا کام پہلے ہی شروع کر دیا تھا' جیسے ہی ہم لوگ گھر سے باہر گئے لیکن سوال یہ ہے کہ تم لوگ اس اندھیری ڈھلتے چاند کی رات گھر سے باہر کیوں گئے؟ کیا میں نے تمہیں یہ ہدایات نہیں دی تھیں کہ تمہیں گھر میں ہی رہنا ہے؟'' تاشون زلفی پر تقریباً برس ہی پڑا تھا۔

''پلیز' ٹیک اٹ ایزی تاشون۔'' مونگا نے جلدی سے تاشون کو سنبھالا تھا۔ ''پلیز' یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔''

زلفی کو جیسے اب ہوش آتا جا رہا تھا' واقعی تاشون نے اس کو ڈھلتے چاند کی راتوں میں رانیہ کے ساتھ گھر سے باہر جانے کے لیے منع کیا تھا اور سختی سے منع کیا تھا۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ اس سے بہت بڑی ناقابل تلافی غلطی ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے یہ احساس بڑھ رہا تھا' زلفی کا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ زمین پر دوزانو بیٹھ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

''پلیز تاشون مجھے معاف کر دو' معاف کر دو اور رانیہ کو بچالو۔ پلیز تاشون۔'' زلفی سسک رہا تھا' تڑپ رہا تھا۔

''اٹھو زلفی کھڑے ہو جاؤ۔'' تاشون نے جلدی سے زلفی کے بکھرے وجود کو زمین سے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ زلفی' تاشون کے گلے لگ کر پھپھک کر رو دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد تاشون نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے تسلی دی تھی کہ...... ''میری نظر میں اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہے۔ رانیہ کو ایک زندہ موت دی گئی ہے' زندہ موت' کالی دنیا میں ایسی موتیں عام سی بات ہیں اور میں ہر حال میں رانیہ کو واپس لانے کی کوشش کروں گا۔''

یہ بات سن کر زلفی نے شکر گزاری والے جذبات کے ساتھ ایک مرتبہ پھر تاشون سے معافی مانگی تھی۔

''زلفی' اب تم بار بار شرمندہ مت ہو' مجھے اپنا کام کرنے دو اور اللہ سے دُعا کرو کہ......''

''لیکن رانیہ کے دل کی حرکت تو واقعی بند ہو چکی ہے تو پھر کیا؟'' زلفی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔ یہ سوال کرتے ہوئے زلفی کی آواز رندھ گئی تھی' آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔''

''زلفی' تم اس وقت بس اپنے حواس قابو میں رکھو اور میرا ساتھ دو اور یہ بھی جان لو کہ رانیہ کی جو حالت ہے' وہ ایک قسم کا سکتہ ہے' یہ ایک زندہ مردہ ہے یعنی وہ لاش جس پر شیطانی قوت کا قبضہ ہے' ویسے بھی اب موت کو جانچنے کے پرانے طور طریقوں کو آخری نہیں سمجھا جا سکتا' موڈریٹ سائنس کا کہنا یہ ہے کہ ایکسیڈنٹ کی صورت میں اگر خون بہنا بند بھی ہو جائے یعنی انسانی جسم کا آخری قطرہ بھی نکل جائے پھر بھی کہیں کسی جگہ پر جسم میں زندگی باقی رہتی ہے اور پھر وہ اس یقین پر پہنچے ہیں کہ انسان کے جسم میں زندگی کا وجود دراصل ایک ایسی توانائی پر منحصر ہے' ایک ایسی ایٹمی توانائی جس کو ''روح'' کہا جاتا ہے اور اس ''ایٹمی توانائی'' کی کوئی چنگاری موت کے کچھ گھنٹوں بعد تک انسانی جسم میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور رہتی ہے جیسا کہ جب ہمارے حواس نیند کے حواسوں میں داخل ہوتے ہیں' تب ہماری آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن اس وقت بھی کوئی قوت ہمارے اندر موجود ہوتی ہے جو دیکھ بھی سکتی ہے اور سن بھی سکتی ہے' یہ لاشعوری حواس ہوتے ہیں' انسانی زندگی نیند اور بیداری کے مختلف دورانیوں پر مشتمل ہوتی ہے' بیداری پر شعوری حواس اور نیند میں لاشعوری حواس کے زیر اثر ہوتا ہے اور ہر انسان لاشعوری حواس کے ذریعہ اپنے ماضی اور حال سے منسلک ہے۔ نیند کو آدھی موت بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ہماری روح جسم سے نکل کر آزاد تو ہو جاتی ہے مگر ہمارے مادی جسم سے اس کے تار جڑے رہتے ہیں۔ ایک مقررہ وقت پر وہ اپنے منبع کی طرف واپس آتی ہے اور ہماری آنکھ کھل جاتی ہے پھر ہم شعوری حواس میں داخل ہوتے ہیں لیکن......'' تاشون نے رک کر کہا۔ ''رانیہ کا مسئلہ بالکل الگ ہے زلفی......اور یہ بات ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ سیل شیا' رانیہ کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی اور آج اس نے ایسا کر بھی دیا۔''

''تو کیا اب وہ اس کے جسم کو اپنا آلہ کار بنائے گی یا کہ اس کی روح کو؟ یا اس کے جسم میں کوئی خوفناک چیز داخل کر دے گی؟'' زلفی جیسے لرز رہا تھا۔ ''یہ سوچ کر ہی میرا دل بیٹھا جا رہا ہے کہ...... کیا میری رانیہ......'' زلفی نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

''زلفی' تم اس طرح کیوں سوچ رہے ہو؟'' مونگا نے زلفی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

زلفی نے مونگا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بالکل بچکانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا میں غلط سوچ رہا ہوں؟ مجھے لگتا ہے' میری رانیہ کی روح بھٹکتی رہے گی۔''

''ہوش کی باتیں کرو زلفی۔'' اس مرتبہ تاشون نے حقیقتاً زلفی کو جھاڑ پلائی تھی۔

زلفی ایک دم ہی بے قابو سا ہو گیا۔ ''تاشون' میری رانیہ مر چکی ہے' کالی قوتیں اس کے جسم کو آلہ کار بنائیں گی' میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ لوگ کوئی شیطانی روح رانیہ کے جسم میں داخل کر دیں گے اور پھر میری رانیہ روز قبر سے نکل کر انسانی خون پیتی پھرے گی اور شیطانی قوتوں کی آلہ کار بن جائے گی۔ میں...... میں...... اپنی رانیہ کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اس کے جسم کو اس قابل نہیں رہنے دوں گا کہ ان کے مقاصد پورے ہوں۔ اس کے لیے چاہے مجھے رانیہ کے مردہ جسم کا سر ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔'' زلفی ہسٹیریا انداز میں چلایا۔

''زلفی۔'' تاشون نے زلفی کو زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''بس بہت ہو چکی' ہوش کے ناخن لو اور مجھے میرا کام کرنے دو' تمہاری وجہ سے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے' ابھی رانیہ کی روح یہیں کہیں موجود ہے۔'' تاشون نے چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ ''روح اپنے جسم سے ابھی زیادہ دور نہیں' ابھی ان قوتوں کا حملہ ادھورا ہے۔ جب تک رانیہ کی روح اس گھر میں ہے' وہ محفوظ ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس گھر کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں' ویسے بھی رانیہ کی روح شاید جانا نہیں چاہتی۔'' اب تاشون نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں موجود زمرد کی تسبیح کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔ ''زلفی' میں تمہارے اطمینان کے لیے بتا رہا ہوں کہ رانیہ ابھی زندہ مردہ نہیں ہے۔ زندہ مردہ وہ لاش ہوتی ہے جس پر کسی شیطانی روح کا قبضہ ہو جاتا ہے جیسا کہ تمہیں خوف ہے کہ کہیں رانیہ کے جسم میں کوئی شیطانی چیز داخل نہ کر دی گئی ہو تو ایسا نہیں ہے۔ ابھی رانیہ کا جسم بالکل محفوظ ہے' زندہ مردہ انسانی صورت میں ہی ہمارے درمیان ہوتے ہیں لیکن انسانی غذا نہیں کھاتے۔ سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے علاوہ کسی دریا' سمندر' ندی' جھیل کو پار نہیں کر سکتے' لہسن ان کے لیے خطرناک چیز ہے۔ اگر لہسن کی ایک کلی بھی ان کو چھو جائے تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے ہیں' اس کے علاوہ کچھ نشانات بھی ان کو دہشت زدہ کرتے ہیں جیسا کہ چاند کا نشان۔''

اس دوران میں مونگا نے لہسن کی پوتھیوں کا ایک ہار لا کر رانیہ کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ تاشون نے اب اپنی آنکھیں کھول لی تھیں اور رانیہ کے بے جان جسم کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لہسن کی پوتھیوں کا ہار پہنے ہوئے بے حس و حرکت ایک پتھر کے خوبصورت مجسمے کی طرح پڑی ہوئی تھی لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اچانک تڑپ کر آنکھیں کھول دے گی۔

اس وقت باہر رات کی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی' فضا میں خاصا حبس تھا لیکن گھر میں بدستور سردی کی لہر موجود تھی مگر اس میں اب وہ شدت نہیں تھی۔ تاشون نہایت گہری سوچ میں ڈوبا اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مونگا ایک بیگ سے نہ جانے کون کون سا سامان نکال کر ایک ٹیبل پر جمع کر رہی تھی۔ زلفی' رانیہ کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ کبھی کبھی اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں سے چھوتا' رانیہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا اور سسک سا پڑتا۔ اس کے آنسو رانیہ کے بالوں میں جذب ہو جاتے۔ اب تک موت کی سختی رانیہ کے جسم پر ظاہر نہیں ہوئی تھی' اس کا جسم اور سارے اعضا بالکل ایک زندہ انسان کی طرح نرم تھے البتہ جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا لیکن یہ ٹھنڈک ایسی تھی جیسا کہ کوئی سخت سردی میں باہر سے اندر آتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مونگا اب اپنے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ ''اب کیا ارادہ ہے تاشون؟'' مونگا نے تاشون سے پوچھا تھا۔
تاشون جو کسی گہری سوچ میں گم تھا' اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر بولا۔ ''تمہاری تیاری دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسا کہ تم میرا ذہن پڑھ رہی ہو۔''

''ہاں' ایسا ہی ہے۔ آؤ اب شروع کرتے ہیں۔'' مونگا نے بہت رسان سے کہا۔

''مونگا' آج میں اپنی زندگی کا پہلا' بہت ہی انوکھا تجربہ کرنے جا رہا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گے لیکن میں تم سے ایک بات کی وضاحت چاہتی ہوں۔''
مونگا نے جواب طلب نگاہوں سے تاشون کی جانب دیکھا تھا اور پھر تاشون کے اثبات میں سر ہلانے پر بولی تھی۔

''روح کو مردہ جسم میں واپس لانے میں کوئی نہ کوئی تکلیف تو ضرور ہوتی ہو گی؟ کیونکہ مردہ شخص کی روح کو واپس بلانا اس کے رُوحانی ارتقاء میں خلل ڈالنا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔'' تاشون نے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔ ''لیکن ایسا ایک عام موت' عام سی حالت میں ہوتا ہے جس میں روح کو واپس بلانا ٹھیک نہیں ہے لیکن یہ ایک قتل ہے اور اس کا رانیہ کو بہت پہلے سے علم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسی لیے اس کی روح بے چین ہے' وہ یہاں سے جا نہیں رہی ہے اور اپنے جسم میں خود واپس آنا چاہتی ہے۔ اگرچہ اس کی خواہش انتقام کی نہیں ہے مگر پھر بھی وہ آنا چاہتی ہے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اس کے پیچھے بھی رانیہ کی ایک خواہش ہے۔''

''وہ کیا؟'' مونگا نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا' اس وقت تم صرف اور صرف میرا ساتھ دو۔ رانیہ کی روح زلفی کی جدائی اب زیادہ دیر برداشت نہیں کر پائے گی۔''

''ٹھیک ہے' میں ہر ممکن کوشش کروں گی کہ یہ کام جلد از جلد پایہ تکمیل کو پہنچے' ویسے کیا اس میں کچھ زیادہ وقت لگے گا؟'' مونگا نے تاشون سے پھر ایک سوال کیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا کیونکہ رانیہ کی روح واپس آنے کے لیے بے چین ہے۔''

تاشون نے مونگا کے نکالے گئے سامان سے دھات کی بنی ہوئی سات چھوٹی طشتریاں لی تھی اور عود و لوبان کے اس ڈبے سے عود و لوبان نکالا تھا جو پری زاد تاشون کو دے کر گیا تھا۔ افسوں گری کی تمام رسموں اور عملیات میں خاص قسم کی خوشبوؤں' دھونیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے' جب ساحرین یکجا ہو کر کسی عمل کو پڑھتے ہیں یا جاپ کرتے ہیں تو خوشبو یا دھونی کا اہتمام لازمی کرنا پڑتا ہے تاکہ اس عمل کے اثرات قوی سے قوی ہو جائیں حتیٰ کہ یہی ساحرین اپنے جسم کی قوتوں کو ان خوشبوؤں اور مالش کے تیلوں اور aromatic herbs کو جلا کر اس طرح بیدار کرتے ہیں کہ ان کے جسموں کو بھڑکتی ہوئی آگ بھی نہیں چھو سکتی۔

ہر ستارے کی خوشبو الگ ہے' سحر کاری میں اس عمل سے اس مخصوص ستارے کو اُس کی مخصوص خوشبو کے ذریعے رام کیا جاتا ہے جس کا اس وقت آسمان پر عمل دخل ہوتا ہے چونکہ دھونی بخارات اور دھوئیں کے نیچے سے اوپر کی طرف اٹھنے کا سبب بنتی ہے اس لیے ہر جادوئی عمل میں موثر ہے۔ ہر مخصوص ستارے کا راج جب مخصوص اوقات میں آسمانوں پر ہوتا ہے' اس وقت اس کے نظرات کے تحت دھونیاں ایک عامل کے عمل کو کامیابی سے پورے برصغیر میں ستاروں کو الگ الگ خوشبوؤں سے جوڑا گیا ہے مثلاً مریخ کی خوشبو' عود' لوبان' کافور ہے۔ زحل کی عود' لوبان' لونگ ہے۔ مشتری سیارے کی خوشبو' صندل' مشک' کافور' چودانہ ہے۔ شمس ستارے کی خوشبویات میں دار چینی' زعفران' مشک سرفہرست ہے۔ زہرہ کے بخورات میں عود' عنبر' مشک' صندل سفید وغیرہ شامل ہیں جبکہ قمر سیارے کی خوشبو' شہد' کافور' عود ہے۔ عطارد کی صندل سرخ' لونگ' نمک' کافور سرفہرست ہیں۔

جب تاشون عود و لوبان کو یکجان کر چکا تو اس نے اپنی رصد گاہ کی زمین پر ایک وسیع دائرہ بنایا اور زلفی سے کہا کہ وہ اس کی مدد کرتے ہوئے رانیہ کا بے جان جسم اس دائرے کے اندر رکھ دے۔

زلفی نے رانیہ کا جسم اس دائرے میں رکھ دیا تھا۔

''یہ تم رانیہ کو اس دائرے میں کیوں رکھ رہے ہو؟'' زلفی نے کچھ وحشت سے پوچھا تھا۔

''تم اطمینان رکھو میرے یار۔'' تاشون نے زلفی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔ ''یہ ایک حصار ہے' ایک supernatural protective barrier اور اس کا یہ پہلو ہر حال میں اہم ہے کہ اس کا خط کس چیز سے کھینچا گیا ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں اگر معلوم ہوتا تو تم سوال نہ کرتے لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے کہ زمانہ قدیم کے لوگوں میں ایک رسم تھی کہ وہ اعزاز بخشنے یا تکریم کرنے کے لیے کسی شخص کے گرد اس کی طرف سے (گردش شمس) تین چکر لگاتے تھے' اسی طرح funeral pyre کے گرد دائرے کی شکل میں چکر لگانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بیمار کو بچانے کے لیے یہی رسم ادا کی جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مریض کے چاروں طرف ایک متحرک اور زندہ دائرہ موجود ہے کہ اس کے پیچھے honorofic variety کا تصور کارفرما ہے' انگشت' بازوؤں اور ٹخنوں میں پہنے جانے والے کڑوں کا نفسیاتی پس منظر بھی بقول frazier گولائی میں زندگی کی رمق یا بالفاظ دیگر جسم کی حرارت کو مقید اور پابند کرنے کے لیے ایک احساس تحفظ پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان میں زچہ کو بلاؤں سے بچانے کے لیے سیاہ کوڑیوں سے دائرہ کھینچ دیتے ہیں' پودے کے گرد دائرہ بنا کر طلوع سحر سے پہلے اس کی پوجا کی جاتی ہے اور منتروں سے پڑھے ہوئے دھاگے کو جسم کے متاثرہ حصے کے گرد دائرے کی شکل میں باندھ کر درد یا تکلیف کا علاج کرتے ہیں۔ اب یہاں رانیہ کو حصار میں لٹانے میں یہی دفاعی مقصد کارفرما ہے کہ کوئی خبیث روح یا شیطانی چیز اس کے خالی جسم کو اپنا گھر نہ بنا لے۔ دائرے میں آ جانے کے بعد مخالف ارواح اور مخالف طاقتوں کے حملے سے خود کو بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہے' دائرہ فسوں گری میں تمام جادوئی رسموں کی بنیاد اور افسوں گری کا مرکز ہوتا ہے۔''

''زلفی' اب تم مطمئن ہو گئے ہو یا ابھی کچھ پریشانی ہے؟'' مونگا نے زلفی سے پوچھا تھا۔

''نہیں' بس ٹھیک ہے' اصل میں میرے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا ہے کہ میں اب ہر چیز سے خوفزدہ ہو رہا ہوں' اسی لیے مجھ سے اگر غلطی ہو جائے تو پلیز میرے دوست' معاف کر دینا۔'' زلفی نے تاشون سے لجاجت سے کہا تھا۔

''ارے' تم پھر شروع ہو رہے ہو' چلو اب ایک طرف بیٹھ کر یہ دُعا کرو کہ میں جو یہ اپنی زندگی کا اہم اور انوکھا تجربہ کرنے جا رہا ہوں' اس میں کامیابی ہو۔'' تاشون یہ کہتے ہوئے اس دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔

حیرت' اسرار' تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی اگلی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



اَب انہیں ڈھونڈ

میرا شہر اِن دنوں پھر بجلی کے بحران کا شکار ہے۔ لوڈ شیڈنگ کے بہانے شہریوں کو گھنٹوں اور بعض علاقوں میں دنوں عذاب میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ اِس نام نہاد ''لوڈشیڈنگ'' میں عام آدمی پِس کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف معاملہ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ کراچی کے مختلف پارک اور کھیلوں کے میدان رات رات بھر سرچ لائٹس کی خیرہ کن روشنیوں سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہ روشنیاں نہ صرف رات بھر جلتی رہتی ہیں بلکہ سارا سارا دن لاکھوں بلب روشن رہتے ہیں۔ اسٹریٹ لائٹس کا بھی یہی حال ہے۔ شادی ہال اور لان بقعۂ نور بنے رہتے ہیں۔ کوئی تقریب ہو یا نہ ہو آرائشی جھالریں اور تیز روشنیاں عام آدمی کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔ پھول بیچنے والوں کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں ہزار ہزار واٹ کے کئی کئی بلب روشن رہتے ہیں۔ یہ چھوٹے دکاندار عموماً کے ای ایس سی کی ملی بھگت سے ناجائز کنکشن لیتے ہیں پھر کراچی کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں پوری پوری بستیوں میں کنڈا سسٹم کا نظام رائج ہے اور یہ کے ای ایس سی کے بدعنوان اہلکاروں کی ملی بھگت سے چل رہا ہے۔

ریڈیو ٹی وی اور ذرائع ابلاغ پر توانائی بچانے کی مہم پر کروڑوں روپیا صَرف کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف یہ اُللے تُللے ہیں۔ آخر توانائی کا یہ بحران صرف عام آدمی ہی کے لیے کیوں ہے؟ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف وہ علاقے ہیں جو تاریکی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ہزاروں طالب علم محض اِس وجہ سے پڑھ نہیں پاتے۔ رات میں کام کرنے والے بیشتر افراد روزی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ گرمی اور حبس کی شدت سے بے شمار مریض جاں کنی میں مبتلا رہتے ہیں۔ بجلی نہ ہو تو پانی کا بھی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔

صورتِ حال کی اِس سنگینی کا ذمے دار کون ہے؟ کے ای ایس سی کے بڑوں سے یہ سوال کون کرے کہ لوڈ شیڈنگ کا اثر مخصوص علاقے پر کیوں نہیں پڑتا؟ بجلی کی شکایات کے مراکز بھی موجود ہیں مگر ان کے فونز ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ متعلقہ افراد فون کا ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیتے ہیں۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اِس بین الاقوامی شہر میں جہاں چھوٹے بڑے اداروں کے پاس بھی ٹیلی فون کی بیس بیس لائنیں ہیں، وہاں ایک اہم ادارے کے پاس صرف ایک نمبر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی شکایت لکھانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو اُسے مختلف طریقوں سے ٹرخایا جاتا ہے اور ایسے وقت کا انتظار کیا جاتا ہے کہ جب کے ای ایس سی والوں کا ''اوور ٹائم'' بن سکے۔ نفسا نفسی کے اِس دور میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہاں ہر کام وعدۂ فردا پر ٹال دیا جاتا ہے اور عام آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ

آئے عُشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اَب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ مئی 1994ء میں "دوشیزہ" اور "سچی کہانیاں" کیلئے تحریر کیا تھا۔ ذرا سوچیے کیا یہ اداریہ ہمارے آج کے دور کا عکاس نہیں ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk